تاریخ
آثارِ بنارس

از

مفتی عبدالسّلام نعمانی مجدّدی
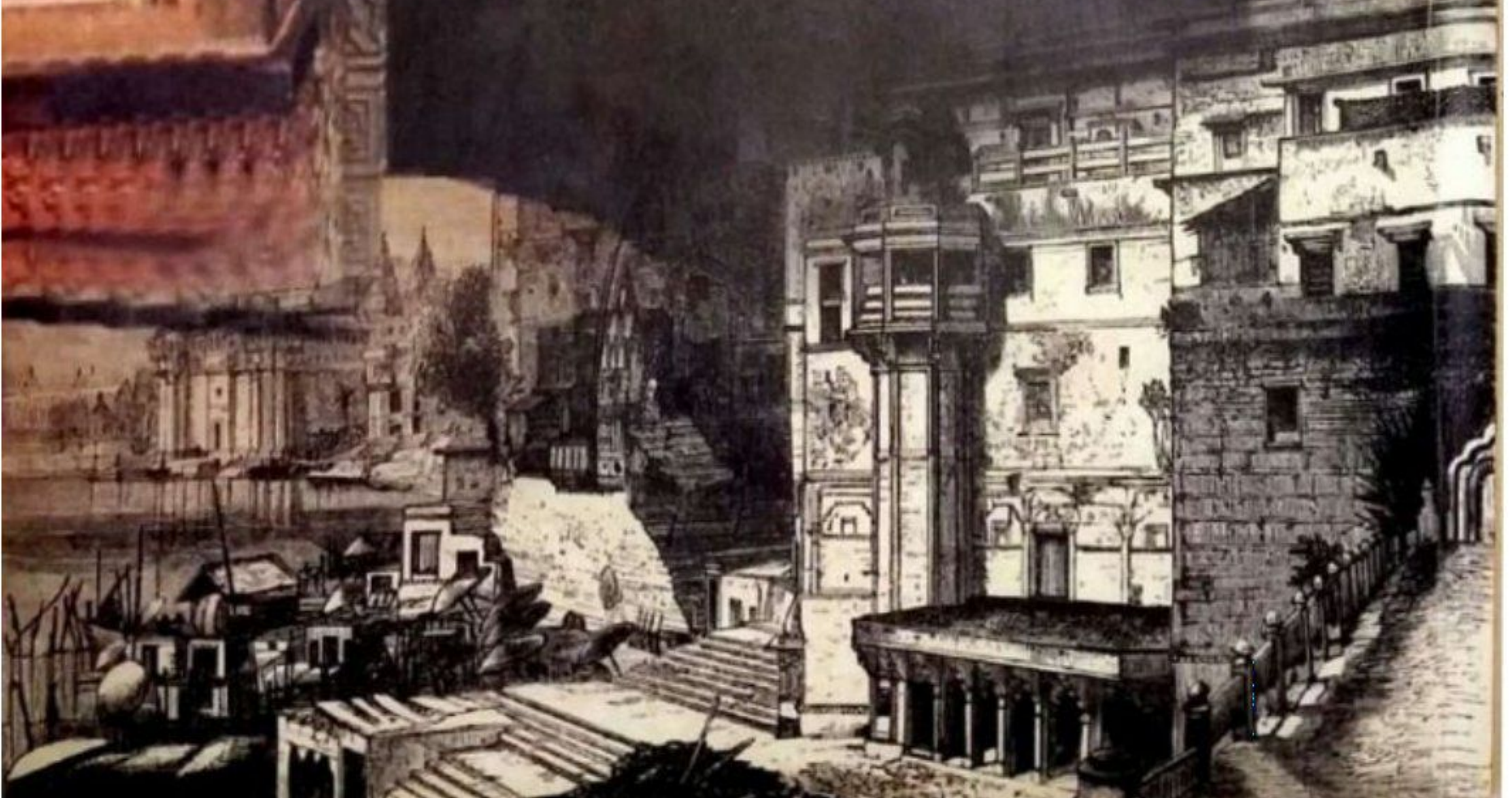
مگر گوئی بنارس شاهدی هست
ز گنگش صبح و شام آئینه در دست

درین دیرینه دیرستان نیرنگ
بهارش ایمن است از گردش رنگ

بنارس ایک معشوق کی مانند ہے جس کے ہاتھ میں [صبح وشام اپنے حسن کی زیبائش کے لیے قدرت نے] گنگا کی شکل میں آئینہ تھما دیا ہے....
اس کہن سال اور پُرفریب دنیا سے بنارس کی بہاروں کو کوئی خوف نہیں۔

پرنٹیا پبلی کیشن

غالب کی مثنوی چراغ دیر کے دوشعروں کی شکستہ نستعلیق میں خطاطی اوران کی تشریح از علام الھندی

تاریخ آثار بنارس

تاریخ آثار بنارس کا دوسرا حصہ
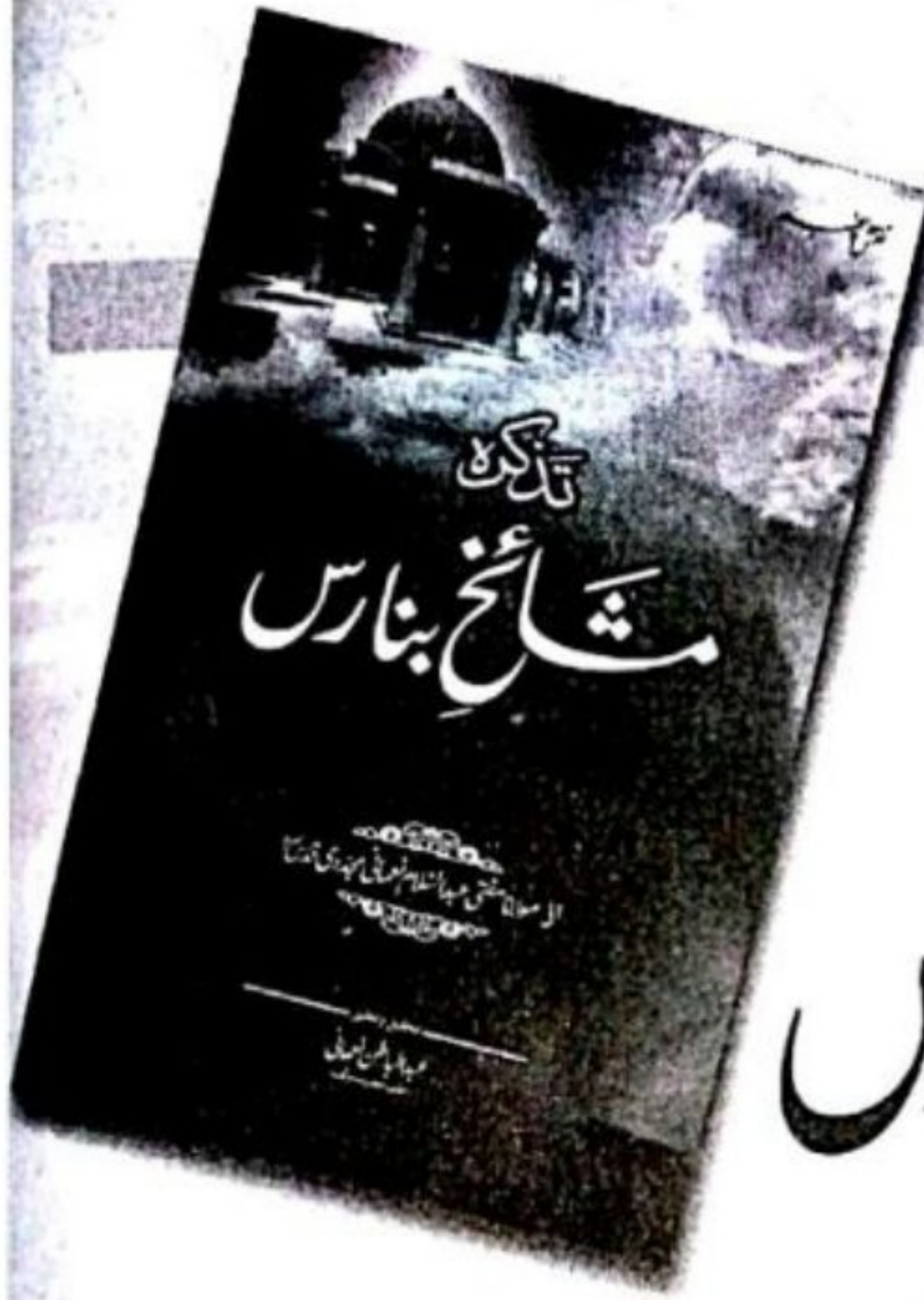
تذکرہ مشائخِ بنارس

جو بجائے خود ایک مستقل کتاب ہے

بنارس میں مسلمانوں کا وجود اُس وقت سے ہے جب یہ شہر سلطان محمود غزنوی کے بھانجے حضرت سید سالار مسعود غازی [متوفی ۴۲۴ھ] کی توجہات کا مرکز بنا اور انھوں نے اپنے سپہ سالار حضرت ملک افضل علوی کو اس دیار پورب میں تبلیغ اسلام کی خدمت سپرد کر کے خود نواحِ بہرائچ کی طرف مراجعت فرمائی۔ حضرت ملک افضل علوی کی قافلہ سالاری میں اُن پاک طینت اسلامی سپاہیوں کا بنارس میں ورود ہوا اور یہاں کی سرزمین ہزاروں شہدا کے خون سے لالہ زار ہوئی۔

بنارس کے مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ نہ معلوم کتنے اولیاء و مشائخ کے نورانی وجود سے روشن ہے اور جن کے دم سے آج بھی بنارس کے ہر گلی کوچے سے اللہ اکبر کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لیکن یہ تاریخ ایسی نہیں کہ ہر کس و ناکس کی وہاں تک رسائی ہو سکے۔

حضرت مولانا مفتی عبد السلام نعمانی مجددی نے ان اولیا و مشائخ کے حالات کو منظر عام پر لانے کے لیے بنارس کے چپے چپے کی خاک چھانی، شہر در شہر گھوم کر تاریخ کے بوسیدہ اوراق پر دیدہ ریزی کی اور برسوں کی جان سوزی کے بعد تذکرہ مشائخ بنارس تالیف فرمائی۔ جس کو پہلے ہی ایڈیشن سے اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ حضرت مولف کی حیات میں اس کے تین ایڈیشن چھپ کر نایاب ہو گئے۔ تقریباً پینتس برسوں بعد ۲۰۱۱ء میں اس کا چوتھا ایڈیشن کئی قیمتی اضافوں اور ضروری حواشی کے ساتھ منظر عام پر آیا اور ایک سال سے کم مدت میں ختم ہو گیا۔ اب پانچواں ایڈیشن بھی نئے اضافوں کے ساتھ چھپ چکا ہے اور آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

كانوا اكثر منهم واشد قوة وآثارا في الارض
مومن: ۸۲

تاریخ

آثارِ بنارس

حضرت نوحؑ کے وقت سے لے کر ہندوستان کے
قدیم آریائی عہد تک، پھر تقریبا ۵۰۰ قبل مسیح سے
بدھوں، ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے آخری دور حکومت تک
بنارس کی تمدنی، علمی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ

مرتبہ
حضرت مولانا مفتی عبدالسلام نعمانی مجددیؒ

تحقیق و تعلیق
عبدالباطن نعمانی

ناشر
پرنٹیا پبلی کیشن

طبع اول : ۱۹۴۸ • طبع دوم : ۱۹۵۹ • طبع سوم : ۱۹۶۳ • طبع چہارم : ۱۹۶۸
طبع پنجم ۲۰۱۵ء

فہرست مندرجات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں

به اہتمام :
عبدالمقتدر نعمانی

○ خطاطی وصفحہ آرائی : ع۔الہندی
○ نمونہ خوانی : عبدالظاہر نعمانی وعبدالآخر نعمانی
○ تصویر کشی : [الحاج] انور جمال وعشرت عثمانی
○ طباعت و تجلید : پرنٹیا، دارانگر میداگن روڈ، وارانسی 9125797969
○ قیمت : تین سو روپیے

دستیابی کے پتے :

Varanasi : **Mufti Printing & Publications,** J.5/60, Azad Park, M: 9415262750
Printia Publication, 'AKSHAR' Near SOS, Chaubeypur, M: 9125797969
Falahi Book Depot, Pilikothi, M: 9889376678
Azad Book Depot, Pilikothi, M: 9125887673
Noor Nabi Book Seller, Dalmandi, M: 9506403516
Noor Nabi Akademy, Dalmandi, M: 0542-2422499
Naseem Book Depot, Dalmandi, M: 9389137914
Mau : **Maktaba Alfaheem,** Dhobia Imli, T: 0547-2222013, M: 9236761926
Mohd. Naeem Book Seller, Chowk,
Allahabad : **Rayee Book Depot,** 734, Old Katra, M: 9889742811
Delhi : **KutubKhana Anjuman Taraqqi Urdu,** Jama Masjid, T: 011-23276526
Star Publications, 4/5B, Asaf Ali Road, New Del. 011-23274874
Kolkata : **Horizon Distributor,** 14 B, Gora Chand Road, M:9831311918
Mumbai : **Kitabdar,** 108/110, Jalal Manzil, Temkar Street,
Bahar Publishers, Room 2, Block 8, M.T.Camp, Tel: 022-23071230
Patna : **Book Emporium,** Sabzi Bagh, Patna
Akola : **Kausar Book Agency,** Riyaz Khan Peer Khan, Meethi Boudi M:9822125888

انتساب

اس کتاب کو

اپنے والد حضرت شیخ المشائخ مولانا الحاج مفتی

محمد ابراھیم صاحب مجددی

طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ

مفتی شہر بنارس و امام وخطیب شاہی جامع مسجد گیان واپی بنارس

کے نام

منسوب کرتا ہوں

اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر اپنی بے پایاں رحمتوں کے پھول برسائے۔ آمین

العبد الجانی والمغرور بالامانی

عبد السلام نعمانی مجددی

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

الہندی
۹ جمادی الاولیٰ ۶

پیش لفظ

بحمد اللہ تاریخ آثارِ بنارس کا نقشِ پنجم تقریباً سینتالیس برسوں کے بعد آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی اُس قادرِ مطلق کا بے پناہ اور حیرت انگیز کرم ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں جس قدر تاخیر ہوئی ہے، اس کے قدر دانوں کا شوقِ طلب اسی قدر شدید اور حلقہ وسیع ہوا ہے۔ اس کتاب کو یہ مقبولیت بے شک خدا کی جانب سے حاصل ہوئی ہے۔

جہاں تک سینتالیس برسوں، یعنی تقریباً نصف صدی جتنی طوالت اور تاخیر کا سوال ہے تو اس کے بے شمار اسباب ہیں۔ ان میں کچھ گفتنی ہیں تو کچھ ناگفتنی...... حضرت مصنف علیہ الرحمۃ کو آثار بنارس اور مشائخ بنارس سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تاعمر، حتیٰ کہ تادمِ آخر اِن دونوں کتابوں میں ترمیم و اضافے کرتے رہے۔ تاریخ آثار بنارس کا وہ مسودہ جو انھوں نے اپنی حیات کے آخری ایام میں بنارس کے مشہور خوش نویس جناب انور جمال صاحب کو سپرد کیا تھا، اس کے بعد بھی خاصا مواد اور شاہی فرامین کی بے شمار نقلیں اور ان کے نہایت شاندار عکس تھے، اس کے علاوہ 'بنارس کی مسجدیں اور محلے' کے عنوان سے اسی کتاب کا ایک ضمیمہ بھی زیرِ ترتیب تھا...... یہ سارے مسودے حضرت مصنف کی رحلت اور ان کی اولاد کی کم سنی، عدم واقفیت اور سادہ لوحی کے سبب اولین موقعے میں غائب ہوگئے۔ ان حوادث میں 'ناگفتنی' یہی ہے کہ اس میں کئی ایسے مہربانوں کے نام شامل ہیں جن کی کرم فرمائیوں کے ثمرات قسطوں میں سامنے آتے رہے۔

بہر حال جب ہم نے پہلے پہل تذکرہ مشائخِ بنارس کے نقشِ چہارم پر کام شروع کیا تو ہمارے پاس صرف خدا کی نصرت تھی ـــــ اور وہی اس قدر ہمارے شامل حال رہی کہ کتاب منظرِ عام پر آتے ہی ختم ہوگئی اور ہمیں فوراً نقشِ پنجم کی تیاری میں جٹ جانا پڑا۔ اس سے فراغت کے بعد ہم نے زیرِ نظر کتاب کی تحقیق و تعلیق شروع کی اور یہ بات اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ کسی کتاب کی تصنیف میں جس قدر جد و جہد اور جاں فشانی ہوتی ہے، تحقیق و تعلیق میں بھی کچھ کم محنت نہیں ہوتی۔

اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ بنارس کی تاریخ پر یوں تو متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن جس چیز کو بنیاد بنا کر اس کتاب کی تصنیف کی گئی ہے، اس اعتبار سے یہ انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۸ میں اس کا پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا تو اُس وقت کے محدود وسائل اور معمولی کتابت وطباعت کے باوجود ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد دوسرا، تیسرا اور چوتھا ایڈیشن بھی منظر عام پر آیا اور نایاب ہو گیا۔ خاص طور سے چوتھا ایڈیشن جو کہ ۱۹۶۸ میں شایع ہوا تھا، سابقہ تینوں ایڈیشن کے مقابلے ضخیم اور متعدد اوصاف کا حامل تھا اس لیے اہل علم وتحقیق کے یہاں اس کی کافی پزیرائی ہوئی اور یہ کتاب بنارس کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ بنارس کی تاریخ اور اس کی قدامت پر جتنے لوگوں نے کام کیا یا اس عنوان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے جن لوگوں نے بھی مقالے تحریر کیے ان کے لیے اس کتاب نے بنیادی ماخذ کا کام کیا۔ چناں چہ اس کتاب کے نایاب ہونے کے باعث ایک عرصہ تک ایسے محققوں اور ریسرچ اسکالرس کو اس کی نقلیں فراہم کی جاتی رہیں۔

دوسری طرف، اس عرصۂ نایابی میں بعض خود ساختہ مصنفوں کا ایک ایسا طبقہ سامنے آیا جس نے اس کتاب کو سامنے رکھ کر اس عنوان پر نئے نئے گل بوٹے کھلائے لیکن ایسی ہر نئی کوشش نے اس کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کیا اور اس کے قدر شناسوں کی تشنگی ہمیشہ باقی رہی۔

بہر کیف! ہم تو اپنے اسی ایمان وایقان کے ساتھ اپنی کوششوں میں لگے رہے کہ اُس کارسازِ حقیقی کے یہاں ہر کام کا ایک وقت معین ہے۔ جب اس کی مرضی ہوتی ہے تبھی وہ چیز منصۂ شہود پر آتی ہے۔ اس کتاب کی تکمیل وتشکیل میں اس کی توفیق ونصرت کس قدر ہمارے شامل کار رہی ہے، یہ قارئین خود دیکھیں گے۔

عبدالباطن نعمانی
خلف مفتی عبدالسلام نعمانی مجددی
مفتی وخطیب شاہی جامع مسجد گیان واپی، بنارس

مورخہ یکم رمضان المبارک ۱۴۳۶ ہجری

دیباچہ

طبع دوم

۱۹۵۹

تاریخ آثارِ بنارس کا پہلا ایڈیشن چھپے ہوئے گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کتابت وطباعت کی غلطیوں اور ظاہری نقائص کے باوجود کتاب نے مقبولیت حاصل کی۔ عوام وخواص میں اس کا خیر مقدم ہوا۔ ملک کے طول وعرض میں بنارس کی تاریخی اہمیت کا چرچا ہوا اور تقریباً دو ماہ کے اندر اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔

کتاب چوں کہ کافی عجلت میں شائع ہوئی تھی اور بہت سے تاریخی واقعات درج ہونے سے رہ گئے تھے اس بنا پر دوسرے ایڈیشن سے پہلے نظر ثانی اور اضافہ کا اہم کام باقی تھا۔ حسن اتفاق سے پٹنہ کی خدا بخش لائبریری اور دارالمصنفین اعظم گڑھ وغیرہ میں قیام کے مواقع ہاتھ آ گئے جس کی وجہ سے کتاب میں دل کھول کر نظر ثانی کا موقع ملا اور متعدد مفید اور اہم اضافے ہوئے جس کے نتیجے میں آپ کے ہاتھوں میں پونے دو سو صفحات کی کتاب پہنچ رہی ہے جب کہ پہلا ایڈیشن صرف اڑتالیس صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کی تیاری میں جتنی محنتیں صرف ہوئیں ان کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ گزشتہ ایڈیشن میں میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ تاریخ بنارس کا موضوع بڑی محنت اور تلاش وجستجو کا طالب ہے اور بدقسمتی سے میں فرصت اور سکونِ خاطر دونوں نعمتوں سے محروم ہوں۔ بہرحال جیسا کچھ بن پڑا، نت نئے اضافوں، فٹ نوٹس اور حوالوں سے یہ کتاب مکمل کر لی اور کوشش کی ہے کہ اس ایڈیشن میں پہلی سی

کوتاہیاں نہ رہیں۔ توقع ہے کہ یہ نقش بہرحال نقشِ اول سے بہتر ثابت ہوگا۔ ع

نقاش نقشِ ثانی بہتر کند ز اول

اب یہ کتاب بنارس کی ایک علمی تمدنی اور ادبی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں عام طور پر جو تاریخیں رائج ہیں، ان میں بنارس کا وہ مقام نہیں جو ہونا چاہیے۔

ہم نے نَوْنَوسو سال کی تاریخی دستاویزیں کھنگالی ہیں۔ قدیم قلمی ذخیروں کے ہزاروں اوراق الٹے ہیں۔ عمارتوں کے پرانے کتبے پڑھے ہیں اور جہاں کہیں سن گن پائی وہاں سے خوشہ چینی کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے۔ واقعات کی صحت پر اطمینان کرلیا ہے اور اب ـــــــــ

من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

کی صدا لگا رہا ہوں۔ توقع ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اہلِ ذوق ونظر اس بضاعت مزجاۃ کو قبول فرمائیں گے اور میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

سبک زجاے نگیری کہ بس گراں گہرست
متاعِ من کہ نصیبش مباد ارزانی!

عبدالسلام نعمانی مجددی
ناظم مکتبہ ندوۃ المعارف و مفتی و خطیب جامع مسجد شاہی گیان واپی۔ بنارس

اپریل ۱۹۵۹ء

دیباچہ

طبع پنجم

[اضافہ و نظرِ ثانی ۱۹۸۶ء]

الحمد للہ تاریخ آثار بنارس کا پانچواں ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کتاب اپنی خصوصیت اور نوعیت کے اعتبار سے ایسی ہے کہ اللہ جل شانہ نے اسے بے پناہ مقبولیت سے نوازا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ چار ایڈیشن یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے اور نایاب ہوتے گئے۔ اس پانچویں ایڈیشن کے آنے میں بلاشبہ تاخیر ہوئی جس کا سبب ایک تو خاکسار کی عدیم الفرصتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس ایڈیشن کو گزشتہ ایڈیشن کے مقابلے میں جامع اور مکمل بھی بنانا تھا، جس میں بحمد للہ بہت حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

پانچ ہزار برس یا اس سے زیادہ سال گزرے، جب گنگا کے کنارے کا یہ شہر نیم متمدن قوموں کی ایک گنجان آبادی کو اپنی آغوش میں لیے ہوے تھا اور اس وقت آریوں نے بحیرۂ کیپیین اور ایران کے نواح سے پنجاب پھر گنگا جمنا کے کنارے آباد ہونا شروع کیا تھا۔ اور پتہ نہیں یہ شہر کتنی سلطنتوں کو اجڑتے اور بنتے دیکھ چکا ہے۔ لیکن بنارس ہی کیا؟ خود ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ بھی تاریکی میں ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت کا تاریخی سرمایہ آج محفوظ نہیں ہے۔ لیکن تاریخ دانوں کا اس بات پر اتفاق ہے اور آثار وقرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ بیو سوت منو یعنی حضرت نوحؑ کے وقت سے یہ شہر آباد ہے۔

بنارس یا کاشی قدیم زمانے سے ہی ہندووں کا متبرک شہر رہا ہے اور انھیں کاشی

کی عظمت پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ لیکن اس شہر کی عظمت کے تعلق سے ان کی تاریخی روایات قدیم زمانے کے چند پارینہ قصوں تک [جن کا مدار صرف عقیدت پر ہے] محدود ہیں جنہیں نہ کوئی تاریخی حیثیت دی جاسکتی ہے، نہ ان سے کوئی تاریخی واقفیت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی ایک محتاط تاریخ نگار ان قصوں کو سند کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔

کاشی کی تاریخ میں ہمارے سامنے صرف 'کاشی کھنڈ'[1] ہے جس کا اصل سنسکرت نسخہ 'سرسوتی بھون' [سمپورنا نند سنسکرت یونیورسٹی] میں موجود ہے جس کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے۔ لیکن ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ سے یہ بھی تشنہ ہے۔ ہم نے رام نگر میں مہاراجا بنارس کے کتب خانے کے مخطوطات میں ایک فارسی ترجمہ کا نسخہ دیکھا ہے جس میں کچھ کام کی باتیں مل گئیں اور ان کی صحت پر دوسرے ماخذوں سے اطمینان بھی کرلیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ سے ۵۰۰ سال قبل کے تاریخی آثار جو کھنڈروں، ستونوں اور لاٹوں کی شکل میں بنارس میں موجود ہیں، اُن کو دیکھ کر تاریخ کے سلسلے میں کچھ رہنمائی ہوسکتی ہے۔ سارناتھ کا میوزیم اِسی سلسلے کا ایک خاص مرکز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان عہد قدیم ہی سے ایک مخصوص تہذیب وتمدن کا مرکز رہا ہے۔ دریائے سندھ کی وادی اور جنوب پنجاب میں ۱۹۲۲ء میں جو آثار قدیمہ زمین سے برآمد ہوئے ہیں، ان سے ہندوستان کی تہذیب وتمدن کا نشان بہت اونچا ہوگیا ہے۔ پیشِ نظر کتاب صرف بنارس کی تاریخ ہے اور اس کتاب میں حضرت نوحؑ سے لے کر آریوں، بودھوں اور ہندوؤں کے دور کے واقعات لکھے گئے ہیں، پھر مسلمانوں کے دور حکومت کی

---

[1]: ہندوؤں کے بھگوان 'اسکند' سے متعلق ان کی مشہور مذہبی کتاب 'اسکند پُران' ہے جس میں تقریباً اکیاسی ہزار اشلوک ہیں۔ یہ کتاب متعدد اجزاء [کھنڈوں] پر مشتمل ہے جن میں سے ایک 'کاشی کھنڈ' بھی ہے۔ ان کھنڈوں کی صحیح تعداد میں اختلاف ہے، البتہ بعض ماہرین کے نزدیک ان کی تعداد ۶ ہے جن کے نام اس طرح ہیں: [۱] مہیشور کھنڈ [۲] ویشنو کھنڈ [۳] برہم کھنڈ [٤] کاشی کھنڈ [٥] اونتکا کھنڈ [٦] ریوا کھنڈ۔ کاشی کھنڈ میں گایتری وگنگا کے علاوہ بنارس کے اہم ترین گھاٹوں اور کاشی کی عظمت کا تذکرہ ہے۔ ع ب نعمانی

تاریخ ہے، اور یہی اصل تاریخ ہے۔

مسلمان اول اول تو فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے لیکن عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً دو ہزار سال پہلے سے ہی قایم تھے۔ گو، فاتح ہونے کی حیثیت سے انہوں نے قدم بعد میں رکھا، تاہم اس بناپر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ عہد قدیم میں یہاں مسلمانوں کا وجود تھا ہی نہیں۔

آج سے تیرہ سو سال پہلے، پہلی صدی ہجری میں اسلامی فتوحات سے پہلے اور بعد کے جو بیرونی سیاح ہندوستان آئے، انہوں نے بنارس کے تمدنی وسیاسی حالات کی تصویر کھینچی ہے۔ اور خاص طور سے تیسری صدی ہجری [نویں صدی عیسوی] کے ایسے عرب تاجروں اور سیاحوں کے سفرنامے اور جغرافیہ کی کتابیں موجود ہیں جو ہندوستان میں آتے جاتے رہے۔ مثال کے طور پر چند تاجروں کے نام درج ذیل ہیں:

ابن حزوازبہ	۲۵۰ھ مطابق ۸۶۴ء
بوزید حسن سیرونی	۲۶۴ھ مطابق ۸۷۸ء
ابومعشر فلکی	۲۷۱ھ مطابق ۸۸۵ء
سلیمان تاجر	۳۰۱ھ مطابق ۹۱۴ء
ابودلف معرابن مہلہل	۳۳۱ھ مطابق ۹۴۲ء
اصطخری	۳۴۰ھ مطابق ۹۵۱ء
بزرگ بن شہریار	۳۴۱ھ مطابق ۹۵۲ء
مسعودی	۳۴۴ھ مطابق ۹۵۵ء
ابن حوقل	۳۶۶ھ مطابق ۹۷۷ء
بشارامقدسی	۳۸۶ھ مطابق ۹۹۶ء
البیرونی	۴۳۹ھ مطابق ۱۰۴۸ء
ابن بطوطہ	۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۸ء

ان سیاحوں میں صرف البیرونی[1] نے بنارس آکر یہاں کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ بقیہ سفرناموں میں جستہ جستہ واقعات ہیں۔ البیرونی کی 'کتاب الہند' ایک مستقل اور ضخیم کتاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہالینڈ کا مطبوعہ یہاں آیا ہے اور میری نظر سے گزر چکا ہے۔

سلطنت مغلیہ کے ابتدائی دور ہی سے بنارس کی ایک مخصوص علمی، تمدنی حیثیت قائم ہوگئی تھی۔ یہاں بڑے بڑے علماء وفضلاء اور نامور شعراء ومصنفین پیدا ہوئے، جنھوں نے بنارس کا نام بہت اونچا کیا۔

۱۳۶۲ء میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق[2] نے سریر آرائے سلطنت ہو کر اپنے چچازاد بھائی محمد تغلق [متوفیٰ ۱۳۵۱ء] کی یاد میں گومتی کے کنارے جون پور[3] کو آباد کیا تھا

---

[1]: آپ کا نام محمد ابن احمد البیرونی ہے۔ ۹۷۳/۹/۵ء میں خوارزم [موجودہ ازبکستان] میں پیدا ہوئے۔ ریاضی، ہیئت، تاریخ وجغرافیہ جیسے علوم میں انتہائی مہارت حاصل تھی۔ سلطان محمود غزنوی [متوفی ۱۰۳۰ء] کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ ۹۷۷ء میں ان کا قیام ہندوستان میں تھا، یہاں انہوں نے پنجاب بھر کی سیر کی اور پھر اس کے بعد اپنی مشہور کتاب 'کتاب الہند' تالیف کی جس میں انہوں ہندووں کے مذہبی عقائد، ان کی تاریخ اور پاک وہند کے جغرافیائی حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں ہندووں کی تاریخ سے متعلق انہوں نے جو معلومات لکھی ہیں ان میں بہت سی معلومات ایسی ہیں جو اور کہیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس کتاب کو لکھنے میں البیرونی نے بڑی محنت کی، کیوں کہ ہندو برہمن اپنا علم کسی اور کو نہیں سکھاتے تھے، لیکن البیرونی نے کئی سال ہندوستان رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندووں کے علوم میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ برہمن تعجب کرنے لگے۔ ان کی ایک دوسری کتاب 'قانون مسعودی' ہے جو علم فلکیات سے متعلق ہے۔ اس کی وجہ سے البیرونی بہت بڑے سائنس داں کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ۱۰۴۸/۱۲/۱۳ء کو وفات پائی۔ [آب کوثر، ص ۶۷] ع ب نعمانی

[2]: یہ شاہان تغلق میں ایک ایمان دار اور صفات ستودہ کا مالک اور رجب نامی سپہ سالار کا مالک تھا۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا تھا جس کے بعد چچا غیاث الدین تغلق [متوفیٰ ۱۳۲۵ء] نے اس کی ایسی پرورش کی کہ اسے یتیمی کا ذرا بھی احساس نہ ہونے دیا، لیکن جلد ہی چچا کا بھی انتقال ہوگیا تو اس کی پرورش اس کے چچازاد بھائی محمد تغلق [جونا خان] نے اپنے باپ سے بھی زیادہ اچھی طرح کی جس کا ۲۰/مارچ ۱۳۵۱ء کو انتقال ہوگیا۔ چچازاد بھائی کے انتقال کے بعد فیروز شاہ اس کا جانشین ہوا اور بہترین حکومت کرتا ہوا ۲۳/اکتوبر ۱۳۸۸ء میں انتقال کر گیا۔ جون پور شہر سے چند کیلومیٹر کے فاصلے پر لب سڑک اس کا مقبرہ مخدوش حالت میں واقع ہے۔ ع ب نعمانی

[3]: محمد تغلق کا اصل نام جونا خان تھا۔ جب تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اپنا لقب محمد تغلق اختیار کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے جب اس کے نام پر شہر جون پور آباد کیا تھا تو اس کا نام جونا پور رکھا تھا جو بعد میں کثرت استعمال کے سبب جون پور ہوگیا [ہندوستان میں اسلامی حکومت۔ ص ۳۱۶]۔ ع ب نعمانی

اس وقت دہلی سے علماء اور مشائخ کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں آکر بس گئی جن کے لیے دربار شاہی سے وظیفے مقرر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پورب میں مضافات جون پور کو نامور علماء اور مشاہیر مصنفین کا علمی مرکز ہونے کی وجہ سے جتنی شہرت حاصل ہے اتنی کسی علاقہ کو نہیں۔ پورب کی تشریح کرتے ہوئے ہندوستان کے جلیل القدر عالم اور مورخ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی[1] اپنی کتاب 'مآثرالکرام' میں شاہجہاں بادشاہ کے مشہور شاہانہ فقرہ:

پورب شیرازِ مملکت ماست

کو درج کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیارِ پورب سے شاہجہاں کو غایت درجہ شغف تھا۔ مولانا اپنی دوسری مشہور کتاب 'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' میں ہندوستان کے صرف ایک حصہ پورب کے علمی چرچوں کا تذکرہ فرماتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت پورب کے صوبوں میں صوبۂ اودھ، صوبۂ الٰہ آباد اور صوبۂ عظیم آباد تھے اور بنارس و جون پور عظیم آباد کے صوبوں میں شامل تھے۔ فرماتے ہیں:

وعبارة عن ثلاث صوب	پورب کا اطلاق تین صوبوں
صوبة اوده وصوبة الہ آباد	پر ہوتا ہے، صوبہ اودھ، صوبہ
وصوبة عظیم آباد	الٰہ آباد اور صوبہ عظیم آباد[2]

(سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان)

یہ شہادت تو خیر بہت بعد کی ہے، ورنہ اسلامی ہندوستان سے پہلے کے دور میں ان علاقوں کو بڑی مرکزیت حاصل تھی۔ بنارس اور سارناتھ کے علاقے میں بدھ مت کی جو

---

[1]: آپ کا نام میر غلام علی واسطی حسینی ہے۔ ضلع ہردوئی میں واقع قصبہ بلگرام میں ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک باکمال شاعر، مورخ اور تذکرہ نگار تھے۔ بلگرام سے اورنگ آباد آکر نواب حیدرآباد کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں سبحۃ المرجان [علماء ہند کا تذکرہ] ید بیضاء [عام شعراء کا تذکرہ] خزانہ عامرہ [صلہ یافتہ شعراء کا تذکرہ] سرو آزاد [ہندی نژاد شعراء کا تذکرہ] مآثرالکرام [علماء بلگرام کا تذکرہ] اور روضۃ الاصفیاء [اولیاء اورنگ آباد کا تذکرہ] زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۷۸۶ء میں وفات پائی۔ ع ب نعمانی

[2]: عظیم آباد وہی ہے جو اب پٹنہ کے نام سے مشہور ہے۔ ع ب نعمانی

قدیم یادگاریں اور ویہار [تعلیمی خانقاہیں] ہیں ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہر کو ہر دور میں بڑی مرکزیت حاصل رہی ہے جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا نام 'تاریخ آثار بنارس' اور دوسرے حصے کا نام 'تذکرہ مشائخ بنارس' ہے جس میں پانچویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے آخر تک کے بنارس کے علماء و مصنفین اور حضرات مشائخ کے حالات ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ضمنی طور پر ان کے حالات آگئے ہیں، لیکن ان کا تکملہ دوسرے حصے میں کر دیا گیا ہے۔

۱۹۳۹ء میں چودھری نبی احمد سندیلوی [ایم آر اے ایس بنارس] نے بنارس کی ایک تاریخ ' مرقع بنارس' مرتب کی تھی جو شائع ہو چکی ہے اور ہم نے بھی دیکھی ہے۔ اس میں مصنف سے بعض تسامحات بھی ہوے ہیں، پھر بھی نقش اول کی حیثیت سے چودھری صاحب کی یہ خدمت قابل قدر ہے۔

تاہم افسوس یہ ہے کہ آج تک ہندوستان کی کوئی صحیح اور سچی تاریخ لکھی ہی نہیں گئی ـــــــ مغلیہ دور حکومت میں تاریخ کی بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن المیہ یہ ہے کہ وہ کتابیں انگریزوں نے اپنے دور میں مسخ کر دیں یا یہاں سے اٹھا لے گئے اور انہوں نے بعض زر خرید مورخین سے ایسی تاریخیں لکھوائیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اپنے اسلاف کے کارناموں کو دیکھ کر شرمائیں اور آپس میں نفرت اور غم وغصہ کی آگ میں سلگتے رہیں۔

بالآخر اس 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمان اپنے ان تاریخی ذخیروں سے محروم ہو گئے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

وہ موتی علم وحکمت کے کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

ہم نے 'انڈیا آفس لندن' اور 'برٹش میوزیم' کی ایسی کتابوں کی فہرست حاصل

کی ہے جنہیں ہندوستان سے انگریزوں نے وہاں منتقل کردی ہیں اور ان سے ہم نے استفادہ بھی کیا ہے۔

آج کا انگریزی خواں طبقہ تاریخ سے مطلق بے خبر ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزوں کے دور کی اندھی تقلید کی جارہی ہے اور وہی کتابیں نصاب میں داخل ہیں جن سے فریقین میں آج بھی نفرت اور غم وغصہ کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا جرم ان مصنفین اور دانشوروں کا ہے جنہوں نے اپنی کتابوں میں ایسے زہر اگلے ہیں جن سے ہندوستان کی ایکتا اور قومی یکجہتی پر سخت اثر پڑا ہے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھنے میں بجائے وصل پیدا کرنے کے فصل پیدا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سر جادو ناتھ سرکار[1] کی اورنگ زیب پر لکھی ہوئی پانچ جلدیں[2] بڑی شہرت کا باعث ہوئیں جن میں دل کھول کر اورنگ زیب کے مذہب پر حملہ کیا گیا ہے مثلاً:

> "ایک مذہب جو اپنے پیروؤں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

[اورنگ زیب، جلد سوم ص ۲۶۴ تا ۲۶۸]

ممکن ہے کہ یہ تحریر انگریزوں کے دور کی ہو جس کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی ہو۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد جب کہ انگریز ہندوستان سے جا چکے تھے، مسٹر آر سی مجومدار[3] نے اپنی ایک تحریر میں مسلمانوں کو ملیچھ بنا کر

---

[1]: یہ موجودہ بنگلہ دیش میں راج شاہی ڈویژن کے ضلع ناٹور کے کرانا می علاقے میں ۱۰/۱۲/۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی، فن تاریخ سے خاص لگاؤ اور درس وتدریس ذاتی مشغلہ تھا۔ مختلف مقامات پر تعلیمی خدمات انجام دیتے ہوئے اگست ۱۹۲۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ان کی رہائش گاہ واقع کلکتہ اس وقت ریسرچ سینٹر کی شکل میں ہے۔ ۱۹ر مئی ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[2]: ان کی اس کتاب کا نام 'اے ہسٹری آف اورنگزیب' ہے جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

[3]: آر، سی، [رمیش چند] مجومدار ضلع فرید پور [موجودہ بنگلہ دیش] کے خان یارا نامی گاؤں میں ۴/۱۲/۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں ۷ سال تک شعبۂ تاریخ میں پروفیسر رہے۔ ان کی یہ کتاب [ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیپل] ۱۱ جلدوں میں ۱۹۵۱ء میں ممبئی سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

ان کی ہندوستان میں آمد کو ایک المیہ قرار دیا اور اس دکھ کا اظہار کیا کہ شیخی بگھارنے والے ہندو راجاؤں نے مل کر اس بات کی کوشش نہیں کی کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر اپنے گوشت کا کانٹا نکال پھینکتے۔ [ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیپل ج۵]

حال ہی کے ایک ممتاز تاریخ نویس ڈاکٹر ایشوری پرشاد [ایم اے] پروفیسر ہسٹری، الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی تاریخ میں جو انگریزی مدرسوں کے اوپر کے درجات کے لیے لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کے انصاف پسند شہنشاہ عالمگیر [متوفی ۱۷۰۷ء] پر زبردست الزام لگایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "اورنگ زیب نے بھی یہی حکم لگا دیا تھا کہ کوئی اس کے زمانے کے واقعات کا حال نہ لکھے، مگر ایک ہمعصر مسلمان مورخ محمد ہاشم خفیہ طور سے اس زمانے کے حالات لکھتا رہا، اس لیے وہ خافی خاں کہلاتا ہے۔ اس کی کتاب 'منتخب اللباب' سے اورنگ زیب کے زمانے کے حالات بہت کچھ معلوم ہوتے ہیں۔" [تاریخ ہند ص ۳۰۲]

یہ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ دانی کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے عالمگیر پر الزام لگا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ تاریخ سے اپنی ناواقفیت کا بھی ثبوت دیا ہے اور خفیہ سے خافی خاں نام پڑنے کی وجہ بھی خوب بیان کی ہے جو کہ عربی قواعد کے سراسر خلاف ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ 'ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال[۱]' سے جو نسخہ طبع ہوا ہے وہ بھی خافی خاں ہی کے نام سے منسوب ہے۔ حالانکہ یہ 'خواف' کی طرف نسبت ہے جو نیساپور [خراسان] کا ایک بڑا قصبہ ہے، جس کی بحث آگے مآخذ کی فہرست میں آرہی ہے۔

یہ تو ایک خافی خاں کا ذکر تھا جو ضمنی طور پر نکل آیا ورنہ عالمگیر ہی کے عہد میں بیسیوں تاریخیں ایسی ہیں جو فارسی میں مرتب ہوئیں اور ان کو ہندوؤں نے مرتب کیا جن کے قلمی

۱: سر ولیم جانس [م ۱۷۹۴ء] نے مشرقی تہذیب کی تحقیقات کے تعلق سے یہ ادارہ ۱۵/۱/۱۷۸۴ء میں میوزیم کی شکل میں کلکتہ میں قائم کیا تھا، جو آج بھی ون پارک سٹریٹ کلکتہ میں موجود ہے۔ ع ب نعمانی

نسخے انڈیا آفس لندن میں موجود ہیں۔ اس بحث سے ہم کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ تاریخ کا فن اس دور میں 'بازیچۂ اطفال' بن گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے بھی تاریخیں مرتب کی ہیں ان میں اس قسم کی گل کاریاں کی گئی ہیں جن سے تاریخ کا وقار گر گیا ہے۔ آج کل تاریخ لکھی نہیں جاتی بلکہ بنائی جاتی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ بنائیں نہیں بلکہ لکھیں تا کہ ہم سنیں اور ہمارا ملک بھی سنے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قلمی سرمایوں، قیمتی کتابوں، سرکاری رپورٹوں اور شاہی دستاویزوں سے فائدہ اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا اگر حالات ایک یا چند کتابوں میں جمع مل جاتے یا کم از کم کتابوں میں آج کے طریقے کے مطابق انڈکس یا فہرستیں ہوتیں، مگر مولف ان تمام سہولتوں سے یکسر محروم تھا۔ اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی شکل نہ تھی کہ وہ صدہا کتابیں لفظ بہ لفظ پڑھی جاتیں جن سے بنارس کے متعلق کچھ بھی ملنے کی امید ہو۔

اس موقع پر اپنے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے اپنے خاص ذوق سے مولف کی ہر ممکن مدد کی ہے، جن میں محترم دوست خواجہ افضل امام [ایم اے، ریسرچ اسکالر پٹنہ یونیورسٹی] خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ موصوف ہی کے توسط سے مہاراجا بنارس کا کتب خانہ نظر سے گزرا اور اس سے معتدبہ فائدہ اٹھایا۔ اپنے عزیز دوست مولانا ڈاکٹر حکیم بشیر احمد صاحب مرحوم[1] ایف ایم بی ایس [میڈیکل کالج الہ آباد] کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی بروقت مستعدی اور ان کے اپنے جمع کردہ مواد اور حوالوں سے بڑی مدد ملی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے محترم بزرگوار حضرت مولانا سید شاہ شاہد علی صاحب سبز پوشؒ، [متوفی ۱۴۰۱ھ] رئیس اعظم گورکھپور و سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جون پور و آستانہ حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسیؒ کے حق میں دعاے مغفرت کر رہا ہوں۔ [خدا ان کو

۱: آپ حضرت مولانا محمد عمر منطقیؒ [متوفی ۱۹۶۷ء] ساکن چھتن پورہ شہر بنارس کے فرزند دلبند تھے، عین عالم جوانی میں ۱۹۶۰ء میں وفات پائی۔ ع ب نعمانی

کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے] کہ ان کے قلمی ونادر کتب خانہ سے خوشہ چینی کی، جس کے بغیر کتاب کی ترتیب نامکمل ہوتی۔

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت

دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے، ان کی پوری تفصیل آگے آرہی ہے۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس کتاب کی ترتیب میں کتنی جدوجہد کی گئی ہے۔ اب یہ عہد اسلامی کی ایک ہزار سالہ تاریخ ہوگئی ہے جو صرف بنارس سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اہم تاریخی مقامات، مسجدوں اور شاہی عمارتوں کی تصویریں بھی لگادی گئی ہیں جن سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ غرض کتاب کے زیرِ نظر ایڈیشن کو سابقہ ایڈیشنوں سے کئی گونہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عبدالسلام نعمانی مجددی

مآخذ

وہ کتابیں جن سے اس تالیف میں مدد ملی

۱۔کتاب الهند:

۴۳۹ م۱۰۴۸ء میں ابو ریحان البیرونی نے جب ہندوستان کے اطراف، شمال و بنارس کی سیاحت کی تو عربی زبان میں یہ سفرنامہ مرتب کیا۔کتاب کے دو نسخے ہالینڈ اور لندن سے شائع ہوے ہیں اور دونوں میری نظر سے گزر چکے ہیں۔اس کتاب میں بنارس کے برہمنوں اور ان کی تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت پر تو روشنی ڈالی گئی ہے لیکن مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے۔اس کتاب کا اصل نام تو مالـلهـند ہے،لیکن 'کتاب الہند' زیادہ مشہور ہے۔اس کے اردو ترجمے بھی چھپے ہیں جو انتخاب اور خلاصوں کی شکل میں ہیں،لیکن افسوس کہ مترجمین نے اس کے ساتھ بڑا بے رحمانہ سلوک کیا ہے اور یہ ترجمے تحریف سے خالی نہیں ہیں۔

۲۔سبحة المرجان في آثار هندوستان :

مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ [متوفیٰ ۱۷۸۶ء] نے یہ کتاب عربی میں آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے لکھی ہے جس میں ہندوستان کی علمی تاریخ درج ہے۔ مہاراجا ایشری پرشاد والی بنارس [م۱۸۸۹ء] کے ایماء سے اس کا فارسی ترجمہ سید شمس الدین حسنی نامی کسی شخص نے کیا،جیسا کہ مقدمہ میں درج شدہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

مہاراجا ایشری پرشاد صاحب — وحید العصر عالی خاندان ست
امیر بےنظیر و قدر دانے — کہ رائش پیرو اقبالش جوان ست
کمر بستم بہ فرمان سترگش — کہ ہردم واجب الاذعان جان ست
کنم عطف عناں از وادی نظم — کہ امر نثر حکم ترجمان ست

یہ فارسی ترجمہ مہاراجا بنارس کی لائبریری واقع اندرون قلعہ رام نگر میں ہے۔

۳۔لطائف اشرفی:

مرتبہ شیخ نظام یمنی،مرید خاص حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ [متوفیٰ ۸۰۸ھ]

یہ نسخہ مدرسہ مظہر العلوم بنارس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ بنارس کی تاریخ کے سلسلے میں اکثر واقعات ضمنی طور سے آ گئے ہیں، لیکن بہت سے واقعات غیر مستند ہیں جو الحاق کا نتیجہ ہیں۔ کتاب کا دیباچہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب ورقاً بعد ورقٍ حضرت مخدوم صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے دیباچے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کی ترتیب ۱۳۴۹ء مطابق ۷۵۰ھ میں ہوئی۔

۴۔ گنج ارشدی:

یہ شیخ محمد ارشد جون پوریؒ کے ملفوظات کا فارسی ترجمہ ہے جسے ان کے مرید حضرت شیخ شکر اللہ نے جمع کیا ہے۔ کتاب ملفوظ کا ملفوظ اور تاریخ کی تاریخ ہے۔ ترتیب یوں ہے کہ شجرۂ عروجی حضرت بدر الحقؒ سے لے کر آنحضرت تک کے تمام ہی پیران سلاسل کے مفصل احوال درج ہیں، انہی کے ضمن میں سلاطین کے حالات اور بنارس کے بھی تاریخی واقعات آ گئے ہیں۔ تقریباً ۴۰۰ سال پہلے یہ کتاب تالیف ہوئی، قلمی نسخہ 'خانقاہ رشیدیہ' واقع جونپور میں میری نظر سے گزرا ہے۔

۵۔ گنج رشیدی:

یہ دیوان عبد الرشید جونپوری [متوفیٰ ۱۰۸۳ھ] خلیفہ حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسیؒ [متوفیٰ ۱۰۴۲ھ] کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے آپ کے مرید نصرت جمال خاں ملتانی نے جمع کیا ہے۔ یہ ملفوظات ۱۰۷۲م ۱۶۶۲ء سے ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۳ء تک کے ہیں جن میں تاریخی واقعات کافی آ گئے ہیں۔ قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں ہے۔

۶۔ کاشی کھنڈ: [ترجمۂ فارسی]

قلمی نسخہ مہاراجا بنارس کی اسٹیٹ لائبریری رام نگر میں ہے۔

۷۔ عالمگیر نامہ: [از منشی محمد کاظم]

اورنگ زیب عالمگیرؒ [متوفیٰ ۱۷۰۷ء] کے حکم سے ان کے ابتدائی دس سالہ دور حکومت کی تاریخ مرتب کی گئی تھی جو بحکم عالمگیر آگے چل کر روک دی گئی۔ عالمگیر نے اسے اس نظریہ کی بنا پر روک دی کہ حکومت کے زیر سایہ لکھی ہوئی تاریخ تاریخ نہیں، تاریخ وہی مستند ہے جو دوسرے اہل قلم لکھیں۔ بہر حال یہ کتاب عرصہ ہوا ٹائپ میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہوئی ہے۔

۸۔واقعات عالمگیری: [قلمی] مصنفہ امیر خاں
اس میں عالمگیر کی ولادت، شاہزادگی اور پھر تخت نشینی سے لے کر شاہجہاں کی وفات ۱۶۵۸ء تک کے حالات ہیں۔ اسکا ایک نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ہے۔

۹۔خلاصہ عالمگیر نامہ: مولفہ حاتم خاں
یہ عالمگیر نامہ کا خلاصہ ہے جو دسویں سال مرتب ہوا۔ برٹش میوزیم میں جو نسخہ ہے وہ عالمگیر کے ۴۷ویں سال حکومت ۱۱۱۵ھ م ۱۷۰۳ء کا مکتوب ہے۔

۱۰۔ بلونت نامہ از خیر الدین :
راجا بلونت سنگھ والی ریاست بنارس [متوفی ۱۷۷۰ء] نے اپنے عہد حکومت از ۱۱۵۵ھ م ۱۷۴۰ء تا ۱۱۸۴ھ م ۱۷۷۰ء کی تاریخ لکھائی ہے جس میں ریاست بنارس کے تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ بنارس شہر کے بھی تاریخی واقعات آگئے ہیں۔ قلمی نسخہ ریاست رام نگر بنارس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱۔ لب التواریخ ھند:
مولفہ رائے بندرا بن پسر رائے بہرا مل۔ اس میں مسلمان فرمانروا شہاب الدین غوری [متوفی ۱۲۰۶ء] کے عہد حکومت ۵۷۶ھ م ۱۱۸۰ء سے عالمگیر کے ۳۳ ویں سال حکومت ۱۱۰۱ھ م ۱۶۸۹ء تک کے حالات ہیں۔ یہ عالمگیر کے عہد میں تصنیف ہوئی اور اس کا ایک نسخہ عہد عالمگیر کے ۴۲ویں سال حکومت ۱۱۱۰ھ م ۱۶۹۸ء کا لکھا ہوا انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔

۱۲۔تاریخ خوافی: [خوافی خاں]
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے یہ نسخہ ٹائپ کے حروف میں طبع ہوا ہے۔ غلطی سے 'خوافی خاں' کے بجائے پوری کتاب میں 'خافی خاں' چھپا ہے۔ 'خوافی' خواف کی طرف منسوب ہے جو کہ نیساپور [خراسان] میں ایک بڑا قصبہ ہے۔ جیسا کہ معجم البلدان میں ہے:

خواف قصبة كبيرة من	خواف خراسان میں واقع
اعمال نیساپور بخراسان	نیساپور میں ایک بڑا قصبہ ہے۔

[ج ۳ ص ۳۷۹] مطبوعہ مصر

یہی 'خواف' تھا جہاں کے بڑے بڑے علماء وفضلاء مغل بادشاہوں کے دربار سے وابستہ تھے۔ مصنف نے خود ہی 'منتخب اللباب' میں خواف کی تفصیلات بیان کی ہیں اور کتاب میں ہر جگہ خوافی خاں کا نام لکھا ہے۔

۱۳۔تاریخ بیهقی: [فارسی]

حال ہی میں اس کا ایران سے نیا ایڈیشن چھپ کر آیا ہے اور کافی معلوماتی ہے۔

۱۴۔تاریخ فرشته:

فارسی مطبوعہ نول کشور لکھنو، مرتبہ: محمد قاسم فرشتہ [متوفی ۱۰۳۳ھ] رام نگر کی لائبریری میں قلمی نسخہ موجود ہے جس سے اکثر وبیشتر استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۵۔ملفوظات مولانا عبدالسبحان: [فارسی]

یہ ۱۲۵۰ھ م ۱۸۳۴ء میں لکھی گئی۔ اس میں بنارس کی اکثر مسجدوں اور شاہی محلوں کی تاریخ ہے۔

۱۶۔تاریخ صنم کدئه بنارس: [اردو]

مصنف کا نام معلوم نہیں، لیکن ۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ میں جب جائیس سے ایک خاندان بنارس آکر آباد ہوا تو اسی خاندان کے کسی اہل ذوق نے یہ تاریخ مرتب کی۔ یہ کتاب بنارس کی ایک مستند تاریخ پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب میں تاریخی کتابوں کے حوالے بھی تھے، لیکن اصل نسخہ ضائع ہو چکا ہے۔ حضرت والد ماجدؒ نے ۱۳۳۵ھ م ۱۹۱۷ء میں یہ کتاب نقل کر کے اپنے کتب خانہ میں رکھ چھوڑی تھی، اس سے معتد بہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ افسوس کہ اب جائیس کا مذکورہ خاندان بھی ختم ہو گیا۔

۱۷۔چراغ نور تاریخ ظفر آباد وجونپور:

مولوی سید نورالدین صاحب زیدی ظفر آبادی نے ۱۲۹۸ھ م ۱۸۸۱ء میں مرتب کی جس میں جستہ جستہ بنارس کے واقعات ہیں۔

۱۸۔تاریخ بنارس : حکیم سید مظہر حسن فتح پوری

اسے طبیب خاص مہاراجا بنارس نے ۱۹۱۳ء م ۱۳۳۱ھ میں مہاراجا کے ایماء سے ترتیب دی، تین جلدوں میں سلیمانی پریس بنارس سے چھپی ہے۔

۱۹۔آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا.

(OXFORD HISTORY OF INDIA)

۲۰۔اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمس [علی گڑھ]

(AURANGZEB AND HIS TIMS)(ALI GARH)

۲۱۔تاریخ زمین داران بنارس: [غلام حسین خاں]

خدا بخش اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

۲۲۔طبقات ناصری: [مطبوعہ کوئٹہ] مصنفہ: مولانا منہاج الدین جوزجانی

یہ کتاب ۲۳ طبقوں پر مشتمل ہے۔طبقہ اول سے طبقہ ۱۱ تک اور پھر طبقہ ۱۷ سے طبقہ ۲۳ تک شاہان غزنی اور غور کے احوال پر مشتمل ہے۔پہلی بار ۱۸۶۴ء میں کلکتہ میں چھپی، پھر ۱۹۴۹ء میں عبدالحئی جیبی قندہاری نے ۲۱ طبقہ کوئٹہ بلوچستان سے طبع کیا۔

۲۳۔تاریخ بنارس: سید محمد رفیع رضوی مطبوعہ لاہور ۱۸۸۷
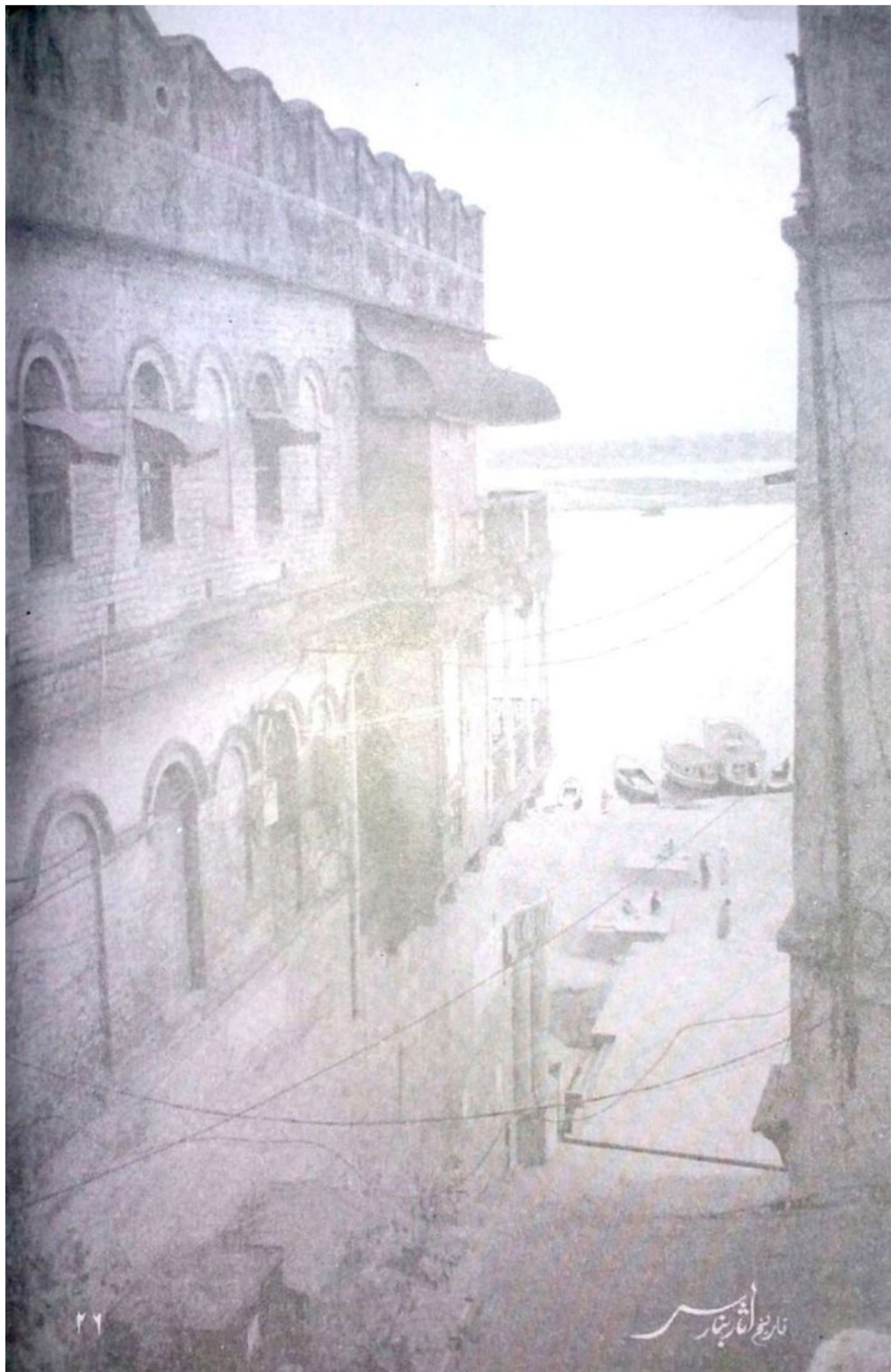
چراغِ دَیر

'صبح بنارس' اور 'شام اودھ' دونوں اپنی رنگینیوں کے ساتھ بہت مشہور ہیں۔ ۱۸۲۷ء میں مرزا غالبؔ [متوفی ۱۸۶۹ء] جب دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس آئے تو شاہ عالم [متوفی ۱۸۰۶ء] کے شاہی مکان واقع دال منڈی میں مقیم ہوئے۔ یہ موسم سرما کا زمانہ تھا اور اس وقت مرزا کی عمر صرف تیس سال تھی۔ یہاں کے زمانہ قیام میں مرزا غالبؔ اس دیار دلبراں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل 'مثنوی چراغ دیر' لکھ کر شہر نگاراں کو ایک انمول خراج تحسین پیش کیا۔ یہ مثنوی غالبؔ کی تمام مثنویوں میں سب سے ممتاز اور اپنی دلکشی کے اعتبار سے بے مثل ہے[1]

نَفَس با صوُرِ دَم ساز است اِمروز　　خموشی محشرِ راز است اِمروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم　　کفِ خاکم غبارے می نویسم
دل از شورِ شکایتہا بجوش است　　حُبابِ بے نوا طوفاں خروش است
بلَب دارم ضمیر آلا بیانی　　نفس خوں کُن جگر پالا فغانی
پریشاں تر ز زُلفم داستانیست　　بدعویٰ ہر سرِ مُوئیم زَبانیست
شکایت گونۂ دارم ز احباب　　کتانِ خویش می شویم بمہتاب
در آتش از نوائے ساز خویشم　　کبابِ شعلۂ آواز خویشم

---

[1] : حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے سابقہ ایڈیشن میں اس مثنوی کے چیدہ چیدہ بیس بائیس اشعار نقل فرمائے تھے۔ ہم اس ایڈیشن میں مکمل مثنوی محض اس خیال سے شامل کر رہے ہیں کہ آج غالب کا فارسی دیوان نایاب ہے۔ لہٰذا بنارس کو دی گئی غالب کی یہ بے مثل سوغات پورے طور پر سامنے آجائے۔

نفس ابریشمِ سازِ فُغانست — بسانِ نَے تپم در استخوانست

محیط افگندہ بیروں گوہرم را — چو گرد افشاندہ آہن جوہرم را

ز دہلی تا بروں آوردہ بختم — بطوفانِ تغافل دادہ رختم

کس از اہلِ وطن غم خوارِ من نیست — مرا در دہر پندارے وطن نیست

ز اربابِ وطن جویم سہ تن را — کہ رنگ و رونق اند این نہ چمن را

چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم — ہم از حق فضلِ حق را باز خواہم

چو حرزِ بازوِ ایماں نویسم — حسام الدین حیدر خاں نویسم

چو پیوندِ قبائے جاں طرازم — امین الدین احمد خاں طرازم

گرفتم کز جہان آباد رفتم — مر ایناں را چرا از یاد رفتم

مگر داغِ فراقِ بوستاں سوخت — غمِ بے مہریِ ایں دوستاں سوخت

جہان آباد گر نبود الم نیست — جہان آباد بادا جائے کم نیست

نباشد قحط بہرِ آشیانے — سرِ شاخِ گلے در گلستانے

سپس در لالہ زارے جا تواں کرد — وطن را داغِ استغنا تواں کرد

بخاطر دارم اینک گل زمینے — بہار آئیں سوادِ دل نشینے

کہ می آید بدعویٰ گاہِ لافش — جہان آباد از بہرِ طوافش

نگہ را دعویِ گلشن ادائے — ازاں خرم بہارِ آشنائے

سخن را نازشِ مینو قماشی — ز گلبانگِ ستایشہائے کاشی

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور — بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

بنارس را کسے گفتا کہ چین است — ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بخوش پُرکاریِ طرزِ وجودش — ز دہلی می رسد ہردم درودش

بنارس را مگر دیدست در خواب — کہ می گردد ز نہرش در دہن آب

حسودش گفتن آئینِ ادب نیست — ولیکن غبطہ گر باشد عجب نیست

تناسخ مشرباں چو لب کشایند — بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد — دگر پیوندِ جسمانی نگیرد

چمن سرمایۂ امید گردد — بمردن زندۂ جاوید گردد

زہے آسودگی بخشِ روانہا — کہ داغِ چشم می شوید ز جانہا

شگفتی نیست از آب و ہوایش — کہ تنہا جاں شود اندر فضایش

بیا اے غافل از کیفیت ناز — نگاہے بر پریزادانش انداز

ہمہ جانہاے بے تن کن تماشا — ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا

نہادِ شاں چو بوے گل گراں نیست — ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست

خس و خارش گلستانست گوے — غبارش جوہرِ جانست گوے

دریں دیرینہ دیرستانِ نیرنگ — بہارش ایمن است از گردشِ رنگ

چہ فروردیں چہ دیماہ و چہ مرداد — بہر موسم فضایش جنت آباد

بہاراں در شتا و صیف ز آفاق — بکاشی می کنند قشلاق و ییشلاق

بود در عرض بال افشانیِ ناز — خزانش صندلِ پیشانیِ ناز

بہ تسلیم ہواے آں چمن زار — ز موجِ گل بہاراں بستہ زنار

فلک را قشقہ اش گر بر جبیں نیست — پس ایں رنگینیِ موجِ شفق چیست؟

کف ہر خاکش از مستی کنشتے — سرِ ہر خارش از سبزی بہشتے

سوادش پاے تختِ بت پرستاں — سراپایش زیارت گاہِ مستاں

عبادت خانۂ ناقوسیانست — ہمانا کعبۂ ہندوستانست

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور — سراپا نور ایزد چشمِ بد دور

میانہا نازک و دلہا توانا — ز نادانی بکارِ خویش دانا

تبسم بسکہ در لبہا طبیعیست — دہنہا رشکِ گلہاے ربیعیست

اداے یک گلستاں جلوہ سرشار — خرامے صد قیامت فتنہ در بار

به لطف از موج گوہر نرم روتر ‌ ‌ ‌ ‌ بناز از خونِ عاشق گرم دوتر
زانگیز قد انداز خرامے ‌ ‌ ‌ ‌ بپاے گلبنے گسترده دامے
زرنگیں جلوہا غارت گر ہوش ‌ ‌ ‌ ‌ بہار بستر و نوروز آغوش
زتابِ جلوۂ خویش آتش افروز ‌ ‌ ‌ ‌ بتان بت پرست و برہمن سوز
بسامانِ دو عالم گلستاں رنگ ‌ ‌ ‌ ‌ زتابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
رسانده از ادائے شست و شوئے ‌ ‌ ‌ ‌ بہر موجے نویدِ آبروئے
قیامت قامتاں مژگاں درازاں ‌ ‌ ‌ ‌ زمژگاں برصفِ دل نیزه باراں
بہ تن سرمایۂ افزائشِ دل ‌ ‌ ‌ ‌ سراپا مژدۂ آسایشِ دل
بہ مستی موج را فرموده آرام ‌ ‌ ‌ ‌ زلغزے آب را بخشیده اندام
فتاده شورشے در قالبِ آب ‌ ‌ ‌ ‌ زماہی صد دلش در سینہ بیتاب
زبس عرضِ تمنا می کند گنگ ‌ ‌ ‌ ‌ زموج آغوشہا وامی کند گنگ
زتاب جلوہا بیتاب گشتہ ‌ ‌ ‌ ‌ گہرہا در صدفہا آب گشتہ
مگر گوئے بنارس شاہدے ہست ‌ ‌ ‌ ‌ زگنگش صبح و شام آئینہ در دست
نیازِ عکسِ روئے آں پری چہر ‌ ‌ ‌ ‌ فلک در زر گرفت آئینہ از مہر
بنام ایزد زہے حسن و جمالش ‌ ‌ ‌ ‌ کہ در آئینہ می رقصد مثالش
بہارستانِ حسنِ لااُبالیست ‌ ‌ ‌ ‌ بہ کشورہا سرورِ بے مثالیست
بہ گنگش عکس تا پرتو فگن شد ‌ ‌ ‌ ‌ بنارس خود نظیر خویشتن شد
چو در آئینۂ آبش نمودند ‌ ‌ ‌ ‌ گزندِ زخمِ چشم از وے ربودند
بہ چین نبود نگارستاں چو اوی ‌ ‌ ‌ ‌ بگیتی نیست شارستان چو اوی
بیاباں در بیاباں لالہ زارش ‌ ‌ ‌ ‌ گلستاں در گلستاں نو بہارش
شبے پرسیدم از روشن بیانے ‌ ‌ ‌ ‌ زگردشہاے گردوں راز دانے
کہ بنی نیکوئیہا از جہاں رفت ‌ ‌ ‌ ‌ وفا و مہر آدم از میاں رفت

ز ایمانہا بجز نامے نماندہ ‏ بغیر از دانہ و دامے نماندہ

پدرہا تشنۂ خون پسرہا ‏ پسرہا دشمنِ جانِ پدرہا

برادر با برادر در ستیز است ‏ وفاق از شش جہت رو در گریز است

بدیں بے پردگیہاے علامت ‏ چرا پیدا نمی گردد قیامت؟

بنفخ صور تعویق از پے چیست؟ ‏ قیامت را عناں گیر جنوں کیست؟

سوِ کاشی باندازِ اشارت ‏ تبسم کرد و گفتا ایں عبارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا ‏ کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

بلند افتادہ تمکینِ بنارس ‏ بود بر اوجِ اوٗ اندیشہ نارس

الا اے غالب کار اوفتادہ ‏ زچشمِ یار و اغیار اوفتادہ

ز خویش و آشنا بیگانہ گشتہ ‏ جنوں گل کردہ و دیوانہ گشتہ

چہ محشر سرزد از آب و گل تو ‏ دریغا از تو و آہ از دلِ تو!

چہ جوئی جلوہ زیں رنگیں چمنہا ‏ بہشتِ خویش شو از خوں شدنہا

جنونت گر بہ نفس خود تمام ست ‏ ز کاشی تا بکاشاں نیم گام ست

چو بوے گل ز پیراہن بروں آی ‏ بآزادی ز بندِ تن بروں آی

مدہ از کف طریق معرفت را ‏ سرت گردم بگردِ ایں ششجہت را

فرو ماندن بکاشی نارسائیست ‏ خدارا ایں چہ کافر ماجرائیست؟

ازیں دعویٰ بآتش شوے لب را ‏ بخواں غمنامۂ ذوقِ طلب را

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر ‏ دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر

دریغا در وطن واماندۂ چند ‏ بخوں دیدہ ز ورق راندۂ چند

ہوس را پاے در دامن شکستہ ‏ بامید تو چشم از خویش بستہ

بشہر از بیکسی صحرا نشیناں ‏ بروی آتش دل جاگزیناں

مگر کاں قوم را دہر آفریدہ ‏ ز سیماب بر آتش آرمیدہ

ہمہ در خاک وخوں افگندۂ تو　　بحکم بے کسیہا بندۂ تو

چو شمع از داغِ دل آذر فشاناں　　بزمِ عرض دعوی بے زباناں

سر و سرمایہ غارت کردۂ تو　　ز تو نالاں ولے در پردۂ تو

از آنانت تغافل خوشنما نیست　　بداغِ شاں ہوائے گل روا نیست

ترا اے بے خبر کاریست در پیش　　بیابانے و کہساریست در پیش

چو سیلابت شتاباں می تواں رفت　　بیاباں در بیاباں می تواں رفت

ترا ز ندوہ مجنوں بود باید　　خراب کوہ و ہاموں بود باید

تن آسانی بتاراجِ بلا دہ　　چو بینی رنج خود را رو نمادہ

ہوس را سر ببالینِ فَنا نِہ　　نفس را از دل آتش زیر پا نِہ

دل از تابِ بلا بگداز خوں کن　　ز دانش کارنکشاید جنوں کن

نفس تا خود فرو ننشیند از پائے　　دمے از جادہ پیمائے میاسائے

شرار آسافنا آمادہ بر خیز　　بیفشاں دامن و آزادہ بر خیز

زاِلاَّ دَم زَن و تسلیم لاَ شَو
بگو اللہ و برقِ ماسِوا شَو

اس مثنوی کو مسلم حریری[۱] کے منظوم اردو ترجمہ کے ساتھ صد سالہ جشن غالب کمیٹی[۲] وارانسی نے شائع بھی کیا ہے۔

---

[۱] : آپ مدنپورہ بنارس کے استاد شعراء میں سے تھے۔ اسم گرامی عبدالحق تھا۔ آپ کی علمی وادبی خدمات تو بے شمار ہیں لیکن ایک ایسا کارنامہ جو آپ کو دیگر شعراء بنارس سے ممتاز کر دیتا ہے وہ مرزا غالب کی اسی مثنوی 'چراغ دیر' کا منظوم اردو ترجمہ ہے جسے سرزمین بنارس میں سب سے پہلے آپ ہی نے فرمایا۔ ۱۵ر فروری ۱۹۸۳ء کو آپ نے وفات پائی۔ ع ب نعمانی

[۲] : جشن غالب کمیٹی کے زیر اہتمام بنارس میں غالب کا صد سالہ جشن منایا گیا تھا، اسی تعلق سے مشہور شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی نظامت میں نگر مہا پالکا بنارس میں ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی منعقد ہوا اور اس میں مسلم الحریری صاحب کے اسی منظوم اردو ترجمہ کا اجراء بھی ہوا۔ اس جشن غالب کمیٹی کے اراکین میں جناب نذیر بناری [متوفی ۱۹۹۶ء] اور جناب ڈاکٹر امرت لعل عشرت [شعبہ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی، متوفی ۱۹۸۹ء] کے اسماء گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔
ع ب نعمانی [بحوالہ جناب شاد عباسی صاحب، مدنپورہ بنارس]

بنارس یا وارانسی

یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے ہلالی شکل میں بسا ہوا ہے۔ اور برنا کے سنگم سے اسی گھاٹ تک تقریباً دس کلومیٹر کی لمبائی میں آباد ہے۔ برنا اور اسی کے درمیان ہونے کی وجہ سے اس کا نام بارانسی تھا جو بگڑ کر وارانسی ہوگیا۔ اب حکومت نے دوبارہ قدامت پسندی کی طرف رجوع کرتے ہوئے بنارس کا نام وارانسی رکھ دیا ہے۔ گو اس نام کو پہلے بھی شہرت حاصل نہ ہوسکی۔ لیکن زمانۂ گزشتہ میں جو تاریخیں مرتب ہوئیں، ان میں بھی بنارس کا تذکرہ وارانسی یا بارانسی ہی کے نام سے ہے۔ 'چچ نامہ'[1] قلمی موجود دارالمصنفین اعظم گڑھ میں بھی بارانسی ہی کے نام سے اس کا ذکر ہے۔ [ص ۲۳]

دہلی سے بنارس ۷۷۲ کلومیٹر اور بنارس سے کلکتہ ٦۷۸ کلومیٹر ہے۔ لکھنو ۲۸٦ اور الٰہ آباد ۱۲۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ذیل کے نقشے کے ذریعہ بنارس کے محل وقوع کا صحیح اندازہ لگ سکے گا۔
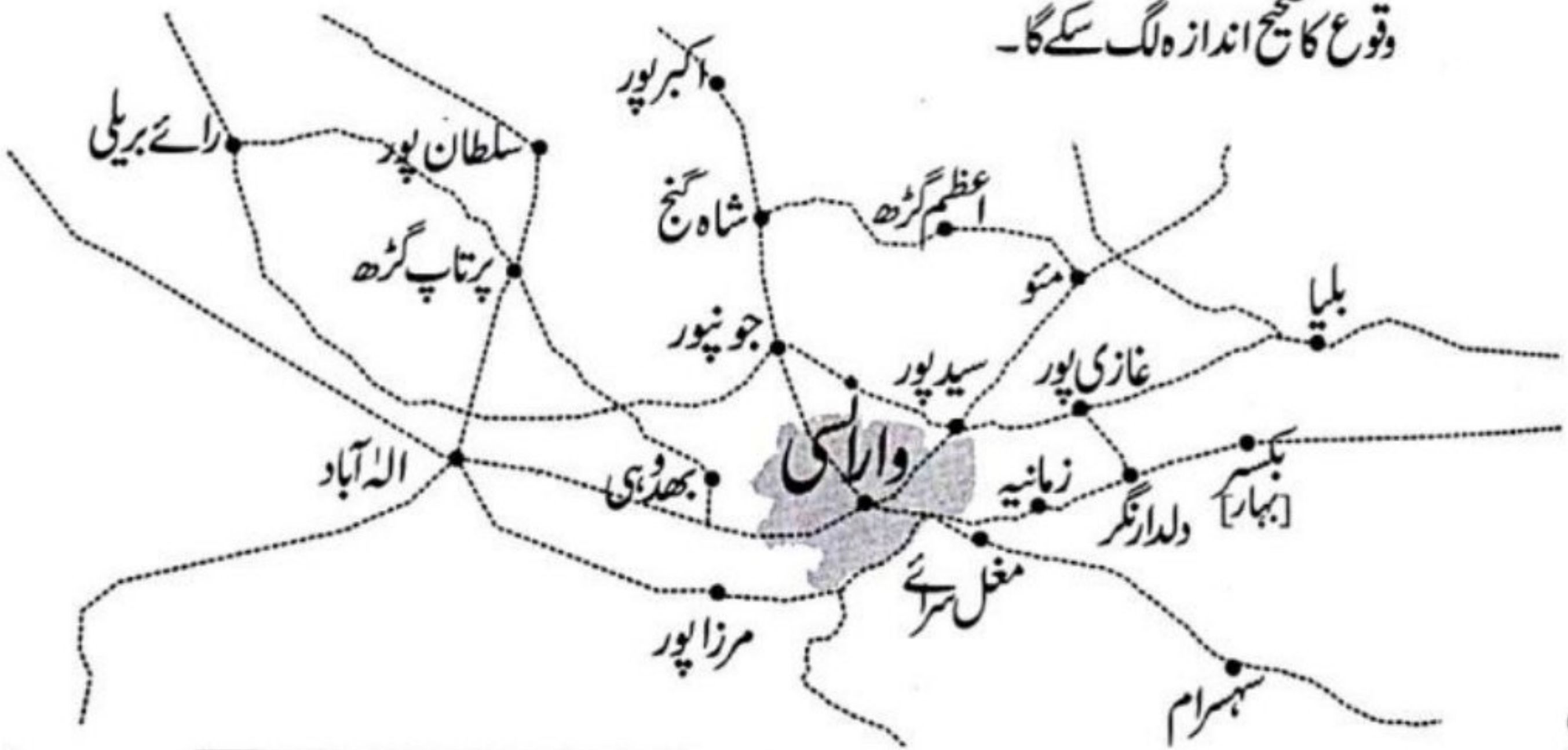
[1]: یہ کتاب راجا داہر [مقتول ۹۳ھ] کے والد راجا 'چچ' [مقتول ۶۵۵ء] کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ع ب نعمانی

بنارس کا محل وقوع اور مختلف شہروں سے اس کے فاصلے

[یہ ریل کے راستے ہیں جن میں بعض شہروں کی مسافت بھی کلومیٹر میں درج ہے]

دہلی ۷۷۲
غازی آباد
میرٹھ ۸۶۲
ہاپوڑ
امروہہ
مراد آباد ۷۴۰
رام پور ۷۱۴
بریلی ۵۶۷
چندوسی [ضلع سنبھل]
بلند شہر ۷۱۹
علی گڑھ ۶۵۴
بدایوں ۲۳۸
کاس گنج
شاہجہاں پور ۵۱۲
متھرا ۶۶۹
ایٹہ
فرخ آباد
ہردوئی
آگرہ ۵۷۲
فیروز آباد
مین پوری
قنوج
اٹاوہ
لکھنؤ ۲۸۶
بارہ بنکی
اناؤ
کان پور ۳۱۵
بہرائچ
بلرام پور
گونڈہ ۲۴۲
نوگڑھ [ضلع سدھارتھ نگر]
بستی
ایودھیا
فیض آباد ۲۰۱
گورکھپور ۲۰۶
گوپال گنج [بہار]
سیوان [بہار]
اکبرپور
رائے بریلی
سلطان پور
پرتاپ گڑھ
شاہ گنج
اعظم گڑھ
مئو
بلیا
جونپور
غازی پور ۹۱
سید پور
وارانسی
زمانیہ
الہ آباد ۱۲۲
بھدوہی
دلدار نگر
بکسر [بہار]
پٹنہ
مغل سرائے
مرزا پور
سہسرام
ستنا [مدھیہ پردیش]
سون بھدر
اتر [شمال]
پیمانہ
کلومیٹر [تقریباً] ۱۰۲ ۶۸ ۳۴
تاریخ آثار بنارس

محل وقوع:

یہ شہر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ہندوستان کا ایک اہم اور مرکزی شہر ہے۔ دہلی اور کلکتہ یا لکھنو اور پٹنہ کے درمیان وارانسی کا اسٹیشن ہے اور مغل سرائے اس کا ایک مرکزی اور ایشیا کا سب سے بڑا جنکشن ہے جہاں سے دہلی اور کلکتہ یا لکھنو، پٹنہ، الہ آباد اور بمبئی کو جانے والی تمام گاڑیاں گزرتی ہیں۔

بنارس یو پی کی مشرقی سرحد پر اس صوبہ کا آخری ضلع ہے جو بہار کی سرحد سے ملا ہوا ہے[1]۔ کرم ناسا ندی بنارس اور بہار کو الگ کرتی ہے۔ ضلع بنارس کے پورب جی ٹی روڈ پر کرم ناسا کا ایک تاریخی پل ہے جس کا نام 'صراط مستقیم' ہے۔ اس پل کو مہاراجا بنی مل بہادر متوطن شاہجہاں آباد نے لارڈ ولیم کے زمانے میں ۱۲۴۷ھ م ۱۸۳۱ء میں تعمیر کرایا۔ اس پل پر فارسی میں ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

تبارک اللہ آں عالی تباری	کہ نامش راجہ بنی مل درامصار
رفیع الشان واں دستگاہی	کہ دست بخشش او پیوستہ درکار
رباط وخانقاہ وچاہ وتالاب	عمارت کرد دریاے دشوار
کنوں از روے رحمت برخلائق	پلے بر کرم ناسا کرد تیار
ازو کس رانشد یارائے ایں پل	کسے کو ساخت سیلش کرد مسمار
زہے تائید اقبال مہاراج	کہ آمد ایں پل سنگیں چوں کہار
پئے تاریخ انجام بنائش	بلیغ از جان ودل شد چوں طلبگار
سروش غیب مصرع متیں گفت	صراط المستقیم آمد پدیدار
	۱۲۴۷ھ

حمد وسپاس بے قیاس جنات قادر مطلق کہ دریں ایام میمنت فرجام تعمیر جسر سنگین برائے دریائے کرم ناسا از دست ہمت والانہمت راجہ بنی مل بہادر خلف رائے بال گوبندا بن راجہ خیالی رام بہادر قوم اگروال متوطن شاہجہاں آباد کہ پیوستہ رحمت حق وقوتش

---

[1] ۱۹۹۷ء میں گنگا اس پار کے جز وحصہ کو چھوڑ کر بقیہ چندولی تک کا علاقہ بنارس ضلع سے علیحدہ کر کے چندولی کو خود مستقل ضلع بنا دیا گیا۔ ع ب نعمانی

برفاہ وآرام رسانی خلائق مصروف است، بعہد حکومت نواب معلیٰ القاب لارڈ ولیم کونڈس بینٹنگ گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ حسب نقشہ وتدبیر صائب صاحب ارسطو فطرت عالی مرتبت مسٹر جیمس بہادر باصرف کثیر ازاں خاص راجہ ممدوح بعرصہ سہ سال درسنہ یک ہزار دوصد وچہل و ہفت مطابق سنہ یک ہزار ہشت صد وسی و یک عیسوی موافق سمبت یک ہزار وہشت صد و ہفت بکر ماجیت حسن انجام یافت، ازانجا کہ ایں پل بے نظیر راحت خلائق وحفظ ثواب است وایں باسم دھرم ست کہ بمعنی جسر الثواب موسوم ومشہور ومقبول ہر خاص وعام گشت۔

۱۔ وارانسی کی وجہ تسمیہ:

اس کا نام وارانسی پڑنے کی وجہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ برہمانے جب اپنی برتری جتانے کے لیے ایک سر اور بڑھا کر پانچ سر کر لیے تو شیو جی کو طیش آگیا، انہوں نے پانچواں سر قلم کر دیا۔ لیکن شیو جی ایسا کر کے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوے اور اپنے اس گناہ کو دھونے کے خیال سے وہ دریائے گنگا کے کنارے ایک مقام پر پہنچے جہاں انہوں نے اپنا خون اور دامن دھو کر مکتی حاصل کی، اسی وجہ سے اس جگہ کا نام وارانسی پڑ گیا جس کا مطلب ہے 'گناہوں کو دھونے والا'۔

اس شہر کو مختلف دور میں مختلف نام سے یاد کیا گیا ہے جن میں چند نام درج ذیل ہیں:

۲۔ کاشی:

یہ اس شہر کا دوسرا نام ہے جو بڑا متبرک اور قدیم ہے۔ یہ لفظ 'کاش' سے بنا ہے جس کے معنی روشن اور درخشاں کے ہیں۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سچی معرفت اور نور حاصل کرنے کے لیے کاشی ایک بہترین جگہ ہے جس کی تصدیق اپنشدوں [ویدکی کتابوں] سے ہوتی ہے۔

یہ تو بہر حال عقیدے کی بات تھی، کاشی نام پڑنے کی دوسری وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ راجا دیوداس کے خاندان میں راجا پورن تھا۔ اس کے پر پوتے راجا کاش نے اس شہر کو بہت ترقی دی اس لیے یہ شہر اس کے نام سے موسوم ہوگیا۔ راجا کاش کی حکومت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۲اسو سال قبل مسیح اس کا دورِ حکومت ہے۔ الہ آباد کے قریب پرستھان پور جس کو اب جھونسی کہتے ہیں، اس کا قلعہ تھا اور دارالسلطنت بارانسی کے نام سے مشہور تھا جس کو لوگ بنارس کہنے لگے۔

ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ۱۲۰۰ ق م میں اس شہر کے راجاؤں کا خاندان 'کشا' تھا، ان کی رعایا اور ان کی نسلوں کو بھی کشا کہا جاتا تھا، ان کی اس شہر میں آبادی اور حکومت کی بناء پر اس شہر کا نام کاشی کہلایا۔ یعنی کشا خاندان کے ہونے کی جگہ۔ سنسکرت کی مشہور کتاب 'ہری ونش پران'[۱] سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ دھنک آکار:

سنسکرت میں دھنک کمان کو کہتے ہیں جو بالکل ہلالی شکل میں ہوتا ہے۔ چوں کہ دریائے گنگا کے کنارے یہ شہر بالکل ہلالی شکل میں آباد ہے، اس لیے یہ نام پڑ گیا۔

۴۔ محمد آباد:

یہ نام اورنگ زیب نے اپنے جلوس سلطنت ۱۰۶۸ھ م ۱۶۵۸ء کے موقع پر رکھا

تھا۔ قدیم کاغذات اور اورنگ زیب کے شاہی فرامین میں کثرت سے لکھا ہوا یہ نام میری نظر سے گزرا ہے۔ شاہی عمارتوں کے کتبات میں بھی یہی نام درج ہے اور یہ نام ان سکوں پر بھی موجود ہے جو بنارس کے دارالضرب [ٹکسال] میں ڈھالے گئے۔

محمد آباد

بنارس

۵۔ اسلام آباد:

مسجد دائم خاں، واقع اردلی بازار وارانسی کے کتبہ میں 'عبادت خانہ اسلام آباد' لکھا ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی اس شہر کا یہ نام بھی تھا، گو اس کی شہرت نہ ہو سکی۔[۲]

---

[۱]: یہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب ہے، جس کے مصنف ان کے مذہبی پیشوا وید بیاس جی ہیں۔ ع ب نعمانی

[۲]: قدیم ہندو روایتوں میں بنارس کے درجنوں صفاتی نام ملتے ہیں۔ میرے برادر حقیقی جناب علام الہندی نے بنارس پر اپنے ایک ہندی رپورتاژ میں اس کے بہت سے ناموں کا ذکر کیا ہے جن میں کاشی پوری، سردھن، اوِمُکت شیتر، رودراواس، سُدردشن آنند کانَن، آنند وَن، آپُنربھوَبھومی، پشپ وتی، رم نگرم اور مہا اشمشان وغیرہ اسماء خاص ہیں اور ہندی و سنسکرت ادب میں انھیں متعدد بار استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن ان ناموں کا استعمال صرف ادبی سطح پر رہا ہے۔ عوام کی زبان پر سوائے کاشی، کاشی پوری، بنارس بارانسی اور وارانسی کے کوئی اور نام کبھی بھی نہیں چڑھ سکا۔ ع ب نعمانی

کاشی کی خصوصیات زمانۂ قدیم میں

زمانۂ قدیم سے کاشی ہندوؤں کا ایک مقدس تیرتھ گاہ رہا ہے اور ہندوستان کے ہر گوشے سے یاترا کرنے والے عقیدت مند کاشی سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں علوم باطنی کے ساتھ ساتھ علوم ظاہری بھی حاصل کرنے کے لیے دور دور سے طلبہ آتے تھے جن کے سیکھنے کے لیے سنسکرت کے بڑے بڑے مدرسے تھے۔

افسوس ہے کہ اب ہندووں کے پاس سے ان کے اس طرح کے عملی اور تاریخی صحیفے ضائع ہو چکے ہیں، جبکہ ویدوں کے اصلی نسخے تو پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں کاشی کا زمانہ قدیم تاریخی اعتبار سے تاریک نظر آتا ہے۔

تقریباً ایک ہزار سال پہلے عہد اسلامی میں جب مشہور سیاح ابوریحان البیرونی [متوفی ۱۰۴۸ھ] نے ہندوستان میں قدم رکھا تو کاشی کی عظمت کے قصے سنے اور اس نے یہاں سالہا سال قیام کرنے کے بعد مختلف علوم اور سنسکرت کو سیکھا۔ چنانچہ اس نے اس وقت یہاں کی زبان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ:

> "ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے اور مشہور خط کا نام سدھ ماترک ہے جو کشمیر کی طرف منسوب ہے اور یہی بنارس میں بھی جاری ہے۔"

یہ تو ابوریحان البیرونی کی شہادت ہے جس سے معلوم ہوا کہ بنارس آکر اس نے سنسکرت کے متعلق بھی واقفیت حاصل کی۔ اب ذرا بنارس کی مذہبی عظمت کے سلسلے میں البیرونی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"ہندوؤں میں متعدد مقامات ہیں جو مذہبی حیثیت سے واجب التعظیم ہیں۔ جیسے شہر بنارس، ان کے درویش وہاں جاکر مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں، جس طرح کعبہ کے مجاورین مکہ میں۔ان کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ان کی موت بنارس میں ہو، تاکہ مرنے کے بعد ان کی عاقبت اچھی ہو، لوگ کہتے ہیں کہ خون کرنے والا ہر جگہ پکڑا جائے گا اور اپنے جرم کی سزا پائے گا۔لیکن اگر بنارس میں داخل ہوجائے گا تو وہاں اس کا گناہ معاف ہوجائے گا اور بخش دیا جائے گا۔اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ برہما کی صورت چار سر کی تھی، برہما اور شیوشنکر یعنی مہادیو کے درمیان کچھ بگاڑ پیدا ہوگیا، جس کی وجہ سے لڑائی ہوگئی جو اس قدر بڑھ گئی کہ برہما کا ایک سر اس سے اکھڑ کر جدا ہو گیا، اس وقت کا یہ دستور تھا کہ قاتل مقتول کے سر کو ہاتھ میں لے لیتا تھا اور اس کو مقتول کی رسوائی اور اپنی فتح کی علامت کے لیے پھراتا تھا، پس برہما کا سر مہادیو کے ہاتھ میں اس طرح آ گیا گویا اسے لگام دے دی گئی ہے اور وہ مہادیو جس شہر میں جاتا وہ سر اس کے ساتھ رہتا تھا یہاں تک کہ وہ بنارس پہنچا اور سر اس سے جدا ہو کر غائب ہوگیا۔" [باب ٦٦]

بنارس کے متعلق مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ [متوفیٰ ۱۷۸٦ء] اپنی کتاب 'سبحة المرجان فی آثار هند' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

بنارس بفتح الموحدة والنون	بنارس پورب کے شہروں
والالف وفتح الراء آخرها	میں سے ایک شہر اور وہ ہندوؤں
سين ساكنة بلدة عظيمة من	کی عبادت گاہ ہے اور ان کے
بلاد فورب،وهي معبد للهنود	نزدیک مقدس مقامات میں
اشرف البقاع عندهم وزيار	شامل ہے اس کی زیارت عمر
تهافي العمر واجبة مرةً	میں ایک بار ان کے یہاں
عندهم واعتقادهم ان	واجب ہے، اور ان کا یہ اعتقاد

الارض عشر حصص واحدة	ہے کہ زمین کے جملہ دس حصے
منهـا بنـارس وتسع منهـا	ہیں۔جن میں سے ایک حصہ
البـاقية وهذه الحصة الواحدة	بنارس ہے اور علیحدہ یہ حصہ
على حدة من الارض مساوية	معنوی اعتبار سے باقی نو حصوں
للحصص التسع فی الدرجة	کے برابر ہے،اور خدا نے اس کو
المعنوية وسعها اللّٰہ تعالیٰ	ایک نیزے کی نوک پر پھیلا دیا
على سنان رمح وسنا نه ذو	ہے،جس کی صلیب کی طرح
ثلث شعب لصليب وهذا	تین شاخیں ہیں اور تینوں مہا
الرمح حق مهاديو۔	دیو.جی کا حق ہیں۔

اکبر بادشاہ [متوفی ۱۶۰۵ء] کے دربار کا مشہور عالم اور مصنف ابوالفیض فیضی[۱] بھی بنارس آیا اور برہمن بچہ بن کر بنارس کے مشہور ودیالیہ [درسگاہ] میں داخل ہوگیا۔اور چوں کہ حافظہ تیز تھا،ذہن صاف،فہم مناسب اور طبیعت درست تھی، اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں انتہائی تعلیم تک پہنچ گیا۔تمام استاد اس کے عمدہ چال چلن اور اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے نہایت محبت کرتے تھے۔جب اس نے وطن جانے کے لیے اپنے شفیق استاد سے اجازت چاہی تو اس نے ایک ہفتہ کے لیے مزید ٹھہرالیا اور اپنے گھر میں مشورہ کر کے یہ ارادہ کرلیا کہ اپنی کنیا [لڑکی] سے شادی کردے۔جب فیضی سے کہا گیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ میں اس لڑکی کو ماں جائی بہن سمجھتا ہوں پھر یہ کہ میں خود مسلمان ہوں استاد یہ سن

۱۔ یہ اپنے زمانے کے یکتائے روزگار جوانمرد عالم شیخ مبارک ناگوریؒ [متوفیٰ ۱۰۰۱ھ] کا بیٹا اور مختلف علوم و فنون کا ماہر تھا،شعر،تفسیر،تاریخ، لغت، طب،خوشنویسی،انشاپردازی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ابتدا میں اپنا تخلص فیضی رکھا پھر بعد میں اسے بدل کر فیاض کردیا۔۹۷۴ھ میں اکبر بادشاہ کا درباری ہوکر 'ملک الشعراء' کا خطاب پایا۔علم تفسیر میں 'سواطع الالہام' نامی مکمل قرآن کی تفسیر لکھی جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نقطہ والا کوئی حرف استعمال نہیں کیا ہے۔اس کی قدر دانی کے طور پر اکبر بادشاہ نے اس زمانے میں مبلغ دس ہزار روپے کا انعام دیا تھا یہ کتاب آج بھی قدیم کتب خانوں میں موجود ہے۔تصانیف میں فارسی زبان میں 'رامائن' کا منظوم ترجمہ بھی ہے۔ ۱۰ر صفر ۱۰۰۴ھ کو انتقال ہوا اور اکبرآباد میں مدفون ہوا۔[تذکرہ علمائے ہند۔ص ۴] ع ب نعمانی

کربت کی طرح کھڑا رہا اور آہ سرد بھر کر کہا کہ تو نے تمام ہندو دھرم کے ساتھ جُل [دھوکا] کیا۔ مگر حق استادی کیا ہوگا؟

فیضی نے کہا کہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ میں دل وجان سے آپ کی پدرانہ اور استاذانہ شفقت وعاطفت کا ممنون ہوں اور یہ میری استطاعت سے باہر ہے کہ میں آپ کے انعام و احسان کا حق ادا کرسکوں۔ استاد نے کہا، تاہم ایک عہد لینا چاہتا ہوں، فیضی نے کہا ارشاد فرمایئے۔ استاد نے کہا کہ تو سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرے گا؟ کہا ہاں، استاد نے کہا کہ میں تم سے یہ عہد لینا چاہتا ہوں کہ 'گائیتری منتر'[1] کا ترجمہ نہ کرنا۔ فیضی نے اس کا عہد کرلیا اور اپنے اس عہد پر تاعمر قائم رہا۔ چنانچہ اس فاضل نے اس منتر کو اسی طرح لکھ کر ترجمہ نہ کرنے کی یہی وجہ تحریر کردی۔

---

[1] رگ وید کا ایک منظوم منتر جو مصیبت یا خوشی کے موقع پر سوا لاکھ مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔
[فرہنگ آصفیہ ۴/۱۲] ع ب نعمانی

سید نظام الدین بلگرامی نے بھی علم سنسکرت حاصل کرنے کے لیے بنارس کا سفر کیا اور یہاں رہ کر اس علم کی تکمیل کی۔ اسی طرح چریا کوٹ کے ایک عالم قاضی غلام مخدوم چریا کوٹیؒ [متوفی ۱۲۰۵ھ] کے متعلق 'تذکرہ علماے ہند' میں لکھا ہے کہ:

بعد تکمیل علوم متداوله تعلیم سنسکرت در دلش پدید آمد ،تاآنکه در تحصیل زبان مذکور خطے وافی برگرفت وبمقام بنارس که معدن مهره زبان مرقوم است ،میان ماهران فن امتیازے کافی یافت	علوم مروجہ کی تکمیل کے بعد ان کے دل میں سنسکرت زبان سیکھنے کا خیال پیدا ہوا، یہاں تک کہ اس زبان کے حاصل کرنے میں ایک مکمل حصہ لیا اور بنارس جو مذکورہ زبان کا مرکز تھا، اس فن سنسکرت کے ماہرین کے درمیان کافی امتیاز پایا۔

[تذکرہ علماے ہند فارسی ص ۱۵۷]

تاریخی کتابوں میں مشہور ہیئت داں ابومعشر فلکی کے بھی بنارس میں آنے کا ذکر ملتا ہے جو صاحب تصانیف اور اپنے وقت میں علم النجوم کا بھی امام تھا۔ بنارس میں دس سال قیام کر کے علم ہیئت کا مطالعہ کیا۔۲۷۲ھ مطابق ۸۸۶ء میں وفات پائی۔

بنارس کب آباد ہوا؟

بنارس یا کاشی کی قدامت میں کسی کو شبہ نہیں ہے اور تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے، یہاں تک کہ 'بیوسوت منو' حضرت نوحؑ کے وقت سے آباد ہونا بتایا جاتا ہے اور 'تاریخ فرشتہ' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی قدامت کے بارے میں ایک انگریز سیاح لکھتا ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کاشی کب آباد ہوا تو ہمالیہ پہاڑ کے وجود میں آنے کا حال معلوم ہو جائے۔ سید مظہر حسن، مصنف تاریخ بنارس لکھتے ہیں:

> "جب کہ آریوں نے پنجاب سے نکل کر گنگا اور جمنا کے کنارے آباد ہونا شروع کیا تھا، اس وقت بھی یہ شہر قائم تھا اور یہاں جنگلی قومیں آباد تھیں جن کو دسیو کہتے ہیں، دسیو کے راجا کو دیوداس نے شکست دے کر بنارس کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ راجا دیوداس کا تذکرہ اپنشدوں [کتب وید] میں آیا ہے۔" [ص ۴۳ ج ۱]

اس بیان کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ مزید برآں جب ہندوستان میں آریوں نے اول اول سات شہر آباد کیے تو ان میں یہ شہر بھی تھا جو اگرچہ مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے مشہور رہا، مگر کاشی اور بارانسی زیادہ مشہور تھا۔ عام مورخین کے اندازہ کے مطابق ۲۰۰۰ ق م سے آباد ہے۔ [اردو انسائیکلو پیڈیا۔ فیروز سنز لاہور]

بنارس خطہ اودھ کا قدیم اور قریبی علاقہ تھا۔ قنوج اور اجودھیا زمانہ قدیم ہی سے بنارس کے ہمسایہ تھے جس کا ثبوت ابوریحان البیرونی کی 'کتاب الہند' سے بھی ملتا

ہے۔ البیرونی نے پہلے تو گنگا اور جمنا کے کنارے کے شہروں کا نام لکھا ہے جہاں آریوں نے آکر اپنے قدم جمائے۔ پھر لکھتا ہے:

واذااخذت من باری مع	اور جب تم باری سے گنگا کے
گنگ علی جانبہ الشرقی	ساتھ اس کے مشرقی جانب کا
کان منہ الیٰ اجودہ خمسة	فاصلہ لوتو وہاں سے اجودھیا
و عشرین والی بنارس	تک ۲۵ [فرسخ] اور بنارس جو
المعظم عندھم عشرون ثم	ان کے نزدیک معظم ہے ۲۰ [فرسخ]
تنحرف عن سمت	ہے۔ پھر دریا جنوب سے مشرق
الجنوب الیٰ المشرق	کی طرف مڑتا ہے۔[ص۹۴]

اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ پہلے پہلے ہندوؤں نے اجودھیا کو دارالسطنت قرار دیا جس کے ماتحت قنوج اور بنارس بھی تھے۔

بنارس اور قنوج ان دونوں شہروں کے متعلق یہ رائے قائم کرنا آسان ہے کہ انہیں حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹوں نے آباد کیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ [متوفی ۱۰۵۲ھ] کی کتاب 'تاریخ خلاصۃ الاحادیث' میں مذکور ہے کہ خطۂ اودھ میں دو ٹیلوں کے درمیان حضرت شیثؑ کی قبر ہے، جو حضرت آدمؑ کے بیٹے تھے۔ اور قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ [متوفی ۸۰۰ھ] کی کتاب 'موضح البلدان' سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ [متوفی ۱۰۳۳ھ] نے بھی اس کی تائید کی ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ غرض واقعات اور روایات کچھ بھی ہوں، بنارس کے قدیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اجودھیا میں ایک قبرستان ہے، جو نبی نوحؑ کے نام سے مشہور ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں نوحؑ کے بیٹے ہند کی قبر ہے لیکن ابھی تک اس کا تاریخی کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کوئی تاریخی ثبوت تو قطعاً ناممکن ہے، لیکن

ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس کا ارشاد خداوندی کے مطابق یہی عقیدہ کہ وہ حضرت آدمؑ کی اولاد سے ہے۔

اسلامی کتابیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ حضرت آدمؑ ہندوستان میں اتارے گئے اور لنکا جو کہ ہندوستان ہی کا ایک حصہ تھا وہاں آدم کا پہاڑ بھی ہے اور پل نما سمندری چٹان ہندوستان سے اس کو ملاتی ہے، جس کو آدم کا پل کہتے ہیں۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے 'سبحة المرجان' میں اس طرح کی روایتیں نقل کی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب آدمؑ جنت سے نکلے تو حجر اسود اپنے ساتھ لائے جو آج بھی کعبہ میں لگا ہوا ہے۔

علامہ ابن کثیر دمشقیؒ (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ونزل ادم بالهند ونزل معه الحجر الاسود وقبضة من ورق الجنةفبثه بالهند فنبت شجرة الطيب فانمااصل ما يجاء به من الطيب من الهند من قبضة الورق التى هبط بها ادم وانما قبضها اسفا على الجنة حين اخرج منها وقال عمران بن عيينة عن عطاء بن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال هبط ادم بدحنا ارض الهند ۔الخ

اور آدم ہندوستان میں اترے اور ان کے ساتھ حجر اسود اور جنت کے پتوں کا ایک مٹھا آیا پھر اس کو ہندوستان میں پھیلایا اور اسے خوشبو کا درخت اگا۔ پس ہندوستان سے جو خوشبو آتی ہے، اس کی اصلیت یہ ہے کہ وہ جنت کے پتوں کا مٹھا ہے جو آدم لے کر اترے اور اس کو افسوس کے ساتھ لے کر مٹھی میں رکھا تھا جب کہ جنت سے نکالے گئے تھے، عمران بن عیینہ نے عطار بن سعید بن جبیر اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں

نے کہا کہ آدم ہندوستان کی
زمین دحنا میں اتارے گئے۔

[تفسیر ابن کثیر ج اول ص ۸۰]

یہ تو ابن کثیر کا بیان ہے، لیکن قرآن کریم کی آیات سے تو یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر انبیاء آئے، چنانچہ اولیاء اللہ نے ہندوستان کے بہت سے مقامات پر حضرات انبیاء کرام کی قبریں بطور کشف والہام اور روحانی ملاقات سے معلوم کی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ [متوفی ۱۰۳۵ھ] اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں [متوفی ۱۷۸۰ء] قدس سرہما نے اپنی کتابوں میں اس کی تفصیل لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام لے کر حضرت آدمؑ پہلے ہندوستان میں آئے اور یہیں ان کی اولاد پھیلی۔

مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ نے حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ سام، یافث، حام۔ حام کے بیٹے کا نام ہند تھا اور اس نے جس قدر زمین آباد کی ہے، اس کا نام ہند ہوا۔[1]

---

[1] صاحب بیان القرآن حضرت مولانا اشرف علی تھانوی [متوفی ۱۳۶۲ھ] آیت قرآنی وجعلنا ذریتہ ھم الباقین [صافات: ۷۷] کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس آیت کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ انہی کی [حضرت نوحؑ کی] نسل چلی، کفار تو غرق ہو گئے تھے، بقیہ اہل کشتی کی بھی نسل نہیں چلی۔ پس اب جس قدر آدمی دنیا میں ہیں سب کا نسب حضرت نوحؑ تک منتہی ہوتا ہے۔ [ج ۴ ص ۲۸۳]

صاحب معارف القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب [متوفی ۱۹۷۶ء] اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں جو طوفان آیا تھا اس میں دنیا کی اکثر آبادی ہلاک ہو گئی تھی اور اس کے بعد ساری دنیا کی نسل حضرت نوحؑ ہی کے تینوں بیٹوں سے چلی۔ ایک بیٹے کا نام سام تھا، ان کی نسل سے اہل عرب اور اہل فارس وغیرہ کی نسل چلی۔ دوسرے بیٹے حام تھے اور ان سے افریقی ممالک کی آبادیاں دنیا میں پھیلیں۔ بعض حضرات نے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اسی نسل میں شامل کیا ہے۔ اور تیسرے بیٹے یافث تھے، ان سے ترک منگول اور یاجوج ماجوج کی نسلیں نکلی ہیں۔ جو لوگ حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے بچ گئے تھے ان میں سے حضرت نوحؑ کے ان تینوں بیٹوں کے سوا اور کسی سے کوئی نسل نہیں چلی۔ [معارف القرآن ۷/۴۴۴]
ع ب نعمانی

یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے اور علماء کی ایک بڑی جماعت بھی یہی کہتی ہے کہ آج دنیا کے تمام آدمی حضرت نوحؑ کے انہیں تینوں بیٹوں کی اولاد سے ہیں اور حدیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے[1] فرشتہ نے لکھا ہے کہ ہند کے چار بیٹے تھے، پورب، بنگ، دکن، نہروال۔

راجا کشن:

پورب کا بیٹا راجا کشن ملک ہند کا پہلا راجا ہے جس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا اور بنارس اس کے زیر حکومت رہا۔ فرشتہ نے اس موقع پر اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ اس کشن سے مراد وہ کشن نہیں ہے جس کی معبودیت کے ہندو قائل ہیں اور اس کی بابت انہوں نے نادرالوجود قصے اور خلاف قیاس حکایتیں اپنی کتابوں میں نقل کر کے اسے معبودیت کے مرتبے پر پہنچا دیا ہے۔

راجا کشن بڑا عالی دماغ، بیدار مغز اور بہادر نوجوان تھا۔ عظیم الجثہ ہونے کے باعث کوئی گھوڑا راجا کشن کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جب یہ گھوڑے کی سواری سے مجبور ہوا تو اس نے اپنی حکمت عملی اور عاقلانہ تدبیر سے ہاتھی کی سواری اختیار کی کیوں کہ اس سے پہلے ہاتھی کی سواری کا رواج نہیں تھا۔ اس نے اپنے چچا کے لڑکے برہم کو اپنا وزیر بنایا تھا۔ یہ بھی بڑا عقل مند تھا، نجار [بڑھئی کا کام] آہن گری [لوہاری] اسی کی ایجاد ہے۔ اس زمانے میں لوگوں کی عمریں زیادہ ہوتی تھیں، چناں چہ اس نے ۴۰۰ سال تک حکومت کی۔

اس کے بعد راجا کشن کا لڑکا بہراج ۷۰۰ سال تک گدی نشین رہا۔ پھر اس

---

[1] اس تعلق سے ترمذی شریف کی دو حدیثیں اس طرح ہیں:
عن سمرةؓ عن النبی ﷺ فی قوله تعالیٰ وجعلنا ذريته هم الباقين قال حام سام ویافث۔ وعن سمرةؓ عن النبی ﷺ قال سام ابو العرب وسام ابو الحبش ویافث ابو الروم [ترمذی ۱۵۸/۲] ع ب نعمانی

کی اولاد میں سے کیشو راج ۲۲۰ سال تک حکومت پر قابض رہا۔ پھر اس کا بڑا لڑکا فیروز رائے ۵۳۷ سال تک حکومت کرتا رہا۔

اس زمانے میں حضرت نوحؑ کے پرپوتے رستم بن زال بن سلعم نے ملک ایران سے آ کر فیروز رائے پر چڑھائی کی۔ فیروز رائے خوف سے بھاگ گیا اور اتفاق سے اسی زمانہ میں مر بھی گیا۔ رستم نے جب فیروز کا مرنا سنا تو ملک ہند کے ایک سردار مسمیٰ سورج کو اپنی طرف سے ملک ہند کا راجا بنا دیا اور خود ایران واپس چلا گیا۔

راجا سورج:

راجا سورج کا دارالسلطنت قنوج تھا۔ بنارس کی آبادی کی بنیاد اسی نے ڈالی مگر ناتمام رہی۔ اس نے ۲۵۰ سال تک حکومت کی۔ بنارس میں سورج کنڈ[1] اسی کی یادگار ہے۔

راجا سورج کے بعد اس کا بیٹا بہراچ ۳۶ سال تک حکومت پر قابض رہا، شہر بہراچ جسے اب بہرائچ کہتے ہیں، اسی راجا نے آباد کیا تھا۔ بنارس کی آبادی جس کی داغ بیل سورج نے اپنے وقت میں ڈالی تھی اس کی تکمیل بہراچ نے اپنے وقت میں کی۔ اس کے بعد کیدار برہمن کے قبضے میں یہ سلطنت ۱۹ سال تھی، پھر راجا شکل قابض ہوا اور ۶۴ سال تک اس نے حکومت کی۔ لکھنؤ اسی نے آباد کیا۔ افراسیاب بادشاہ توران پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو گیا۔ پھر شکل نے معذرت کی تو افراسیاب نے اس کے بیٹے راجا رہٹ کو ملک ہند بخش دیا اور شکل کو ہمراہ لے گیا۔ راجا رہٹ ۳۱ سال تک حکمران رہا۔ قلعہ رہتاس اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ مہراج کچھواہہ نے ماروڑا سے آ کر ملک لے لیا اور عرصہ ۴۰ سال تک حکومت کی۔ مرتے وقت اپنے بھتیجے کیدر راج کو قبضۂ سلطنت کی وصیت کی تھی، چنانچہ کیدر راج گدی نشین ہوا اور ۴۳

---

[1] یہ کنڈ پرانا پاندر یا واقع نئی سڑک اورنگ آباد جانے والے راستہ پر ہے۔ ع ب نعمانی

سال تک حکمراں رہا۔اس کے مرنے کے بعد سپہ سالار رجے چند تخت نشین ہوگیا۔اور ۶۰ سال اس نے حکومت کی۔پھر راجا دہلو ۴۰ سال تک حکمراں رہا۔دہلی اسی نے آباد کیا۔راجا فور نے اس کو شکست دی،جس کے تعلقات کمایوں کے راجا سے تھے۔راجا فور نے ۷۳ سال حکومت کی۔اسکندر رومی لشکریوں کے ہمراہ جب ہندوستان آیا تھا تو راجا فور کی حکومت اس کے قبضے سے نکل گئی اور لشکریوں کے ہاتھوں اس کا قتل ہوا۔اس کے بعد راجا سینسار چند سلطنت پر قابض ہوگیا اور ۹ رسال تک تخت نشین رہا،اس کی وفات کے بعد کلیان چند کچھ دنوں کے لیے تخت نشین ہوگیا۔

چندر گپت:

اس زمانے میں آریوں کی حکومت زوال پر تھی۔۳۲۱ ق م میں مہاراجا آنند کا پوتا مہاراجا چندر گپت اس کی سلطنت پر قابض ہوگیا۔ملک مگدھ جسے اب پٹنہ کہتے ہیں، اس کا دارالسلطنت تھا۔چندر گپت نے ۲۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۲۹۷ ق م میں وفات پائی۔مہاراجا چندر گپت کے دور میں جین اور بدھ مت کو ترقی ہوئی،چندر گپت نے یونانی سیلوکس[1] کو ہٹا کر افغانستان تک قبضہ جما لیا۔چندر گپت کے برہمن وزیر چانکیہ نے اصول حکمرانی پر ایک کتاب 'ارتھ شاستر' لکھی،جس کا قلمی نسخہ میسور کے کتب خانے سے برآمد ہوا ہے۔چندر گپت کے زمانے کی ایک لاٹ ضلع غازیپور کے مشہور علاقہ سید پور بھتری میں موجود ہے۔اکثر یوروپین سیاح اس کو دیکھنے جاتے ہیں۔اس پر اس زمانہ کے مروجہ حروف بھی کندہ ہیں جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی،کیوں کہ اس طرح کی لاٹیں ہندوستان کے مختلف

---

[1] یونانیوں نے ۳۵۰ ق م میں یونانی جرنیل سیلوکس کی سرکردگی میں ہندوستان پر دوبارہ یورش کی تو چندر گپت کو یونانیوں سے شدید مقابلہ کرنا پڑا تھا،سیلوکس سکندر اعظم [متوفی ۳۲۳ ق م] کا سپہ سالار تھا،اس جنگ میں جب وہ شکست خوردہ ہوا تو چندر گپت سے صلح بھی کر لی[ہندوستان پر اسلامی حکومت،ص ۴۹] ع ب نعمانی

مقامات پر پائی جاتی ہیں۔ واضح ہو کہ چندر گپت نے آخر زمانۂ حیات میں بدھ مت قبول کر لیا تھا۔

اشوک اعظم:

چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا بندوسار حکمراں ہوا جس کا دورِ حکمرانی ۳۲۲ ق م تا ۲۹۸ ق م ہے۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا بندوسار اس کا جانشین ہوا جس نے ۲۷۳ ق م تک حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا مہاراجا اشوک ۲۲۳ ق م میں تخت نشین ہوا۔ اشوک کے دور حکومت میں جتنی بڑی سلطنت ہوئی ہندوستان کے پورے زمانۂ تاریخ میں اس سے بڑی سلطنت نہیں ہوئی۔ اس کی فتح کی یادگاروں کے کتبے دستیاب ہو چکے ہیں۔ وہ آخر میں بدھ مت کا پیرو ہو گیا تھا اور اس مشن کی تبلیغ کے لیے تبت، فارس، چین، یونان، مصر میں مبلغ بھیجے[1]

اشوک کے لاٹ ایک مخصوص شہرت کے حامل ہیں۔ اس کے کتبات چٹانوں اور غاروں پر جو ضلع گیا کے اسٹیشن بیلا میں واقع ہیں ۳۴ کی تعداد میں برآمد ہوئے ہیں۔ یہ کتبے جس علاقے میں ہیں وہ وہیں کی بولی اور پراکرت میں ہیں جو وہاں رائج تھیں۔ اشوک کا دارالخلافہ مگدھ میں تھا جسے اب پٹنہ کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بدھوں کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

[اشوک اعظم: ڈاکٹر محمد حفیظ ایم۔اے، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ص ۱۳۰]

اشوک بدھ مذہب کا پیرو اور روحانی مبلغ بھی تھا۔ پاٹلی پتر میں اس نے کئی فرامین لگوائے جن میں دیوتاؤں کے پیارے بادشاہ 'پریہ درسن' کا یہ ارشاد ہے:

پاٹلی پتر

"سنگھ میں کوئی ذات بھی رخنہ نہ ڈالے، راہب اور راہبات میں سے

---

[1] مہاراجا اشوک ۴۰ سال حکومت کر کے ۲۳۳ ق م میں فوت ہو گیا۔ [ایضاً ص ۵۴] ع ب نعمانی

کوئی بھی اگر سنگھ سے منحرف ہو جائے گا تو اسے سفید کپڑے پہنائے جائیں گے اور اسے خانقاہ کی جگہ کہیں اور رہنا پڑے گا۔ یہ حکم بھکشوؤں اور بھکشنوں کے سنگھ میں سنا دینا چاہئے۔"

دیوتاؤں کے پیارے کا ارشاد ہے:

"اس حکم کی نقل جلسۂ عام کی جگہ پر لٹکائی گئی ہے تا کہ تم اسے آسانی سے دیکھ سکو۔ اس کی ایک نقل ایسی جگہ رکھو کہ عام عقیدت کیش ہر روزے کے دن آ کر پڑھ سکیں اور ہر روزے کے دن جب کہ ہر مہاجر اپنے مرکز پر واپس آتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس حکم کو پڑھے اور سمجھے اور تم بھی اپنی حدود حکومت تک دورہ کر کے زبانی یہ حکم سناؤ اور اس طرح تمام قلعہ بند قصبات اور تحصیلات میں لوگوں کو دورے پر بھیج دو تا کہ وہ سب کو یہ حکم سنا دیں۔"

یہی کتبہ سارناتھ سے بھی برآمد ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کے وقت میں بدھ مت کی تبلیغ کا یہ بھی ایک اہم مرکز تھا۔ سارناتھ میں اشوک کی آٹھویں لاٹ ہے اور یہاں وہ باغ غزالاں بھی ہے جہاں بدھ نے اپنے پانچ چیلوں کو سب سے پہلے وعظ کیا تھا اور انہیں نجات حاصل کرنے کا طریقہ تلقین کیا۔ اس مقام کو بدھ ادبیات کے اندر 'مرگ داؤ' (मृगदाव) یا 'سارنگ ناتھ' اور انگریز مورخین نے 'ڈیر پارک' (Deer Park) کے نام سے ذکر کیا ہے۔ یہاں بدھ عمارتوں کے کافی آثار موجود ہیں، آج کل اس مقام نے ایک بدھ نو آبادی کی شکل اختیار کر لی ہے۔

گوتم بدھ:

بدھ کی تعلیمات کا ابتدائی مرکز پٹنہ میں قائم ہوا اور تعلیمی خانقاہیں بکثرت قائم ہوئیں، اس بناء پر اس علاقے کو ویہار کہنے لگے جو ہندی لفظ ہے اور اس کے معنی خانقاہ کے ہیں۔ بدھ کا اصلی نام شاکیہ منی[1] تھا۔ ابوالفضل[2] نے بدھ کے ذکر میں اس کا اور اس کے باپ کا نام درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"پدراوبدھاراجہ سوہودن مرزمان بہاری"

جس کا مطلب یہ ہوا کہ راجا یعنی بدھ کے والد سوہودن کی راج دھانی بہار میں تھی۔

صوبۂ بہار جس کا دارالسلطنت مگدھ [پٹنہ] تھا، اس میں جون پور تک کے اضلاع شامل تھے۔ بدھ کی پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کپل وستو میں پیدا ہوا تھا جو دامن ہمالیہ میں ایک شہر تھا اور اس کے باپ کا یہی پایۂ تخت بھی تھا۔

قرآن مجید میں ذوالکفل کا نام مذکور ہوا ہے جس کے بارے میں عام مفسرین نے اپنی اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ حالاں کہ صاحب روح المعانی علامہ سید محمود آلوسیؒ [متوفی ۱۲۷۰ھ] نے اپنی مشہور کتاب 'روح المعانی' میں اس سلسلے میں یوں فرمایا کہ:

وفی تسمیة ذی الکفل اقوال مضطربة لا تصح

ذوالکفل نام پڑنے میں مختلف اقوال ہیں اور ان میں کوئی صحیح نہیں۔

[ج:۱۷، ص:۶۷]

جبکہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد یہی 'کپل وستو' ہے۔ عربی زبان میں 'ذو' کے معنیٰ 'والا' کے ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تحقیق کے مطابق کفل کو کپل کا معرب مان کر اگر یہ کہا جائے کہ ذوالکفل کے معنیٰ کپل والا، تو درایۃً اسے رد کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر چونکہ معاملہ قرآن فہمی کا ہے، اس لیے خاکسار اس سلسلے میں اپنی رائے کچھ نہیں پیش کرتا۔ لیکن حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ [متوفی ۱۹۵۶ء] اپنی کتاب

۱: ایک قدیم روایت کے مطابق بدھ کا پہلا نام سدھارتھ تھا۔ ان کی پیدائش ایک روایت کے مطابق ۶۲۳ قبل مسیح اور دوسری روایت کے مطابق ۵۶۷ قبل مسیح میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شدھودن شاکیہ تھا جو قبیلے کے ایک طاقتور راجا تھے اور نیپال کے جنوبی ترائی علاقہ میں ان کی حکمرانی تھی۔ [اردو انسائیکلوپیڈیا، ج:۱، ص:۵۳۸]

۲: یہ شیخ مبارک ناگوری [متوفی ۱۰۰۱ھ] کے دوسرے فرزند تھے، ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں دربار اکبری میں ملازمت اختیار کر لی۔ حسن لیاقت کی بنا پر بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے عہدہ وزارت تک پہنچ گئے۔ ان کی یہ ترقی آپ کے حاسدین کو راس نہ آئی چنانچہ ۱۰۱۱ھ میں قتل کر دیے گئے۔ [تذکرہ علماء ہند] ع ب نعمانی

'النبی الخاتم' میں لکھتے ہیں:

"مذہبی دنیا کا اتنا عظیم الشان انقلابی وجود، جیسا کہ بدھ تھا، قرآن میں اگر اس کا ذکر ہو تو کیا تعجب ہے؟ خصوصاً اسلام سے جو اس کا تعلق ہے وہ ظاہر ہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔" [ص ۳۴]

مولانا گیلانیؒ نے یہ صرف اپنا قیاس ظاہر فرمایا ہے، ورنہ مستند کتب تفاسیر سے اس قیاس کی تائید میں کوئی چیز نہ ملی۔ واللہ اعلم

تاریخ آثار بنارس

سارناتھ کی تاریخی حیثیت بدھ کے زمانے میں

سارناتھ موجودہ شہر بنارس کا ایک آخری مشرقی حصہ ہے۔ یہاں ایک عرصہ سے حکومت کے حکم سے زمین کھود کھود کر تاریخی عمارتوں کے آثار نمایاں کیے جا رہے ہیں۔ زمین کے اندر سے جو فرامین اور کتبات برآمد ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ کی تعلیمات کی اشاعت کے لیے ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے علاوہ ہندوستان کے باہر تک نمائندے گئے تھے۔

'بہار' و یہار ہی کا تلفظ ہے، جس میں بنارس اور سارناتھ کا پورا علاقہ شامل تھا۔ یہاں بدھ مذہب کی تعلیمی خانقاہیں تھیں جن کو ویہار[1] کہتے تھے۔ اور عجب بات یہ ہے کہ بخارا جو مشرقی ممالک کا اسلامی اور علمی مرکز تھا وہ بھی اسی 'ویہار' ہی کا تلفظ ہے۔ اس کی تصدیق ان سرحدی پٹھانوں کے تلفظ سے ہوتی ہے جو 'ح' کو ہمیشہ 'خ' کی آواز میں بولتے ہیں۔ بلخ کا مشہور شہر 'نوبہار' بھی بدھ مذہب ہی کی ایک خانقاہ کا نام تھا۔

شاکیہ منی کا مقبرہ:

بدھ مذہب کا پیشوا شاکیہ منی جب مرا تو اس کی یادگار میں ایک عالیشان مقبرہ گنبد کی شکل میں تعمیر ہوا جو سارناتھ میں 'دھمکوا' کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ اس گنبد

---

[1] بہار میں قدیم ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز 'نالندہ' تھا، اب گورنمنٹ نے راجگیر نامی علاقے کے پاس ان کھنڈرات کو نمایاں کیا ہے، یہ بدھ کا بہت بڑا مدرسہ تھا، اس کے ساتھ اور بھی ذیلی مدارس تھے جن کی بنا پر 'بہار' نام ہوا۔

کی موجودہ اونچائی ۹۰ فٹ اور چوڑائی ۳۰۰ فٹ ہے۔

اس کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے سال ولادت سے ۳۴۲ سال قبل جب شاکیہ منی نے رحلت کی تو بدھ راجاؤں کی خواہش ہوئی کہ شاکیہ منی کو اپنے راج کی سرزمین میں لے جا کر عبادت گاہ بنادی جائے۔ اس خواہش پر نہ صرف اختلاف رائے ہوا، بلکہ ان راجاؤں میں خوب لڑائی اور کشت وخون ہوا۔ آخر کار یہ طے پایا کہ شاکیہ منی کی لاش کو جلا کر ہڈی اور راکھ کو ایک ڈبہ میں بند کر کے اسی شکل کا ایک گنبد بنا دیا جائے۔ ہندوستان کے جن دوسرے شہروں میں اس طرح کا گنبد ہے اس کو اسی واقعہ کی یادگار سمجھنا چاہیے۔

آج سے تقریباً ۱۰۰ سال پہلے مسٹر جیمس، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج بنارس[1] نے اس گنبد کو کھودوایا تھا تو ایک ڈبہ جس میں ہڈی اور راکھ تھی، دستیاب ہوا اور سونے چاندی کے کچھ پتر اور کچھ سکے بھی دستیاب ہوے جس میں اس زمانہ کے مروجہ حروف کندہ تھے جو پڑھے نہیں جاسکے۔ یہ چیزیں مذکورہ کالج میں آج بھی رکھی ہوئی ہیں جس کا نام اس وقت 'سنسکرت مہاودیالیہ' ہے۔

اس کے علاوہ سارناتھ میں زمین کے اندر سے کچھ سکے، تاریخی نوادر اور اس زمانہ کے برتن، مورتیاں اور کتبات بھی برآمد ہوے ہیں جو وہاں کے میوزیم [عجائب گھر] میں موجود ہیں اور ہر وقت دیکھے جاسکتے ہیں۔

---

[1] اس کالج کا قیام ۱۷۹۱ء میں جوناتھن ڈنکن گورنر ممبئی [متوفی ۱۸۱۱ء] کی تجویز پر ہوا۔ ابتداء میں اس کا نام 'بنارس پاٹھ شالا' پھر 'ہندو کالج ہوا جسے ۱۸۴۴ء میں 'کاشک راجکیہ سنسکرت کالج' کر دیا گیا۔ اب تک اس کی حیثیت کالج کی تھی، ۱۸۵۷ء میں پوسٹ گریجویٹ کالج ہوا، پھر ۱۹۵۸/۳/۲۲ء میں ڈاکٹر سمپورنانند سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش [متوفی ۱۹۶۹ء] کی کوششوں سے اس کی حیثیت یونیورسٹی کی ہوگئی اور ۱۹۷۴ء سے اس کا نام انہیں کی طرف منسوب کر کے 'سمپورنانند سنسکرت وشوودیالیہ' پڑ گیا۔ ع ب نعمانی

اشوک کاستون:

سارناتھ کے تاریخی نوادر میں سب سے اہم اشوک کاستون ہے جس میں چاروں طرف چار شیر منقش ہیں۔ یہ بھی اشوک ہی کے دور حکومت کی یادگار ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ یونانی کاریگروں کا بنایا ہوا ہے۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ اشوک کے دور حکومت میں یونانی بادشاہوں سے کافی ربط ضبط تھا۔ اب انڈین یونین نے اشوک کے اس چکر کو قومی نشان بنا دیا ہے۔ ہندوستان کے تمام سکوں، نوٹوں، ڈاک ٹکٹوں اور سرکاری عمارتوں میں اسی ستون کی تصویر ہے جو اشوک کے عدل وانصاف، نیکی وہمہ دوستی کا آئینہ دار ہے۔ یہ ستون سارناتھ کے عجائب گھر میں نصب ہے۔ اشوک کے اس ستون اور چٹانوں کے کتبات کو چھوڑ کر وہ مینار یالاٹیں جن پر کتبے کندہ کیے گئے ہیں، ہندوستان کی قدیم سنگ تراشی کا بہترین نمونہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کے عہد میں پتھر سے عمارتی کام لینے کا خوب رواج ہو گیا تھا۔

گنبد ہمایوں:

سارناتھ کے قدیم آثار میں گنبد ہمایوں ایک قابل دید چیز ہے جس کو 'سیتا کی رسوئی' کہا جاتا ہے۔ یہ گنبد ایک پہاڑی نما ٹیلے پر اتنی بلندی پر واقع ہے کہ بنارس میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عمارت بھی اشوک ہی کے عہد سے تعلق رکھتی ہے، حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلامی دور حکومت میں ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۸ء کی تعمیر اور ہمایوں کی یادگار ہے جسے ہمایوں کے بیٹے اکبر نے ہمایوں کی یاد میں بنوایا تھا۔

راجا جے شنکر بنارس نے ایک کہانی لکھی ہے جس میں اس گنبد کی تعمیر کا پس منظر کچھ اس طرح لکھا ہے:
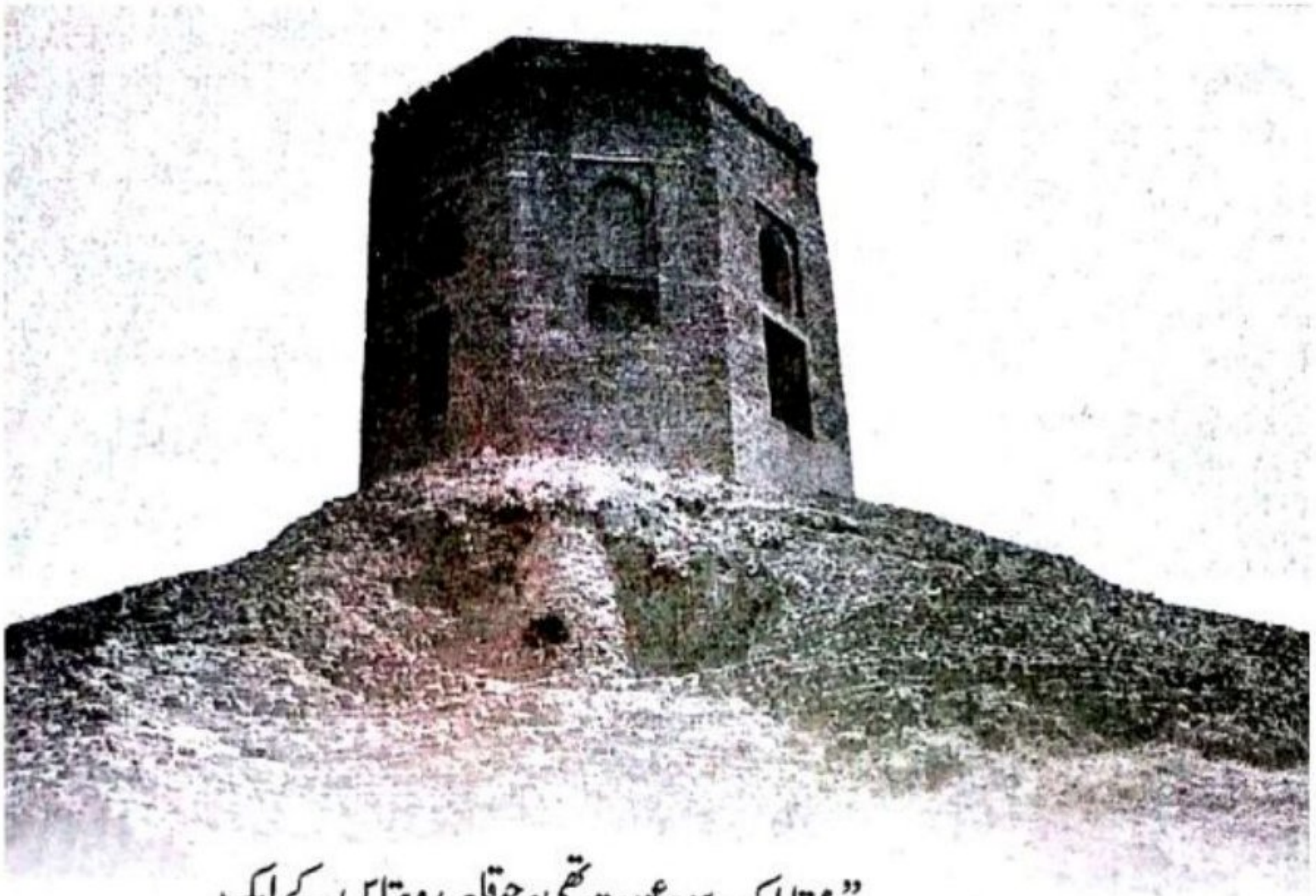
"ممتا ایک بیوہ عورت تھی، جو قلعہ روہتاس کے ایک گوشے میں اپنے شوہر کے انتقال سے غمگین بیٹھی تھی، ممتا کا باپ چوڑامنی اپنی بیٹی کو ہر طرح خوش کر سکتا تھا، لیکن اس کا یہ دکھ کیسے مٹاتا؟ چوڑامڑی چوں کہ شیر شاہ کا وزیر تھا، اس لیے امور سلطنت انجام دینے کی بناء پر اس کا ممتا کے پاس ہر وقت رہنا ممکن نہ تھا، اس لیے کبھی کبھی قلعہ میں ملنے آجاتا تھا۔

ایک دن وہ دس خادموں کے ساتھ جن کے ہاتھوں میں سونے سے بھری ہوئی تھالیاں تھیں، قلعہ روہتاس میں آیا۔ ممتا نے پوچھا کہ یہ سونا کہاں سے آیا؟ اس کے باپ نے جو جواب دیا اس سے ممتا نے یہ سمجھا کہ شیر شاہ کی طرف سے یہ رشوت کے طور پر ملا ہے اس لیے اس نے اس کو واپس کرنے کے سفارش کی۔ باپ نے جواب دیا بیٹی: شیر شاہ کا یہاں کسی وقت بھی قبضہ ہو سکتا ہے اور اس وقت جب میں وزیر بھی نہ رہوں گا، یہ سونا تمہاری زندگی کا سہارا بنے گا۔ والد کی بات سن کر ممتا نے کہا خدا کی مرضی کے بغیر یہ کام کرنا مناسب نہیں اور وہ برہما کی دہائی کے ذریعہ سونے کو لوٹانے کی فرمائش کرنے لگی۔ مگر چوڑامنی نہ مانا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن قلعہ روہتاس میں ایک

پالکی پہنچی جس کے اندر شیر شاہ کے فوجی روپوش تھے، وزیر نے پالکی کی تلاشی لینا چاہی، اس بات پر ایک خطرناک لڑائی ہوگئی۔ چوڑامنی مارا گیا اور قلعہ پر پٹھانوں کا قبضہ ہوگیا، مگر ممتا کسی طرح وہاں سے بچ کر نکل آئی، اور سارناتھ میں اسی مقام پر جہاں گنبد ہے، ایک جھونپڑی بنا کر عبادت میں مصروف رہنے لگی۔

ایک دن اچانک اس کی جھونپڑی میں ایک تھکا ماندہ مسافر داخل ہوا اور اس نے پناہ چاہی، پہلے تو ممتا نے یہاں قیام کرنے سے منع کیا۔ مگر جب اس کو چوسا کی لڑائی میں ہمایوں کے ناکام ہونے کی اطلاع ملی تو جھونپڑی میں پناہ دے دی اور خود کھنڈرات کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں چلی گئی۔ وہ شخص ہمایوں تھا، سویرا ہوتے ہی مغل سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے، وہاں ہمایوں کو پایا۔ ہمایوں نے ممتا کو تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ کہیں جا کر چھپ گئی۔ لوٹتے وقت ہمایوں نے اپنے کارندوں سے کہا کہ اس کا گھر بنوا دینا، میں اسے کچھ بھی نہ دے پایا۔

چوسا لڑائی کو کافی وقت گزر چکا تھا اور ممتا کافی بوڑھی ہو چکی تھی، وہ کافی بیمار تھی اور گاؤں کی عورتیں اس کے پاس تھیں کہ اچانک ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر کسی جگہ کی تلاش کر رہا تھا اور اپنے نقشہ کے مطابق جگہ کو ملانے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس چھپر کے نیچے ہمایوں نے آرام کیا تھا۔ ممتا کو اب معلوم ہوا کہ وہ درماندہ مسافر ہمایوں تھا، جس کو اس نے اپنی جھونپڑی میں پناہ دی تھی۔

ممتا کا ایک دن انتقال ہوگیا، اور اس کی جھونپڑی کی جگہ پر اکبر نے اپنے باپ ہمایوں کی یاد میں ایک ہشت گوشہ عمارت بنوائی اور اس پر کتبہ لگوایا، جس میں اس کے ایک خادم گوبردھن کا بھی نام ہے۔''

اس گنبد نما گول عمارت کے دروازے پر پانچ اشعار پر مشتمل کتبہ یہ ہے:

چوں اینجا شاہ جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ ہفت کشور
بروزے آمد و بر تخت بنشست وزاں شد مطلع خورشید انور
گوبردھن بندہ را آمد بخاطر غلام خانہ زاد شاہ اکبر
کہ سازد جائیگی بہر تبرک معلا گنبدے چوں چرخ اخضر
نود شش سال و نہ صد بود تاریخ کہ آمد ایں بنائے خوب منظر
۹۹۶ھ

ترجمہ

۱۔جب اس مقام پر ہفت کشور یعنی سات مملکتوں کے بادشاہ جن کا ٹھکانا جنت ہے۔

۲۔ایک دن تشریف لائے اور تخت پر جلوہ افروز ہوے جن کے سبب یہ جگہ روشن سورج کے طلوع ہونے کی جگہ بن گئی۔

۳۔گوبردھن جو اکبر بادشاہ کے گھر کا خانہ زاد غلام ہے، اس کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی۔

۴۔کہ اس جگہ کو متبرک قرار دیتے ہوئے ایک عالیشان گنبد جو نیلے آسمان کی ہمسری کرر ہا ہو، بنائے۔

۵۔۹۹۶سال تعمیر تھا کہ یہ دیکھنے میں بھلی معلوم ہونے والی عمارت تعمیر ہوئی۔

یہ گنبد قومی ایکتا کا ایک روشن نشان اور مسلم بادشاہوں کی فیاضی اور رعایا پروری کا ایک شاہکار ہے کہ ایک بیوہ عورت کے لیے صرف اس خدمت کے صلے میں کہ اس کی جھونپڑی میں ہمایوں نے پناہ لی تھی، جھونپڑی کو اس بلند و بالا عمارت میں تبدیل کر دیا۔ع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!

نوٹ: واضح ہو کہ ممتا کی مذکورہ بالا کہانی اب تک تاریخ کی کسی مستند کتاب میں نہ مل سکی۔

اشوک کے عہد حکومت کا زوال

اشوک کے سن وفات کا صحیح پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس کے وارثوں کا حال معلوم ہے، لیکن قیاس کا تقاضہ ہے کہ یہ نامور بادشاہ ۲۳۲ سال قبل مسیح میں فوت ہوا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد ہی 'موریہ خاندان' میں [جس میں اشوک تھا] زوال آ گیا اور تقریباً بیس سال تک 'سنکا' اور 'کانو' خاندان کے راجاؤں نے حکومت کی۔

اشوک ایک مذہب پرست، نیک دل اور بدھ مذہب کا شیدائی بادشاہ تھا اور جس زمانہ میں اشوک دنیا کو اہنسا، امن اور بے آزاری کا وعظ سنا رہا تھا، اس کے مغربی ہمسایہ ممالک میں خونریزی ہو رہی تھی اور یونانی سلاطین اپنی نئی نئی سلطنتیں بنا رہے تھے۔ سلوکس یونانی کا پوتا ان تیوکوس تھا جو شام وعراق و باختر میں اپنے دادا کا وارث ہوا۔ باختر ان دنوں بدخشاں اور شمالی مشرقی افغانستان پر مشتمل تھا۔ دوسری طرف پارتھیر خراسان کی ایک جنگ ہوئی جو اشکان کی قیادت میں یونانی تسلط سے آزاد ہوا اور اس نے دولت اشکانیہ کی بنیاد ڈالی۔

باختر کے یونانیوں نے کابل وقندھار پر اور پھر مختلف مغربی صوبوں پر قدم جمایا جس کے بعد ان کے نربدا پہنچنے کا سراغ مل سکا۔ ان علاقوں سے جو سکے برآمد ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عیسوی سن سے پہلی اور دوسری صدی قبل کئی نیم یونانی ریاستیں بنیں جو خودمختاری کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ بدھ اور ہندومت کی قدیم کتابوں میں ان حملہ آوروں کا 'یونان' یا 'یونا' کے نام سے تذکرہ آیا ہے۔ گو ان کی تاریخی تحریر محفوظ نہیں رہی تاہم فنون سنگ تراشی وعمارت اور دوسری صنعتوں کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔

ان ہی نیم یونانی بادشاہوں کے زمانے میں ایران کے اشکانی بادشاہوں نے قندھار، بلوچستان بلکہ موجودہ سرحد پر قبضہ کرلیا اوران کا ایک صوبہ دار ٹکسلا میں مقرر رہا۔

لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں وسط ایشیا سے 'یوچی' اور 'سکا' قوموں کا ٹڈی دل آیا اور ترکستان سے یونانیوں کو یوچیوں نے نابود کردیا جب کہ مشرقی ایران ومکران پر سکا قوم قابض ہوگئی۔ سجستان اور آخری سیستان اسی عہد کی یادگار ہے۔ یہی قوم سندھ کے راستے سے گجرات اور مالوہ تک بڑھ گئی اور صدیوں تک یہ صوبے اس کے زیر حکومت رہے اور تقریباً ۵۰ قبل مسیح میں ایک زبردست سلطنت قائم کی جس کا پایۂ تخت ہرش پور [پشاور] تھا اور ترکستان، افغانستان، مغربی ہندوستان کے علاوہ شمالی ہند کے صوبے شہر بنارس تک اس کے زیر نگیں ہوگئے تھے۔

کنشک:

ان میں مہاراج کنشک कनिष्क اور اس کا لڑکا ہوشک हुविष्क دونوں بڑے طاقتور بادشاہ گزرے ہیں۔ دوسری صدی عیسوی میں زیادہ شہرت کنشک ہی کو ہوئی۔ یہ کابل کا حکمراں، علم وفن کا مربی اور بدھ مذہب کا سرپرست تھا۔ کنشک چالیس برس حکومت کرکے ۱۴۰ء میں فوت ہوگیا اور ہُوِشک گدی نشین ہوا۔ مگر بیٹے کے بعد اس خاندان کی قوت میں زوال آگیا۔ سلطنت کئی آزاد سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی اور چوتھی صدی عیسوی تک یہی کیفیت رہی[1]

چندر گپت ثانی:

لیکن چوتھی صدی عیسوی میں مگدھ کی سلطنت نے دوبارہ عروج حاصل کرلیا

---

[1]: بعض محققین کے نزدیک کنشک کی موت خود اس کے سپہ سالاروں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ کنشک کی مسلسل جنگوں سے اکتا کر سپہ سالاروں نے اسے سوتے وقت گلا گھونٹ کر قتل کردیا۔ [اردو انسائیکلو پیڈیا ج:۱ص:۵۴۲] ع ب نعمانی

اور خاندان موریہ کے بانی کی طرح نئے شاہی خاندان کا بانی بھی چندر گپت تھا[1] یہ خاندان پہلے سے موجود تھا، مگر حکومت بالکل محدود تھی۔ سلطنت کا مرتبہ چندر گپت کے عہد میں نصیب ہوا جس نے پٹنہ سے لے کر الہ آباد تک اپنا علاقہ بڑھایا اور بنارس بھی اس میں شامل ہو گیا۔

چندر گپت ثانی نے اپنے نام کا سمبت سنہ جاری کیا، جو فروری ۳۲۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سنہ کئی صدیوں تک شمالی ہندوستان میں جاری رہا۔

چندر گپت سے زیادہ اس کے بیٹے سمندر گپت نے شہرت پائی جس کا نام اور اس کے کچھ حالات ایک لاٹ پر کندہ ملے ہیں۔

بکرما جیت:

علم و ادب کی قدر دانی میں سمندر گپت کا بیٹا بکرما جیت اپنے باپ سے بھی بڑھ گیا اور اس کے دور میں سنسکرت ادب کو کمال نصیب ہوا۔ پراموسی کا مجموعہ مرتب ہوا۔ علم ہیئت[2] اور علم ہندسہ[3] پر آریہ بھٹ[4] نے اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کیں اور ہندوستان

---

[1] چندر گپت دوم سمند گپت کا بیٹا تھا جس نے تخت سلطنت پر قابض ہونے بعد اپنا لقب بکرما جیت اختیار کر لیا۔ اس نے تقریباً ۳۸ سال حکومت کی اور ۴۱۳ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کمار گپت تخت نشین ہوا اور نہایت پر امن طریقہ سے ۴۵۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا اسکند گپت ہوا جو نہایت نااہل ثابت ہوا اور نظام حکومت سنبھال نہ سکا اور ۴۶۷ عیسوی میں قتل کر دیا گیا۔ بالآخر اسی کے دور میں گپت حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ [ہندوستان میں اسلامی حکومت۔ ص ۵۹] ع ب نعمانی

[2]: علم ہیئت وہ علم ہے، جس کے ذریعہ اجرام فلکی اور کرہ زمین کی گردش، کشش اور ان کے باہمی بعد و مسافت کے احوال و کیفیات معلوم ہوں۔ [قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون۔ ص ۱۵۱، از مولانا محمد حنیف گنگوہی]

[3]: علم ہندسہ وہ علم ہے، جس سے مقادیر و لواحقات مقادیر کے احوال و اوضاع و باہمی نسبتیں اور اشکال کی خاصیتیں معلوم ہوں۔ [ایضاً ص ۱۵۵] ع ب نعمانی

[4]: بعض محققین کے نزدیک پٹنہ کے ایک علاقہ کسم پور میں اور زیادہ تر لوگوں کے نزدیک کیرل میں کنام کولم نامی علاقہ میں یہ ۴۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ علم ہیئت اور ہندسہ میں انہیں زبردست مہارت تھی۔ ۵۵۰ء میں انتقال ہوا۔

ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

کے زندۂ جاوید شاعر کالی داس نے قریب قریب اسی زمانے میں اپنی لاجواب تمثیلات پیش کیں۔

کالی داس:

بعض روایات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کالی داس بکر ماجیت کے نورتن کا ایک ہیرا تھا[1]

ایک اور سَن راجا بکر ماجیت کے نام سے ایجاد ہوا جو بکرمی سَن[2] سے مشہور ہوا۔ یہ سنہ عیسوی سے ۵۷ سال پہلے سے ہے۔ بکر ماجیت نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوستان کی ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس دور میں بدھ مت کو زوال ہوا اور برہمنی مت کو نیا عروج حاصل ہوا، قدیم سنسکرت زندہ ہوئی، تہذیب وتمدن کو ارتقا نصیب ہوا، سنگ تراشی ونقاشی میں کمال پیدا ہوا۔ اجین اور قلعہ دھار کی تعمیر اسی کے عہد میں ہوئی۔

راجا بکر ماجیت کی مدت حکومت کے بارے میں بہت سی روایتیں ہیں، مگر فرشتہ مؤرخ کے نزدیک ایک بھی صحیح نہیں۔ آردشیر مابکاں اس راجا کا ہمعصر تھا اور بعض

---

[1] کالی داس کا زمانہ کب تھا، اس میں محققین کے الگ الگ اقوال ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے قبل کا بتلایا ہے اور بعض نے بعد کا۔ بہر حال ان کے بھگوان شیو کے بڑے عقیدت منداور سنسکرت زبان کے سب سے بڑے شاعر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی جاے پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے اجین بتلایا ہے جب کہ راجح یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ریاست اتراکھنڈ کے رودر پریاگ ضلع کے کولٹھا گاؤں میں پیدا ہوے جہاں حکومت نے ان کا ایک مجسمہ بھی نصب کرایا ہے اور وہیں اُن سے موسوم ایک جلسہ گاہ کی تعمیر بھی کرائی گئی ہے جہاں ہر سال ماہ جون میں تین دنوں تک سمینار کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس سیمینار میں ملک کے بہت سے اہل علم وفن حصہ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کالی داس کو سری لنکا میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[2] سن بکرمی کو سموت، سمت اور سمبت بھی کہتے ہیں۔ اور سمبت بھی دو ہیں۔ ایک تو وہی جو بکر ماجیت کی طرف منسوب ہو کر بکرمی کہلاتا ہے، دوسرے کا نام 'ساکا' یا 'شک' ہے جو راجا شالباہن نے اس وقت جاری کیا تھا جب اس نے بکر ماجیت پر غالب آ کر اسے شکست دی تھی۔ چوں کہ 'ساکا' ہندی زبان میں لڑائی کو کہتے ہیں اس وجہ سے یہ نام رکھا گیا۔ دونوں سالوں کا آغاز چیت ماہ سے شروع ہوتا ہے اور پھاگن پر ختم ہوتا ہے۔ 'ساکا' سن عیسوی سے ۷۷ سال بعد قائم ہوا جب کہ بکر ماجیت والا سن، سن عیسوی سے ۵۷ سال قبل کا ہے۔ ع ب نعمانی [فرہنگ آصفیہ ۳/۹۵]

مورخین شاپور کا ہمعصر بتاتے ہیں۔[تاریخ فرشتہ ص ۱۹]

راجا بکرماجیت کے عہد میں شالباہن زمیندار دکن نے حملہ کیا اور نربدا[1] کے کنارے لڑائی ہوئی، آخر بکرماجیت شکست کھا کر مارا گیا۔

افسوس ہے کہ چندر گپت ثانی کے خاندان کے ان راجاؤں کے واقعات زندگی اور سنین بلکہ ناموں تک کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا، لیکن مجموعی طور پر یہی تیسری چوتھی صدی کا زمانہ ہندوؤں کا زریں عہد کہا جاتا ہے جس میں فنون لطیفہ اور صنعتوں نے بڑی ترقی پائی۔ نقاشی میں اجین کے مندروں اور ایلورا کے غاروں کی تصاویر اس عہد کی یادگار ہیں۔

چینی سیاح فاہیان:

چندر گپت کا یہ زریں عہد بھی تاریخ کی نظر میں تاریک ہے۔ پھر بھی ایک چینی سیاح فاہیان کی شہادت تاریخی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ فاہیان کا سفر نامہ ہے۔ جو بدھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت اور کتابوں کی تلاش میں دیوار چین کے پار سے چلا اور کوہ وصحرا طے کرتا ہوا افغانستان میں داخل ہوا اور دس برس اس مذہبی اقلیم میں مختلف مقامات کی زیارت وسیاحت کرتا رہا۔ لنکا جا کر اس نے بدھ مذہب کی کتابوں کی نقل بھی حاصل کی۔

فاہیان نے اس دور کے سیاسی حالات بالکل نہیں لکھے ہیں۔ راجاؤں تک کے نام ذکر نہیں کیے ہیں۔ صرف بدھ مت کی تاریخ، ان کی کیفیت اور ان کی تعلیمات کے متعلق نشان دہی کی ہے۔ اس نے بدھ مت کی خانقاہوں کو بارونق پایا جن میں ہزاروں بھکشوؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم وتربیت میں مصروف پایا۔ فاہیان نے بنارس کا بھی تذکرہ کیا ہے، ساتھ ہی اس دور میں بنارس کی مذہبی خانقاہوں کی بھی تفصیل بیان کی ہے۔

---

[1]: یہ ندی مدھیہ پردیش کے امرکنٹک نامی جگہ سے نکل کر وندھیاچل اور سات پوڑا کے درمیان سے مغربی سمت بہتی ہے اور منڈلا جبل پور تک جاتی ہے۔ مہابھارت اور رامائن میں اسے 'ریوا' کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس ندی کا ہندوؤں سے عقیدت مندانہ تعلق ہے کیوں کہ ان کے تقریباً سبھی دیوی دیوتاؤں، رشی منیوں، سادھو سنتوں، گنیش، رام، لکشمن، ہنومان وغیرہ نے اسی ندی کے کنارے اپنے اپنے عقیدے اور تعلیم کے مطابق عبادتیں کی ہیں۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

راجا بکرماجیت کے بعد کے دوسرے فرمانروا

راجا بکرماجیت کے مرنے کے بعد سلطنت میں زوال آ گیا اور مختلف راجاؤں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ ان میں جن راجاؤں کی تفصیل مل سکی وہ درج ذیل ہے:

نمبر شمار	نام راجا	مدت حکومت	کیفیت
۱	راجا بھوج	۵۰ سال	قوم پوار سے تھا، شہر کھرکھوں بیجاپور قصبہ ہنڈیا اسی کے وقت میں آباد ہوا
۲	راجا باسدیو	۷۰ سال	دارالسلطنت قنوج تھا۔ اس راجا کے عہد میں بہرام گور تاجرانہ لباس میں سلطنت ہندوستان اور اہل ہند کے اوصاف واطوار دریافت کرنے کی غرض سے ہندوستان آیا تھا۔ کالپی اور قنوج کے قلعے اسی راجا نے تعمیر کیے۔
۳	راجا رام دیو		راجا باسدیو کا سپہ سالار تھا، قنوج پر قابض ہوا۔
۴	راجا پرتاپ چند		راجا رام دیو کے سپہ سالاروں میں سے تھا۔ نوشیروان عادل شاہ ایران نے ۵۲۰ء میں اس پر چڑھائی کی، آخر کار تصفیہ خراج کے بعد پلٹ گیا۔ اس راجا کی وفات کے بعد راؤں نے سر اٹھایا اور اکثر اطراف سلطنت پر قابض ہو گئے۔
۵	راجا جیتو		بنارس میں تھوڑے ہی دن اس نے حکومت کی، محلّہ جیت پورہ اسی کے نام سے موسوم ہے۔
۶	راجا بین		تھوڑے ہی دنوں کے بعد بنارس کا حکمران ہوگیا تھا بھر کی قوم سے تعلق رکھتا تھا، بنیا تالاب اسی کے نام سے موسوم ہے۔
۷	راجا بھولی		مقام بھوئیلی آباد کر کے اسی کو دارالسلطنت بنایا
۸	راجا کرن		راجا بھولی کے بعد حکمراں ہوا، بنارس کا مشہور علاقہ کرن گھنٹہ اسی کے نام سے موسوم ہے۔
۹	راجا بدھ سین		اس نے خاص بنارس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس راجا کے عہد میں مسلمانوں کی جا بجا بستیاں آباد ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

بنارس عہد اسلامی میں

[۷۰۰ء سے قبل اور مابعد]

اب تک آپ نے حضرت نوحؑ کے وقت سے آریوں، بدھوں اور پھر ہندوؤں کے دور حکومت پر ایک نظر ڈالی۔ گو ہندوستان میں مسلمانوں کا قدم آچکا تھا اور ابھی یہ بتلایا گیا کہ راجا بدھ سین کے دور حکومت میں مسلمانوں کی بستیاں آباد ہونا شروع ہو چکی تھیں لیکن اس ضمن میں بنارس سے مسلمانوں کی وابستگی کا ذکر ابھی تک نہیں آیا۔

۵۷۱ء کا زمانہ تاریخ کا ایک یادگار زمانہ ہے۔ اسی سنہ میں ۲۲/اپریل کو آقائے نامدار تاجدار دو عالم ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آفتاب رسالت کی کرنیں دنیا کے چپے چپے پر پڑیں۔ بالآخر ہندوستان بھی مشرف ہوا۔ گو مسلمانوں کا پہلے پہل فاتحانہ حیثیت سے قدم حضرت عمرؓ (شہید ۲۴ھ) کے دور حکومت میں آیا۔[1]

ہندوستان میں اس وقت عجیب سیاسی کشمکش تھی جس کا تذکرہ آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ملک کے طول وعرض میں خانہ جنگیوں میں سرگرم تھیں۔ غرض ہندوستان میں اسلام پہنچا اور سندھ کی راہ سے سرحد کے مغربی دروں کو پار کر کے سندھ کے بحری وبری راستوں سے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہوا۔

ہندوستان میں اسلام کے پہنچنے کا ایک اور سبب معجزہ شق القمر تھا جو مکہ

---

[1] حضرت عمر فاروق اعظمؓ [شہید ۲۴ھ] کے عہد میں صحابی رسول حضرت حکم بن العاص [متوفی ۴۵ھ] نے ۱۵ھ میں گجرات کا ایک علاقہ 'بھڑوچ' فتح کیا تھا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ [مستفاد از خلافت راشدہ اور ہندوستان۔ مصنفہ قاضی اطہر مبارکپوریؒ] ع ب نعمانی

معظّمہ میں واقع جبل ابوقبیس[1] پر پیش آیا تھا[2] ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسا واقعہ تو تھا نہیں جسے صرف عرب والوں نے ہی دیکھا ہو۔ ہندوستان کے راجاؤں کے تذکرے میں اس معجزے کا بھی ذکر آتا ہے۔ اور 'تاریخ فرشتہ' میں مذکور ہے کہ ہندوستان میں مہاراجا ملیبار[3] کے اسلام لانے کا سبب یہی معجزہ تھا جو اس نے رات میں اپنے محل سے دیکھا تھا۔

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں [عزیز لکھنوی]

فن مواقیت کی روشنی میں حساب لگانے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں رات ۱۲ بج کر ۵ منٹ کا وقت تھا۔ امام احمد بن محمد طحاوی [متوفی ۳۲۱ھ] وعلامہ عماد الدین اسماعیل بن عمر وابن کثیرؒ [متوفی ۷۷۴ھ] نے اس واقعہ کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔

---

[1]: یہ مکہ مکرمہ کے مشہور پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے جو مسجد حرام سے متصل ہی بجانب مشرق واقع ہے اور صفا پہاڑی سے ملا ہوا ہے۔ اس کی بلندی تقریباً ۴۲۰ میٹر ہے اس کے بارے میں بعض روایات میں ہے کہ یہ سب سے پہلا پہاڑ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر پیدا فرمایا اور پھر بقیہ تمام پہاڑ اسی سے پھیلائے گئے۔ [رواه البيهقي في شعب الايمان ،عن ابن عباسؓ ۳/۴۳۲] زمانہ جاہلیت میں اس کو امین کے نام سے پکارا جاتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ طوفان نوحؑ کے زمانے میں اسی پہاڑ میں حجر اسود محفوظ رہا۔ [قال الهيثمي في 'مجمع الزوائد' ۳/۲۴۳ رواه الطبراني في الكبير ورجاله ثقات: مکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینے میں ۔۱۱۴] ع ب نعمانی

[2]: صاحب مواهب اللدنیہ علامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی [متوفی ۱۱۲۲ھ] کی تحقیق کے مطابق واقعہ شق القمر ہجرت سے تقریباً پانچ سال قبل پیش آیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: شرح مواهب اللدنیہ ۶/۳۷۴ ع ب نعمانی

[3]: جنوبی ہند کے مشہور علاقہ مالابار [ملیبار] کے اس راجا کا نام زمورن [سامری] تھا جسے وہاں کی زبان ملیالم میں 'چرمن' کہا جاتا ہے۔ اس راجا کا تعلق وہاں کے مشہور خاندانوں میں ایک خاندان 'پالویا' سے تھا۔ اس راجا کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ یا حادثہ ہوتا تو اسے اپنے روزنامچہ میں درج کرا دیتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے چاند کو دو ٹکڑوں میں دیکھا تو اس واقعہ کو بھی نہ صرف یہ کہ روزنامچہ میں درج کرایا، بلکہ اس کی تحقیقات بھی کرائی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ واقعہ عرب کے نئے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا معجزہ ہے تو فوراً مسلمان ہو گیا اور آنحضرت ﷺ کی زیارت کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوا، لیکن راستے میں اتنا شدید بیمار ہوا کہ وہیں انتقال کر گیا اور اس کی لاش یمن میں لا کر دفن کر دی گئی۔ [مستفاد از ہندوستان میں اسلامی حکومت، مصنفہ مفتی شوکت علی فہمی] ع ب نعمانی

تاریخوں میں بابا رتن[1] کا بھی ذکر موجود ہے جو اس واقعہ کی تصدیق کے لیے عرب بھیجے گئے تھے، اور وہاں سے تصدیق کر کے اسلام لائے۔ ان کا مزار بھٹنڈے[2] میں موجود ہے[3]

بہرحال واقعات یہی بتلاتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی ہی میں ہندوستان اسلام کی شعاعوں سے منور ہو چکا تھا۔ جہاں تک قصے کہانیوں کا تعلق ہے تو قصص الانبیاء کی اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ جنت سے لنکا کے کوہ آدم پر اتارے گئے جہاں ان کے قدموں کا نشان بھی موجود ہے اور اب تک زیارت گاہ

---

[1]: بابا رتن کے متعلق مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں۔ چنانچہ ماضی قریب کے مشہور محقق و مورخ حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ [متوفی ۱۹۹۶ء] اپنی کتاب 'خلافت راشدہ اور ہندوستان' میں تحریر فرماتے ہیں کہ: بابا رتن کی شخصیت کافی پراسرار ہے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے چھ سو سال بعد صحابیت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ پنجاب کے شہر بھٹنڈا کا رہنے والا تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ [متوفی ۸۵۲ھ] نے رتن ہندی کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جنہیں بعض لوگوں نے صحابی مانا ہے اور لکھا ہے کہ بابا رتن ہندی ایک معمر آدمی تھا جس کا معاملہ اس کے قول کے مطابق مدت مدیدہ تک پوشیدہ تھا اور اس نے چھٹی صدی میں دعوائے صحابیت کیا۔ علماء متقدمین کی کسی کتاب میں رتن ہندی کا ذکر موجود نہیں ہے۔

حافظ ذہبیؒ [متوفی ۷۴۸ھ] تجرید اسماء الصحابہ میں تحریر فرمایا ہے کہ رتن ہندی ایک معمر شخص تھا جس نے چھٹی صدی ہجری میں بلاد مشرق میں ظاہر ہو کر دعوائے صحابیت کیا اور جاہلوں نے اس سے روایت کی۔ بظاہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے اور بعض افتراء پردازوں نے اس کا نام گھڑ لیا ہے۔ نیز ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں اس کا شدت سے انکار کر کے دجال بتلایا ہے۔ علامہ رضی الدین حسن بن محمد صنعانیؒ [م ۶۵۰ھ] بابا رتن ہندی کے معاصر اور ہم وطن تھے۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب موضوعات میں اس کا انکار کیا ہے۔ [خلافت راشدہ اور ہندوستان]

بابا رتن کے متعلق جتنی معلومات دستیاب ہو سکیں وہ سپرد قلم کر دی گئیں۔ ان میں کتنی باتیں صحیح ہیں اس کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔ ع ب نعمانی

[2]: یہ ریاست پنجاب کے جنوب مغرب گوشے میں پاکستانی سرحد سے ۱۰۰ کیلومیٹر قبل واقع دنیا کے سب سے قدیم و تاریخی شہروں میں سے ایک شہر ہے جسے بھائی نامی کسی شخص نے آباد کیا جو اسی کی طرف منسوب ہو کر بھٹنڈا سے مشہور ہوا۔ یہاں ایشیا کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[3] الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ: ج:۱، ص:۵۳۴۔ بحوالہ تاریخ شمس الدین محمد ابن ابراہیم جزری۔ اس کے علاوہ مولانا جامیؒ نے نفحات الانس میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ عبدالسلام نعمانی

خلائق ہے۔ اس لیے ہندوستان ابتدائے آفرینش سے ہی اسلام کی فطرت پر ہے اور اسی لیے قرآن نے شہادت دی ہے کہ:

ماکان الناس الاامۃ واحدۃ   لوگ صرف ایک ہی قوم تھے

اس لیے حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد بھی اسلام ہی کی پیرو تھی۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ [متوفی ۱۱۹۵ھ] فرماتے ہیں کہ:

"خلاصہ یہ ہے کہ قدیم زمانے سے یہ ملک بھی مذہب اسلام کا گہوارہ رہا ہے، لہٰذا صحیح اور یقیناً صحیح ہے کہ بحیثیت مذہب ابتدا ہی سے یہ ملک اسلام کا وطن ہے۔" [مکتوبات]

جس طرح آریوں کے قبیلے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف مقامات میں آئے اسی طرح عربوں اور ترکوں کے قافلے بھی جو اسلام قبول کر چکے تھے، اول اول

ملک ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی بس گئے تھے۔ مسلمانوں کی یہ پرامن آبادیاں شمالی وجنوبی ہندوستان میں قائم ہوئیں جن میں بنارس بھی شامل تھا۔ اور جب مسلمانوں نے پہلی مرتبہ اس ملک میں قدم رکھا تو شودر[1] خاندان کا تاج دار 'سہراس رائے' سندھ میں حکومت کرتا رہا جو راجا 'ہرش' کا ہم عصر تھا اور عربوں کی لڑائی میں مارا گیا اور اس کے بیٹے -ساہسی نے عربوں کے مقابلے کی تیاری کی۔ بالآخر وہ بھی جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد برہمنوں کا خاندان برسر حکومت آ گیا۔ اس کا مورث 'چچ' [مقتول ۵۵ھ] راجا ساہسی کا وزیر تھا جو گدی خالی پاکر قابض ہوگیا۔ راجا داہر[2] [مقتول ۹۳ھ] اسی کا بیٹا تھا جس کے زمانے میں عربوں نے سندھ کی فتح کی تکمیل کی اور ۴۱۹ھ میں محمود غزنوی [متوفی ۴۲۱ھ] [3] کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے یہاں عربوں کی منظم حکومت قائم رہی۔

یہ سب تو فتوحات کا ذکر تھا جو مسلمان عربوں کی ہیں۔ اب ایک نظر آپ ان تعلقات پر بھی فرمائیں جو عرب اور ہندوستان کے درمیان زمانہ قدیم سے رہے ہیں۔ کیوں کہ ملک ہندوستان میں عربوں کی فتوحات کی تقریب سے تعلقات کا ذکر ناگزیر ہے۔

---

۱ برہما کے بیٹے منو کے دھرم شاستر کے مطابق ہندوؤں کی چوتھی یا خدمت کرنے والی ذات، جسے بیان کرتے ہیں کہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئی تھی۔ نیچی ذات، کمینی ذات [فرہنگ آصفیہ ج:۳ ص:۱۹۰] ع ب نعمانی

۲ اس کا پورا نام داہر سین تھا۔ ۶۶۱ء میں پیدا ہوا۔ ۷۱۲ء میں سندھ میں محمد بن قاسم سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ ع ب نعمانی

۳ یمین الدولہ ابوالقاسم محمود بن سبکتگین المعروف بہ محمود غزنوی۔ یہ ۲/ اکتوبر ۹۷۱ء کو غزنی [افغانستان] میں پیدا ہوئے۔ ۹۹۷ء سے اپنے انتقال تک سلطنت غزنیہ کے حکمراں رہے۔ غزنی شہر کو اس زمانے میں دنیا کے دولت مند ترین شہروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کی وسیع سلطنت پر موجودہ مکمل افغانستان، ایران اور پاکستان کے کئی حصے اور شمال مغربی ہند شامل تھا۔ تاریخ اسلامیہ میں یہ پہلے حکمراں تھے جنہوں نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ ۳۰/ اپریل ۱۰۳۰ء کو انتقال ہوا اور غزنی میں مدفون ہوئے۔ ع ب نعمانی

عرب اور ہندوستان کے تعلقات

عرب اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کا سراغ پچھلے زمانے میں ۲۰۰۰ ق م تک لگ چکا ہے جب کہ تجارتی قافلے عرب سے بحر ہند میں آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں سنسکرت کے الفاظ مثلاً فلفل [کالی مرچ] کافور، زنجبیل [سونٹھ] صندل، نارجیل [ناریل] قرنفل [لونگ] جائفل وغیرہ عہد قدیم ہی میں داخل ہوے۔ اسی طرح عود هندی، تمر هندی [املی] قسط هندی اور مهند [ہندوستانی تلوار] سے ہندوستان کی طرف نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ یورپ میں جن ہندسوں کو عربی ہندسے [ARABIC NOMBERS] کہتے ہیں وہ ہندوستان میں ہی ایجاد ہوے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی ان کو الرقوم الهندية کہتے ہیں[1] پھر یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ ان دونوں ملکوں کے مابین علمی تعلقات بھی تھے۔ ۸۰۰ ق م تک ہندوستان میں لکھنے کا رواج تھا۔ عرب تاجروں کے ذریعہ آرامی خط[2] ہندوستان پہنچا۔ چناں چہ اس وقت کے کتبات جو ہندوستان میں رو یہ اور آندھرا خاندان کے برآمد ہوے ہیں وہ ان ہی حروف میں تھے۔

---

[1]: اس کی تائید اور مزید تفصیل کے لیے دیکھیں 'عرب ہند تعلقات۔ ص: ۱۳۳۔۱۳۴ ع ب نعمانی

[2]: پہلے ہجی رسم الخط کی ابتداء ۱۸۰۰۔۱۲۰۰ قبل مسیح کے درمیان اس علاقہ میں ہوئی جو اب فلسطین اور شام کہلاتا ہے۔ یہ رسم الخط اس وقت کے معیار سے نہایت سہل اور ترقی یافتہ تھا۔ تھوڑے ردو بدل کے ساتھ وہ کئی تہذیبوں اور زبانوں میں رائج ہو گیا۔ اسی رسم الخط کو جو ابھی ارتقا کی ابتدائی منزلوں تھا، شمالی سامی اور جنوبی سامی رسم الخط کا نام دیا گیا۔ یہی جنوبی سامی رسم الخط نے ترقی کر کے خط آرامی، صلبی، کنعانی کے نام سے شہرت پائی۔ [تفصیل کے لیے دیکھیں: اردو انسائیکلو پیڈیا جلد: ۳ صفحہ: ۲۳۰] ع ب نعمانی

ہندوستان مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک نئی تہذیب اور نئے تمدن سے آشنا ہوا اس وقت کی مسلم آبادیاں لنکا، مالدیپ، مالابار، ٹراونکور، کارومنڈل، گجرات، ممبئی اور سندھ کے ساحلی علاقوں میں قائم ہوئیں۔ گو اس زمانے کے ہندو آج کے مقابلے میں بہت زیادہ سخت تھے، لیکن آپس میں میل جول سے ان میں بڑے خوشگوار تعلقات پیدا ہوئے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہم معاشرتی تعلقات برتنے اور ایک دوسرے کی قدیم تہذیب وتمدن اور علم وفن میں ایک دوسرے کی ترقیات سے آگاہ ہونے کا موقع ملا۔ بلخ کے نوبہار [بدھ کی تعلیمی خانقاہ] کے پجاری برمک پرمکھ[1] نے اسلام قبول کر لیا تھا اور عباسی خلفاء کے دربار میں ۱۳۶ھ سے ۱۸۶ھ تک اس کے خاندان کے لوگ وزارت کے منصب پر فائز رہے اور ملکی نظم ونسق کی باگ ڈور اُنہی کے ہاتھوں میں تھی[2] اور ان کی ہی تحریک سے سنسکرت کتابوں کے ترجمہ کے لیے ہندوستان کے اہل علم بغداد بلائے گئے اور بے شمار کتابوں کے عربی ترجمے ہوئے۔ مہابھارت کے قصے، اصول شاستر [حکمت] فلسفہ، نجوم، ہیئت، جوتش، جفر، رمل، موسیقی، کیمیا، منتر، جادو، افسانے، کہانی اور اخلاق وحکمت وغیرہ کے عربی ترجمے کیے گئے جن کے اب بہت سے اصل سنسکرت کتابوں کے نسخے ناپید ہیں۔

---

[1]: اس کے مسلمان ہونے میں حکومت عباسیہ کے مشہور داعی ابو مسلم خراسانیؒ کی جدوجہد شامل تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: 'تاریخ اسلام' ج:۳۔ و 'ملت اسلامیہ کی تاریخ' ع ب نعمانی

[2]: مؤرخین نے انہیں 'برامکہ' کہا ہے۔ ع ب نعمانی

چرک سنہتا کے ایک قدیم سنسکرت مخطوطے کے دو صفحات

اس موقع پر بنارس کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ آیورویدِ [طب] کی ابتدا بنارس ہی سے ہوئی جسے ہنود اپنے عقیدے کے مطابق الہامی مانتے ہیں۔

اس کی تاریخ یہ ہے کہ برہما رشی نے برہم سنہتا بنائی اوران سے دکھش پرجا پتی نے اس علم کو سیکھا اور دکھش سنہتا بنائی اور پھران سے اوتی کے جوڑے بیٹوں اوتی کماروں نے اس علم کو سیکھا۔ چناں چہ وہ دونوں اس علم میں ایسے لائق و فائق ہو گئے کہ ربانی حکیم مانے جانے لگے۔ پھرانہوں نے مہاراجا اندر کو یہ علم سکھایا۔ ان کے زمانے میں اس علم کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ لیکن جب کچھ مدت کے بعد اس علم کو زوال آ گیا تو بہت سے رشی ہمالیہ پہاڑ پر جمع ہوے۔ پھر باہمی مشورے سے بھاردواج رشی سے یہ خواہش کی کہ وہ مہاراجا اندر سے علم سیکھ کر اس کا پرچار کریں۔ چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مہاراجا اندر سے آیورویدک علم سیکھ کر سب رشیوں کو سکھایا۔ آریوں کے بیان کے مطابق موجودہ مصر میں قدیم آریوں ہی کی آبادی ہے۔ اور تنترک دیوتا ہبل شگھنڈی [سیاہ کلغی والا] نے ملک مصر میں 'نیل تنتر' [ایک مخفی علم جو قدیم ہندووں کو معلوم تھا] کی تعلیم دی۔

حضرت عیسیٰؑ سے ۳۲۰ سال قبل فاضل منی وشدھ کا بیٹا 'چرک' ایک نہایت مشہور و اعلیٰ ترین طبیب ہوا ہے جو بنارس ہی کا رہنے والا ہے، ہندو اس کو 'سریش' یعنی ہزار سر والے سانپ دیوتا کا اوتار سمجھتے ہیں۔

مہاراج اندر کے شاگردوں کے بعد جب اس علم کو زوال ہوا تو مہارشی 'چرک' نے

راجا اندر کے شاگردوں کی طبی تصنیفات کا مطالعہ کر کے 'چرک سنہتا' نامی ایک کتاب بنائی جو اس علم کی نہایت مستند اور قدیم کتاب مانی جاتی ہے۔

چرک کے بعد بنارس کے مہاراجا دیوداس یا دھن ونتری حضرت عیسیٰؑ سے کئی سو برس پہلے پیدا ہوئے جن کے بہت سے شاگرد ہوئے جن میں سشرت [دل لگا کر سننے والا] ان کا شاگرد رشید ہوا اور اس نے سشرت سَنہتا کے نام سے علم ویدیہ پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ بغداد کے خلیفہ ہارون رشید [متوفی ۱۹۳ھ] نے عربی میں کرایا اور اسی زمانے میں 'چرک سنہتا' کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا۔ 'پنچ تنتر' کا بھی ترجمہ اسی دور میں ہوا جو اب 'کلیلہ دمنہ'[1] کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

---

[1]: یہ کتاب سنسکرت زبان میں تھی۔ ساسانیوں نے پہلے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا تھا، پھر دوسری صدی ہجری میں عبداللہ ابن المقفع [متوفی ۱۴۵ھ] نے اسے عربی زبان میں منتقل کیا جو 'کلیلہ دمنہ' کے نام مشہور ہے۔ اصل فارسی ترجمہ تو کھو گیا، لیکن عربی ترجمہ سلامت رہا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ نظم اور نثر میں کئی مرتبہ منتقل ہوئی اور پھر عربی سے دنیا کی سب مہذب زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ [آب کوثر۔ ص ۳۳] ع ب نعمانی

بنارس میں مسلمانوں کی آمد

عرب مسلمانوں کا پہلا جنگی بیڑہ حضرت عمر فاروقؓ [شہید ۲۴ھ] کے زمانے میں دریا کی راہ سے ہندوستان آیا اور ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء کے بعد جب ایران فتح ہوا تو اس کے بعد سیستان کی طرف سے بھی مکران اور سندھ کی طرف بڑھ آئے تھے[1] لیکن محمد بن قاسم کی طرف سے سب سے پہلے مہلب بن ابوصفرہ[2] نے ہندوستان میں قدم رکھا۔

آج کل مکران کا نصف حصہ بلوچستان کہلاتا ہے۔ اگرچہ مورخ بلاذری[3] فتوحات فاروقی کی حد سندھ کے شہر دیبل[4] تک لکھتا ہے، مگر طبری[5] نے مکران ہی کو

۱: یہ دور خلیفہ سوم حضرت سیدنا عثمان غنیؓ [شہید ۳۵ھ] کا تھا جب کہ عبداللہ بن عامرؓ [متوفی ۵۹ھ] کے حکم سے عبدالرحمٰن بن سمرہ بن حبیب [متوفی ۵۰ھ] والی سیستان نے زرنج سے آگے بڑھ کر سندھ تک کے ان تمام علاقوں پر تسلط کرلیا جو زرنج اور کش کے درمیان واقع تھے۔ اس کے بعد خلیفہ چہارم سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ [شہید ۴۰ھ] کے عہد میں سندھ پر ایک مستقل اور سخت حملہ کیا گیا اور مسلمان برابر فتح و نصرت کے پھریرے اڑاتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ [حکمت بالغہ ۲/۱۹۶ و ۱۹۷] از: مولانا ابوالجمال احمد مکرم عباسی چریاکوٹی [بحوالہ فتوح البلدان و ابن کثیر موجود در کتب خانہ دارالعلوم دیوبند] ع ب نعمانی

۲: مہلب ابن صفرہ تابعین میں سے تھے۔ ۸۲ھ میں وفات پائی۔ حافظ شمس الدین ذہبیؒ [متوفی ۷۴۸ھ] نے اپنی شہرہ آفاق کتاب سیر اعلام النبلاء میں ان کے تعلق سے امام بخاریؒ [متوفی ۲۵۶ھ] کے استاذ خلیفہ بن خیاطؒ [متوفی ۲۴۰ھ] کے حوالے سے ان کی ہندوستان کی جنگ میں شرکت کا تو ذکر کیا ہے لیکن محمد بن قاسم کی طرف سے آنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سیر اعلام النبلاء ۔۴/۳۸۴ ع ب نعمانی

۳: علامہ ابوالحسن احمد بن یحییٰ بلاذری بغدادی [متوفی ۲۷۹ھ] ع ب نعمانی

۴: دیبل کراچی سے ۳۷ میل دور ایک قدیم بندرگاہ تھی۔ ہندوستان پر سب سے پہلے اسی بندرگاہ پر اسلامی پرچم لہرایا گیا تھا۔ یہاں ہندوؤں کے بکثرت مندر تھے اور وہ اس شہر کو دیول کہتے تھے جو بعد میں 'دیبل' کہلانے لگا۔ ۱۹۱۲ء کی کھدائی میں یہاں بہت سے ایسے آثار ملے ہیں جو اسلامی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ع ب نعمانی [ملت اسلامیہ کی تاریخ]

۵: امام محمد بن جریر طبریؒ [متوفی ۳۱۰ھ] ع ب نعمانی

آخری حد قرار دیا ہے۔ لیکن یہ طبری کا بیان ہے، جبکہ مورخ بلاذریؒ کی روایت ہے کہ دیبل کے نشیبی حصہ اور تھانہ تک فوجیں آئیں۔ بہر حال اس زمانے میں فاتحین عرب نے مختلف ایشیائی علاقوں میں اسلام کی اشاعت شروع کیں۔ عرب، شام، فارس، وسط ایشیا، چین، مصر، اسپین وغیرہ ممالک خلفاے عرب کے زیر سلطنت ہو گئے۔

ہندوستان میں سندھ اور پنجاب کا علاقہ بھی اُنہی مفتوحہ ممالک میں داخل تھا مگر کچھ دنوں کے بعد یہ دونوں علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔

۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم[۱] سندھ پہنچا تھا اور تین برس کے عرصے میں چھوٹے کشمیر [پنجاب] کی سرحد ملتان سے کچھ دور تک، اور مالوہ کی سرحد تک قبضہ کرلیا اور پورے سندھ پر قابض ہو گیا۔ راجا داہر کے ساتھ مل کر جن ہندی سپاہیوں نے عربوں کا سب سے زیادہ مقابلہ کیا، ان کا نام تکا کرہ ہے جو ٹھاکر کی جمع ہے[۲] پھر ۱۴۰ھ مطابق ۷۵۸ء میں جب کہ عباسی خلافت کا زمانہ تھا، ہشام جو کہ عباسی گورنروں میں کامیاب ترین گورنر تھا، سندھ کا گورنر ہو کر آیا۔ اس نے عمر بن جمل نامی افسر کو جہازوں کا ایک بیڑا دے کر گجرات بھیجا۔ وہ ناکام واپس ہوا۔ پھر ہشام نے خود ایک بیڑا لے کر بھڑوچ کے قریب قندھار پر قبضہ کر کے اپنی فتح کی یاد میں یہاں پر ایک مسجد بنوائی جو گجرات میں سب سے پہلی مسجد تھی۔ [فتوح البلدان ص ۱۷۱]

بغداد کے خلیفہ مہدی [متوفیٰ ۱۶۹ھ] کے زمانے میں عبد الملک ابن شہاب سمعی نے ۱۶۰ھ مطابق ۷۷۶ء میں بھڑوچ، باربد [بھاڑبھوت] کو فتح کیا[۳]

۱: ان کا پورا نام عماد الدین محمد بن قاسم تھا، یہ بنوامیہ کے مشہور سپہ سالار حجاج بن یوسف ثقفی [متوفی ۹۶ھ] کے بھتیجے تھے ۶۹۴ء میں طائف میں پیدا ہوے۔ ان کے سندھ فتح کر لینے سے ہندوستان میں اسلام کا عام طور سے تعارف ہوا۔ ان کی اس عظیم فتح کے باعث برصغیر میں ان کی حیثیت کافی ممتاز ہو گئی۔ ۹۶ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ع ب نعمانی

۲: تاریخ فرشتہ ص ۳۰ و بلاذری [تاریخ فتوح البلدان۔ باب فتح سندھ] عبد السلام نعمانی

۳: اس کے علاوہ اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک [متوفیٰ ۱۲۵ھ] کے زمانے میں سندھ کا گورنر جنید تھا جو بڑا قابل صوبیدار تھا۔ اس نے ۱۰۷ھ میں کشمیر تک تقریباً وہ تمام علاقہ فتح کر لیا تھا جو اب مغربی پاکستان [بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر]

سندھ میں اس وقت بودھ مذہب رائج تھا۔جیسا کہ جغرافیہ نویسوں نے لکھا ہے۔اوران کی آبادی کا نام بودھ پور ہے۔جب مسلمان یہاں فاتح بن کر داخل ہوئے تو ان کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر یہ اسلام میں داخل ہوگئے۔اس طرح ساحلی علاقوں سے اب اسلام کا قدم شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں پہنچا جس میں بنارس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، کیوں کہ اول اول مسلمان فاتحین یہیں داخل ہوئے اس کی طرف علامہ اقبالؒ نے یوں اشارہ کیا ہے:

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو

اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

۳۶۶ھ مطابق ۹۷۷ء میں سلطان ناصرالدین سبکتگین[1] [متوفی ۹۹۷ء] اوراس کے بعد ۱۰۰۱ء مطابق ۳۹۲ھ سے ۱۰۲۶ء تک اس کے بیٹے اور جانشین سلطان محمود غزنوی [متوفی ۱۰۳۰ء] نے پنجاب، راجپوتانہ، گجرات وغیرہ مقامات پر اسلام کی اشاعت شروع کی۔اس زمانے سے ۱۳۰۰ء تک شمالی ہندوستان میں جابجا مسلمانوں کی بستیاں قائم ہوچکی تھیں ان بستیوں کے موسس سید سالار مسعود غازی اوران کے رفقاء تھے۔

[تاریخ بنارس ۱/۱۵]

[گزشتہ حاشیے کا بقیہ]:

کہلاتا ہے۔اس کے علاوہ اس نے ہندوستان میں مارواڑ، اجین، گجرات، بھڑوچ تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ اگرچہ بعد کے صوبے دار ان فتوحات کو برقرار نہ رکھ سکے۔

[ملت اسلامیہ کی تاریخ۔ص ۱۵۵] ع ب نعمانی

[1] یہ سبکتگین کون تھا اور کہاں سے آیا، اس میں عام مورخین کا کثرت سے اختلاف ہے۔بعض اسے کسی ترکی امیر کا لڑکا، اور بعض ایرانی امراء کی نسل میں سے بتلاتے ہیں۔لیکن اس بات پر سارے مورخین متفق ہیں کہ کچھ بردہ فروشوں نے اسے لاکر 'بخارا' میں الپتگین نامی سامانی حکمراں [متوفی ۹۶۳ء] کے ہاتھوں بیچ دیا جہاں اس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ پہلے تو الپتگین نے اسے اپنا داماد بنایا پھر اس کے مرنے کے ۱۴ سال بعد ۹۷۷ء میں وہ غزنی کے تخت حکومت پر بھی بیٹھا اور بہت آن بان سے حکمرانی کرتا ہوا 'بلخ' کے قریب ۹۹۷ء میں انتقال کرگیا۔اس کے بیٹوں میں محمود غزنوی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

[ہندوستان پر اسلامی حکومت] ع ب نعمانی

'آئین اکبری'[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۱۹ء اور ۱۰۲۲ء میں دو مرتبہ بنارس میں قدم رکھا اور اسی زمانے میں سید سالار مسعود غازی کے رفیق کار ملک افضل علوی بنارس اور اس کے گرد و نواح میں تبلیغی کاموں میں مصروف تھے۔

'ڈسٹرکٹ گزٹ' بنارس میں لکھا ہے کہ:

''اس شہر کے ایک محلّہ میں مسلمان سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے آباد ہیں۔ یہ مسلمان بنارس میں یقیناً حضرت سپہ سالار مسعود غازی کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ ہیں کہ ملک افضل کو بنارس اور اس کے اطراف میں بھیجا تھا۔''

[آئینہ مسعودی ترجمہ مزات مسعودی اکبر وارثی میرٹھی]

مسلمانوں کا یہ تبلیغی جتھا بنارس میں قیام پزیر ہوا اور بنارس میں پہلی مرتبہ یہ مسلم نو آبادی قائم ہوگئی۔ اس زمانے میں بھی بنارس شمالی ہندوستان کا سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز علاقہ تھا جو اسلام کے زیر سایہ آ گیا۔ اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہوگئی جو مسند امام احمد اور سنن نسائی[2] میں آئی ہے کہ:

عن ابی هريرةؓ قال وعدنا	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول
رسول الله صلى الله عليه	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے
وسلم غزوة الهند الخ [بالفاظ بیہقی]	ہندوستان میں غزوہ کا وعدہ فرمایا۔

---

[1]: شیخ مبارک ناگوریؒ [متوفی ۱۰۰۱ھ] کے فرزند اور دربار اکبری کے مشہور عالم ابوالفضل [مقتول ۱۰۱۱ھ] کی مشہور تصنیف۔ ع ب نعمانی

[2]: حدیث کی ان دونوں مشہور کتابوں میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے:

عن ابی هريرةؓ قال وعدنا رسول الله ﷺ غزوة الهند فان ادركتها انفق فيها نفسی ومالی فان اقتل كنت من افضل الشهداء وان ارجع فانا ابو هريرة المحرر [نسائی ۶/۴۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت]

عن ابی هريرةؓ قال وعدنا رسول الله ﷺ فی غزوة الهند فان استشهدت كنت من خير الشهداء وان رجعت فانا ابو هريرة المحرر [مسند امام احمد ۲/۲۲۹]

اس کے علاوہ نسائی شریف میں ایک اور حدیث حضرت ثوبانؓ [متوفی ۵۴ھ] سے بھی مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے دو گروہوں کی آگ سے حفاظت فرمائے گا جن میں پہلا گروہ وہ ہوگا جو ہندوستان میں [اسلام کی سربلندی کے لیے] جنگ کرے گا اور دوسرا گروہ وہ ہے جو [قرب قیامت میں] حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ثوبان مولىٰ رسول الله ﷺ قال قال رسول الله ﷺ عصابتان من امتی احرزهما الله من النار عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسىٰ بن مريم [نسائی ۶/۴۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت] ع ب نعمانی

بالآخر ۱۰۰۳ء میں محمود غزنوی [متوفیٰ ۱۰۳۰ء] نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اس وقت سے ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر اس نے سترہ بار حملہ کیا۔ اور جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اس حملہ کے معاً بعد ہی بنارس تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔

محمود غزنوی کی اس حکومت میں ترک امیروں کی رائے کو اتنا دخل تھا کہ اس حکومت کو 'ترک شاہی' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سلطان ناصر الدین سبکتگین کے بعد یہ سلطنت موروثی یا خاندانی بن گئی، چناں چہ سلطان محمود کی جانشینی کا جھگڑا اس کے فرزندوں امیر مسعود و امیر محمد میں برپا ہوا۔ بالآخر مسعود کے حق میں فیصلہ ہوا۔ یہ بادشاہ زیادہ تر شمالی ہندوستان کی ہمسایہ حکومتوں سے الجھا رہا۔ تاہم اس کے عہد حکومت میں ۴۲۴ھ م: ۱۰۳۳ء سے ۴۳۲ھ م: ۱۰۴۱ء کے دوران ہندوستان میں دو بڑے حملے ہوے۔ پہلا حملہ سپہ سالار احمد نیالتگین کی یلغار تھی، جس میں وہ دریائے گنگا کے کنارے کنارے بنارس تک بڑھا اور ۴۲۴ھ مطابق ۱۰۳۳ء میں اس دولت مند شہر کو لوٹ کر واپس ہوا[1]

مسجد دو نیم کنگرہ کی تعمیر:

احمد نیالتگین کے حملہ کے بعد بنارس میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوئیں اور اسی وقت 'مسجد دو نیم کنگرہ' جو اب عوام میں ڈھائی کنگورہ کے نام سے موسوم ہے، تعمیر ہوئی۔ مسجد کا یہ نام تاریخی ہے جس سے اس کا سن تعمیر ۵۱۲ھ نکلتا ہے۔ یہ مسجد آج بھی اپنی پوری عظمت وجلال کے ساتھ قائم ہے اور شہر کی بڑی ممتاز وسنگین عمارت ہے۔ اس مسجد کے سال تعمیر سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ ہندوستان کی قدیم ترین مسجد ہے۔

دہلی کی مسجد 'قوۃ الاسلام' جو ۵۸۹ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری [مقتول ۱۲۰۶ء] کے سپہ سالار قطب الدین ایبک [متوفیٰ ۱۲۱۰ء] نے تعمیر کرائی

---

[1] تاریخ بیہقی ص: ۴۹۷ مطبوعہ تہران [ایران]
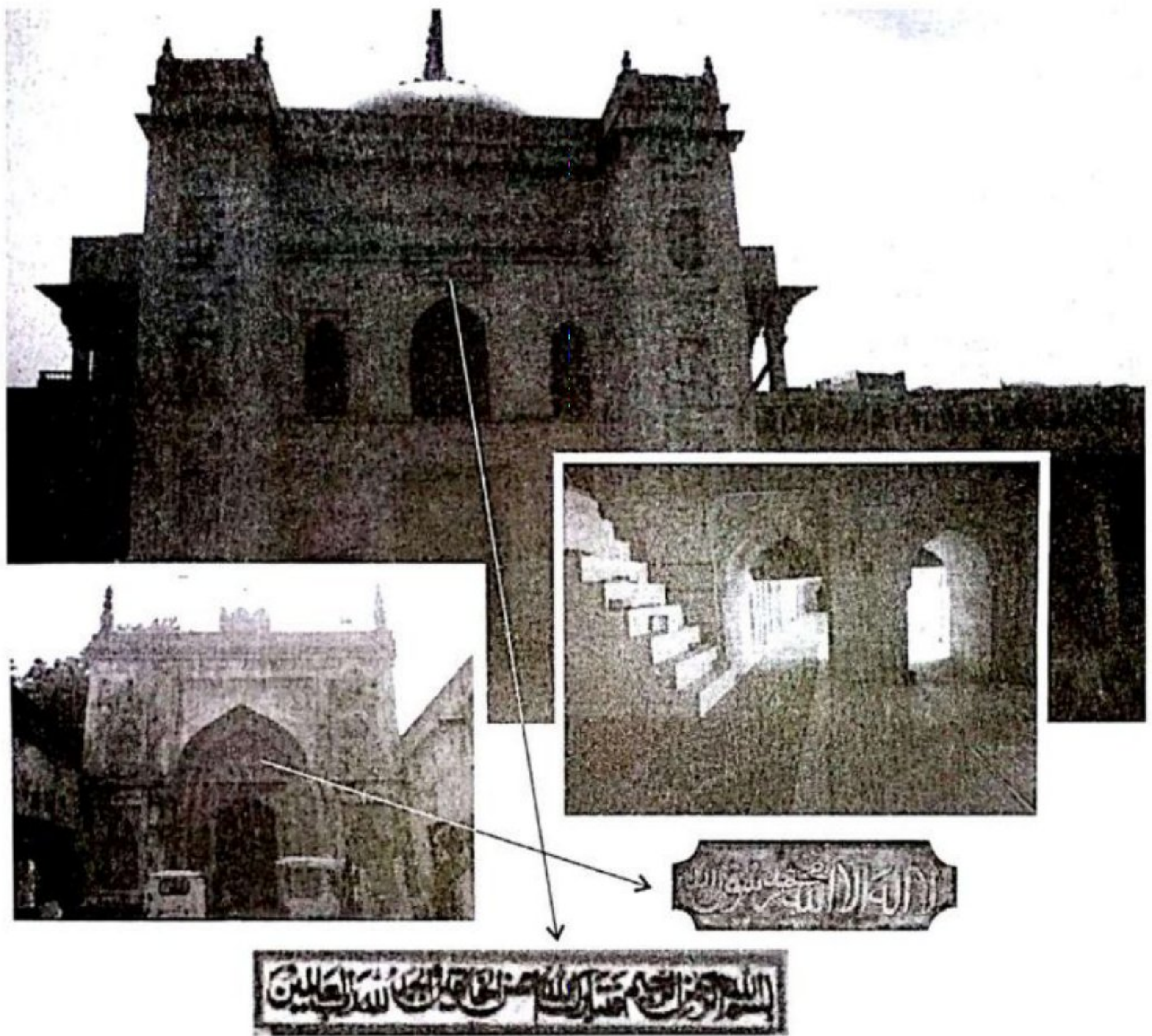
مسجد دونیم کنگرہ : اندرونی حصے اور داخلی دروازے پر نقش عبارتیں

تھی، وہ بھی مسجد مذکور کے صدیوں بعد کی ہی تعمیر ہے۔

مسجد دو نیم کنگرہ میں داخل ہونے کے لیے ایک محراب نما سنگین دروازہ موجود ہے جس پر کلمہ کھدا ہوا ہے۔ مسجد کی اندرونی محراب میں بھی قرآن پاک کی آیتیں کُھدی ہوئی ہیں، مسجد کی بیرونی دیوار میں ایک کتبہ تھا جو اب ضائع ہو چکا ہے۔

اس زمانے میں دہلی کے مہاراجا پرتھوی راج[1] [مقتول ۱۱۹۲ء] جو خاندان چوہان کا آخری راجا تھا، سلطان شہاب الدین غوری سے اس کی ٹھن گئی، جس کے نتیجے

---

[1] یہ خاندان چوہان میں ۱۱۴۹ء میں پیدا ہوا، اسے رائے پتھورا بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے والد کا نام سومیشور تھا۔

ع ب نعمانی

میں تھانیسر کا میدان کارزار گرم ہوا[1] پرتھوی راج مارا گیا اور سلطان محمد غوری دہلی پر قبضہ کر کے جلد ہی راجا جے چند کی سلطنت پر بھی قابض ہو گیا اور بنارس تک فوج کشی کرتا ہوا شمالی ہند کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد واپس ہوا اور اپنے غلام شاہ قطب الدین ایبک کو ۵۹۱ھ مطابق ۱۱۹۴ء میں دارالسلطنت دہلی کا تخت نشین بنایا۔ اس زمانے سے ۱۵۳۶ء تک غلامان تغلق، خلجی، سید، لودھی وغیرہ خاندانوں کے سلاطین سلطنت پر قابض رہے[2]

سارناتھ کی زمین سے جو کتبات برآمد ہوئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۱۷ھ مطابق ۱۰۲۶ء میں بنارس کا تعلق کچھ دنوں تک راجا مہپال سے تھا۔ مگر اس کی نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔

دوسرے کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۴۳ء م ۴۳۵ھ سے ۱۰۵۶ء م ۴۴۸ھ تک بنارس قنوج کے راجاؤں کی سلطنت میں داخل تھا۔ مہاراج گوبند چند کے بعد وجے چند پھر جے چند حکمراں رہا۔ ۱۱۹۴ء م ۵۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے راجا جے چند والی قنوج کو شکست دے کر قنوج و بنارس پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد غزنی روانہ ہوا اور اپنے مملوک و گورنر ہند قطب الدین ایبک کو ہدایت کر گیا کہ وقتاً فوقتاً ہندوستان میں جہاد کرتا رہے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق قطب الدین ایبک نے

---

[1]: شہاب الدین غوری اور رائے پتھورا [پرتھوی راج چوہان] میں یہ جنگ موضع ترائن میں ہوئی جو تھانیسر سے سات کوس اور دہلی سے چالیس کوس پر سرسوتی ندی کے کنارے ہے جسے اب تراوڑی کہتے ہیں۔ یہ واقعہ ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ء کا ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ [متوفی ۱۲۳۵ء] بھی اس جنگ میں موجود تھے اور انہی کی دعاؤں کی برکت سے شہاب الدین غوری فتحیاب ہوا۔ شہاب الدین غوری کے دور میں بڑے بڑے مفسرین و محدثین بھی موجود تھے، جن میں عظیم مفسر قرآن امام فخر الدین رازیؒ [متوفی ۱۱۴۹ء] کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جن کی کتاب 'تفسیر کبیر' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ شہاب الدین غوری کے امام صاحبؒ سے بڑے عقیدتمندانہ تعلقات تھے۔ آپ کا ہر ہفتہ وعظ فرمانے کا معمول تھا، چنانچہ بادشاہ پابندی سے مجلس وعظ میں شرکت کرتا اور وعظ سن کر رونے لگتا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: منتخب التواریخ، ص ۱۹۔۲۰ ع ب نعمانی

[2]: تاریخ بنارس۔ جلد اول، ص ۴۶ مطبوعہ سلیمانی پریس بنارس
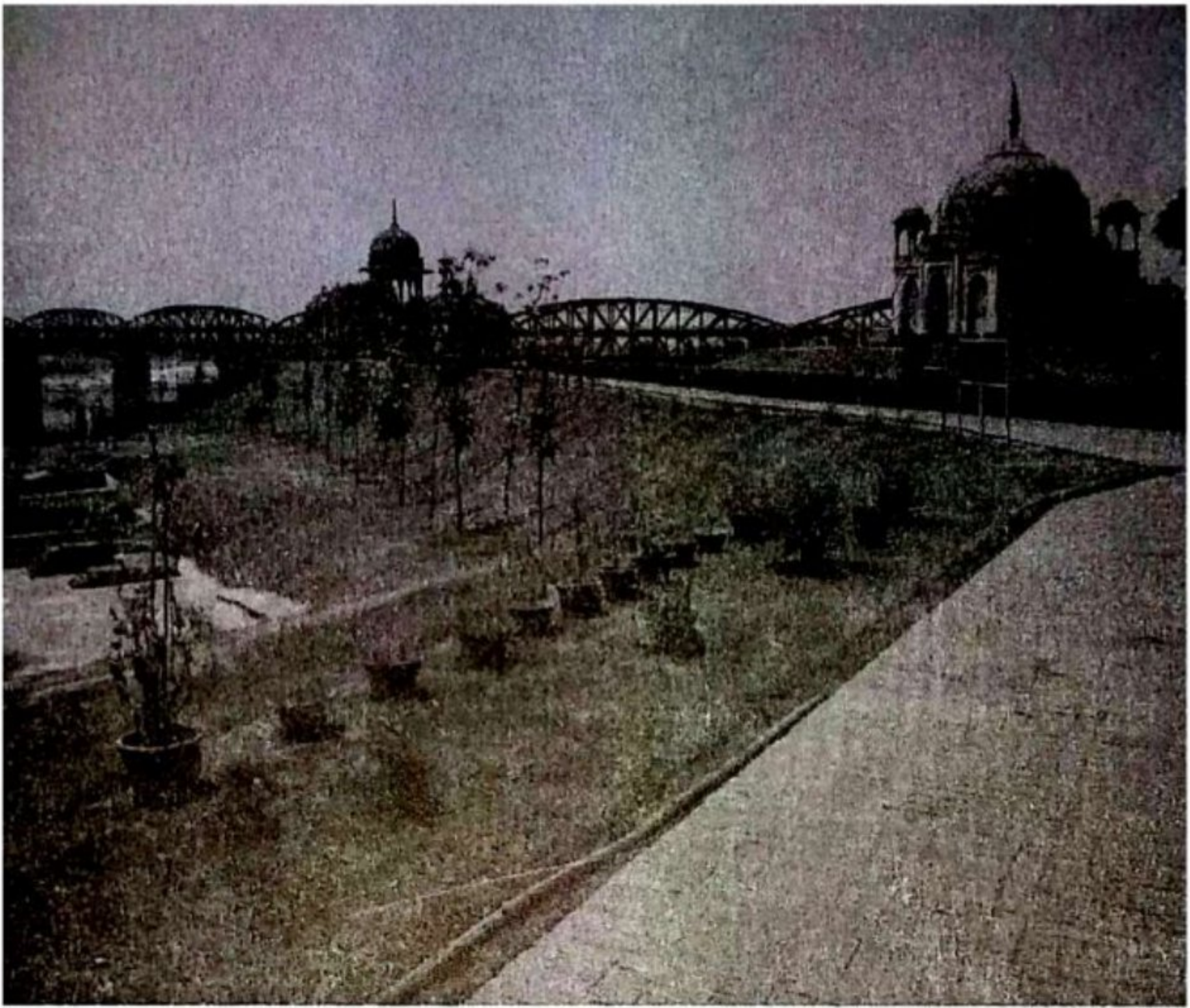
اکثر مقامات پر بغرض جہاد فوج کشی کی اور کامیاب ہوا۔ راجا جے چندوالی بنارس کو اس سے خطرہ پیدا ہوا۔

راجا جے چندوالی بنارس:

یہ راجا ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کے مقابلے میں ایک ممتاز شہرت کا مالک تھا جس کی حکومت مشرق میں حدود چین تک پھیلی ہوئی تھی اور مغرب میں لاہور کے قریب تک اس کا اثر پہنچا ہوا تھا۔ قنوج وغیرہ بھی اس کے مفتوحات میں سے تھے۔ ان شہروں میں سلطان محمود غزنوی ہی کے زمانے سے اسلام کی تخم ریزی شروع ہوگئی تھی اور مسلمانوں کی آبادی بھی قائم ہوچکی تھی۔ راجا بنارس نے ان مسلمانوں کو بھی اپنی فوج میں شامل کرلیا تھا اور پوری آن بان اور شان وشوکت کے ساتھ بڑی فوج لے کر ۵۹۰ھ م ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری کے مقبوضات کی طرف بڑھا اور
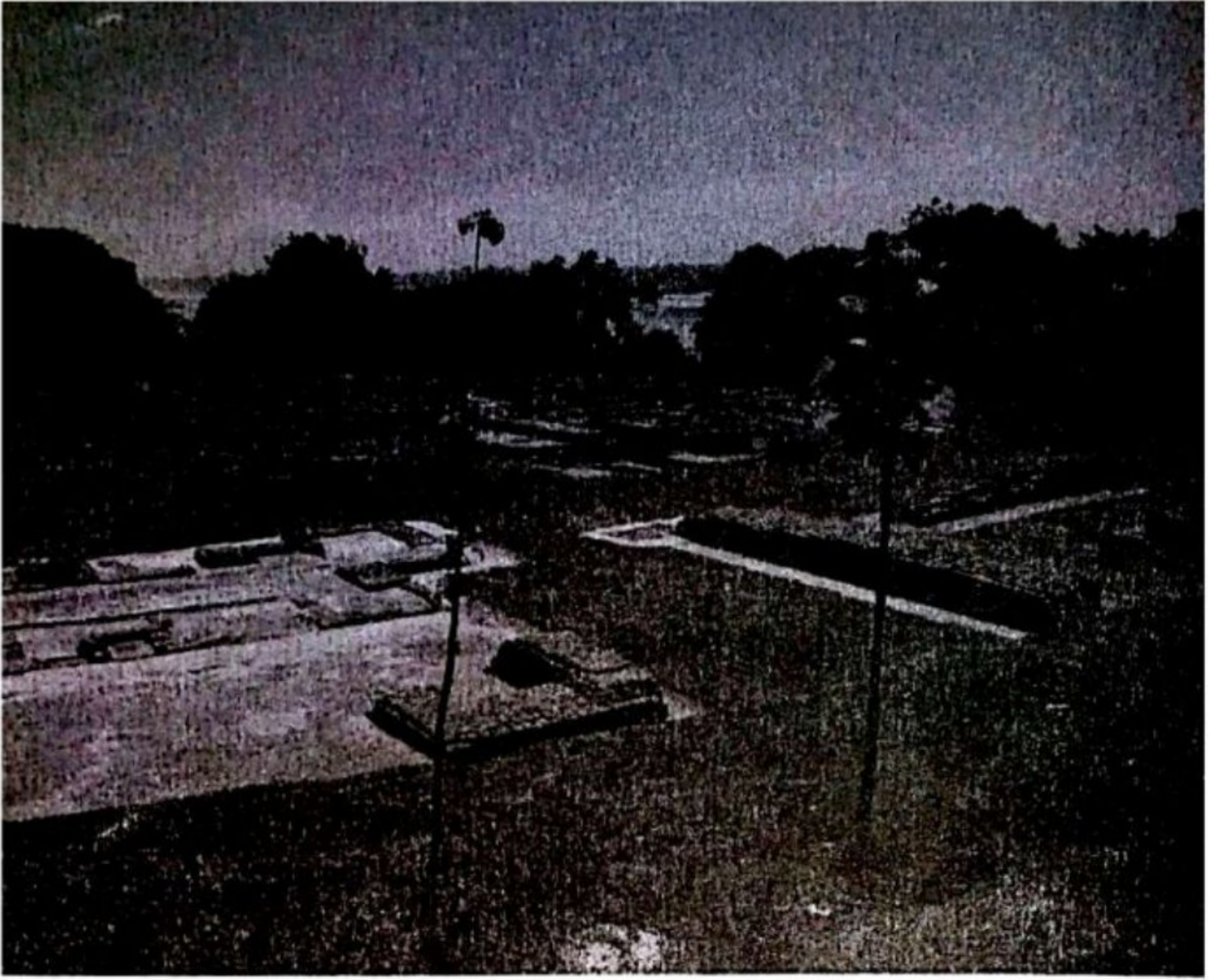
دریائے ماحون پر [جو دریائے دجلہ کا ہم رتبہ ہے] دونوں فریق نے لڑائی کی۔ سخت خوں ریزی اور جنگ ہوئی۔ لشکر اسلام پوری طاقت کے ساتھ لڑتا رہا، بالآخر فتح نصیب ہوئی اور مخالفین کا لشکر پامال ہوا[1]

جے چند کی دادی کمار دیوی کے نام سے سارناتھ میوزیم میں ایک کتبہ ہے، جس کی ۳۶ سطریں ہیں مگر صاف پڑھا نہیں جاسکا۔ اس کے دادا کا نام گوبند چند ہے۔ بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ بنارس کا محلّہ جیت پورہ جے چند ہی کے نام سے ہے۔

راجا بنار والی بنارس:

اس واقعہ کے بعد جب کہ شہاب الدین غوری غزنی[2] کی طرف مطمئن ہوکر

---

[1]: تاریخ ابن خلدون ج ۱۳ ص ۴۷

[2]: یہ خراسان کا ایک اہم شہر اور دو سو سال سے زائد عرصہ تک سلطنت غزنی کا دارالحکومت تھا۔ ع ب نعمانی

لوٹ چکا تھا اور بنارس قطب الدین ایبک کے ماتحت تھا۔ راجا جے چند کی وفات ہوئی اور اس کے بعد اس کا لڑکا ہریش چندر قنوج سے بھاگ کر بنارس آیا اور یہاں گہروار راجاؤں کی بنیاد ڈالی۔

اس قوم کا آخری راجا 'راجا بنار' ہوا۔ اس کا دارالسلطنت خاص بنارس تھا۔ گنگا اور برنا کے سنگم پر اس کے قلعہ کے نشانات اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں۔

حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کا تبلیغی قافلہ

ابھی بتایا گیا ہے کہ بنارس میں 'مسجد دو نیم کنگرہ' کی تعمیر ہوئی اور اس کے ضمن میں مسلم نو آبادیاں قائم ہوئیں اور پھر سلطان محمود غزنوی [متوفی ۱۰۳۰ء] کے حکم سے ۴۱۵ھ م ۱۰۲۴ء میں اجمیر میں سالار مسعود غازی کے والد بزرگوار سالار ساہو اجمیر سے کامل بیر کی مہم پر گئے۔ سالار ساہو ۴۰۱ھ میں قندھار اور ٹھٹھ کی راہ سے اجمیر آئے تھے اور یہیں ان کے فرزند دلبند سید سالار مسعود غازی کی پیدائش ۲۱ رجب ۴۰۵ھ م ۱۰۱۵ء میں ہوئی۔ یہ سلطان محمود غزنویؒ کے بھانجے تھے۔

جب محمود غزنوی سومنات[ل] کی مشہور مہم میں ہندوستان آئے تو سالار ساہو نے بھی اپنے نو عمر لڑکے سالار مسعود کو لے کر اس میں شرکت کی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں صوفیائے کرام اور مبلغین کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کی خدمت انجام پا رہی تھی۔

سالار مسعود اپنے ماموں کے ہمراہ غزنی جا چکے تھے۔ لیکن وہاں کے سیاسی حالات ناموافق نظر آئے۔ پھر یہ کہ محمود غزنوی کی زندگی کا آخری دور تھا۔ سالار مسعود غازی کے اقبال کا آفتاب طلوع ہونے کو تھا۔ انہی اسباب کے تحت سالار مسعود کا غزنی پایۂ تخت میں قیام ان کے دینی و تبلیغی مزاج کے خلاف تھا اس لیے دین حق کی خدمت اور

ل: یہ ہندوستان کے اہم وقدیم مندروں میں سے ایک مندر ہے جو ریاست گجرات کے سوراشٹر نامی علاقے میں کیراول بندرگاہ میں واقع ہے محققین کے مطابق اس کو قائم کرنے والے بذات خود چندر دیو ہیں۔ یہ مندر صدیوں سے مختلف حالات کا شکار ہو کر بنتا اور گرتا رہا ہے۔ موجودہ ڈھانچہ سردار ولبھ بھائی پٹیل [م ۱۹۵۰ء] کا ۱۹۴۸ء کا بنوایا ہوا ہے جسے یکم دسمبر ۱۹۹۵ء کو ملک کے نویں صدر جمہوریہ شنکر دیال شرما [م ۱۹۹۵ء] نے ملک کے حوالے کیا۔

ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

اشاعت کو ترجیح دیتے ہوئے محمود غزنوی سے اجازت لے کر غزنی سے ہندوستان روانہ ہوگئے۔ غزنی سے پہلے اجمیر آئے اور اپنے والد بزرگوار سالار ساہو سے ملاقات کے بعد اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنے تبلیغی مشن پر چل پڑے اور شیو پور، ملتان، اوچھ، اجودھن، دہلی، میرٹھ، گڑھ مکتیشر، قنوج، سنبھل، کڑا مانک پور، بلگرام، سترکھ وغیرہ مقامات پر تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مختلف راجاؤں نے ان کا مقابلہ کیا لیکن یہ فتحیاب ہوتے چلے گئے۔ مسلم بستیاں جو کچھ پہلے سے قائم تھیں، ان کی خبر گیری کی اور نئے آبادکاروں کو بسایا اور آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ بہرائچ پہنچ گئے۔ جہاں وہ خود نہ پہنچ سکے وہاں اپنے سپہ سالار اور نمائندے بھیجے۔ آخر میں ہندو سرداروں سے لڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۱۴ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۰۳۳ء کو جام شہادت نوش فرمایا۔ بہرائچ مدفن ہے جہاں بہت دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔

بنارس کے محلہ سالار پورہ میں واقع غازی میاں کا فرضی مقبرہ

سپہ سالار ملک افضل علوی

۱۰۲۹ء مطابق ۴۲۰ھ میں سید سالار مسعود غازی [غازی میاں] نے اپنے سپہ سالار ملک افضل علوی کو بنارس اور اس کے نواح میں دین کی تبلیغ واشاعت کی مہم پر بھیجا۔ ملک افضل علوی[1] کے ہمراہ بہت سے لشکری آئے جو بنارس میں شہید ہوے۔ جیسا کہ مرتب گنج ارشدی سید سالار مسعود غازی کے حالات میں لکھتے ہیں:

ملک افضل علوی را بطرف بنارس و نواحی آں رخصت نمودند، آنجا همه درجه بدرجه شهادت رسیدند۔ مقابرآنها در آنجا مشهوراند۔	ملک افضل علوی کو بنارس اور اس کے نواح میں تبلیغ کے لیے بھیجا، اس مقام پر وہ لوگ شہادت کے درجہ پر پہنچے۔ ان شہیدوں کی وہاں قبریں اب تک موجود اور وہاں پر مشہور ہیں۔ [ص ۱۰۹۴]

قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ راجا بنار والی بنارس [جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے] کے مقابلے میں بنارس آئے اور یہیں لڑ کر شہید ہوئے۔ جیسا کہ مرتب 'تاریخ صنم کدۂ بنارس' کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور اس کی تائید 'تاریخ المنو ان' کے مصنف کے درج ذیل بیان سے بھی ہو جاتی ہے کہ:

"بزمانہ سپہ سالار مسعود غازی ملک افضل بغرض فتح بنارس وملک علوی نائب آپ کے، وملک طاہر بمقام مئو، وملک

[1]: آپ کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لیے حضرت مصنفؒ کی دوسری کتاب 'تذکرہ مشائخ بنارس' کا مطالعہ فرمائیں ع ب نعمانی

مرداں بمقام شادی آباد غازی پور آئے تھے۔ مسعود غازی ستر کھ سے
پورب نہیں آئے، ملک طاہر کے ساتھ جو سپاہ تھی وہ سب غزنی اور
اطراف کی تھیں، وہی لوگ آباد ہوے۔"

مہاراجا بنارس کے قلعہ رام نگر کے کتب خانہ میں 'بلونت نامہ' کا جو قلمی نسخہ موجود ہے اس میں بھی سالار مسعود غازی کے اجا بنارس سے مقابلہ کا ذکر ہے اور درج ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید سالار مسعود غازی کی فوج بنارس میں داخل ہوئی:

مہاراجا بنارس کے قلعہ رام نگر کے کتب خانہ میں 'بلونت نامہ' کا جو قلمی نسخہ موجود ہے اس میں بھی سالار مسعود غازی کے راجا بنار سے مقابلے کا ذکر ہے اور درج ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید سالار مسعود غازی کی فوج بنارس میں داخل ہوئی:

درسنہ چھار صدوبست
ھجری سالار مسعود غازی
بحکم سلطان محمود
غزنوی بعزم جھاد برسرراجہ
بنار تاخت وتمام مملکت
اورابے چراغ ساخت۔ راجہ
بنار درحصار بنارس خزیدو
تامدتے دراز درقلعہ محصورو
قلعجیاں منکوب بودند، آخر
الا مروحسن سعی فوج
اسلام قلعہ مفتوح وقلعجیاں
مقتول شدند، درھمیں گیرو
دارفرزندان کتھومصر کہ
نوید فرمان روائے خویش ایں
انقلاب بکوش داشتند، سر
بفرمان حاکم اسلام نہادند واز
حسن خدمت روز بروز ترقی یافتند

۴۲۰ھ میں سالار مسعود غازی نے
سلطان محمود غزنوی کے حکم سے
جہاد کے ارادہ سے راجا بنار پر
چڑھائی کی اور اس کی تمام سلطنت
کو بے چراغ کردیا۔ راجا بنار
اپنے بنارس کے قلعہ میں گھس گیا
اور ایک مدت دراز تک قلعہ ہی
میں محصور تھا اور قلعہ دار بھی
پریشان تھے۔ آخر کار اسلامی فوج
کی کوششوں سے قلعہ فتح ہوگیا اور
قلعہ دار مقتول ہوگئے۔ اس دھر
پکڑ میں کتھو مصر کے لڑکوں نے اس
انقلاب کے بعد اپنے فرماں روا
کی خوش خبری پاکر حاکم اسلام کے
فرمان پر سر رکھ دیا اور اپنے حسن
خدمت سے روز بروز ترقی پائی۔

راجا بنار کا قلعہ گنگا اور برنا کے سنگم پر آج بھی موجود ہے اور آثار بھی یہی بتاتے ہیں کہ میدان کارزار یہیں گرم ہوا، وہاں شہداء کے مزارات کی کثرت ہے۔[1]

مسجد خواجہ بابا:

بنارس میں باہر سے جو تبلیغی قافلے اور داعیان اسلام تشریف لائے ان میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ [متوفی ۶۳۳] کے خلیفہ حضرت خواجہ نعیم کابلیؒ کا اسم گرامی بھی قابل ذکر ہے۔ آپ کو خواجہ صاحبؒ نے تبلیغ دین کے لیے بھیجا تھا۔ چناں چہ آپ نے سرزمین بنارس میں ۳۱ سال قیام فرما کر اپنے فرائض انجام دیے۔ محلّہ قاضی پورہ متصل بڑی بازار میں واقع یہ مسجد انہی کی طرف منسوب ہے اور مسجد ہی سے متصل آپ کا مزار بھی ہے۔ مسجد اب جدید تعمیر سے آراستہ ہو چکی ہے۔

مسجد گنج شہیداں:

یہ مسجد اسی دور میں تعمیر ہوئی۔ گو اس کے سال تعمیر کا اب تک پتہ نہ چل سکا[2] لیکن یہ تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اسی دور میں تعمیر ہوئی ــــــ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ مسجد امتداد زمانہ سے کھنڈرات کی تہہ میں دب گئی تھی۔ آج سے تقریباً ایک سو پچاس سال قبل جب انگریزی دور حکومت میں کاشی اسٹیشن کی تعمیر ہو رہی تھی تو یہ عالیشان مسجد کھنڈرات کی تہہ سے برآمد ہوئی۔ چوں کہ یہاں کثرت سے شہیدوں کی قبریں ہیں، اس لیے لوگوں نے اسے 'مسجد گنج شہیداں' کے نام سے موسوم کر دیا۔ اس مسجد کے پورب میں ایک حوض ہے[3] اس کے اوپر دیوار میں گولائی نما ایک

۱: یہ علاقہ 'راج گھاٹ' سے موسوم ہے۔ ع ب نعمانی

۲: بعض محققین نے اس کا سن تعمیر ۱۰۳۴ء متعین کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ع ب نعمانی

۳: افسوس کہ اب نہ تو حوض باقی ہے اور نہ ہی مذکورہ کتبہ۔ مسجد کے پوربی بیرونی حصے میں ایک پختہ عمارت کے اندر ایک مزار ہے جو انجان شہید کے نام سے مشہور ہے جن کا ہر سال ذیقعدہ کی ۱۲ر تاریخ کو عرس ہوتا ہے۔ ع ب نعمانی

مسجد گنج شہیداں: اندرونی حصہ

سفید چوکھٹے میں محراب اور مسجد کا مشرقی دروازہ جس کے پیش منظر میں انجان شہید کا نوتعمیر مقبرہ بھی نظر آرہا ہے۔ شہیدوں کے اس گنج میں صرف اسی ایک قبر کے آثار باقی ہیں۔ بقیہ سارے قبرستان پر جاہل اور پس ماندہ مسلمانوں کے چند گھر آباد ہیں۔

کتبہ لگا ہے جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

'... ہر کہ خون خود دہد ایں بالین سنگ را بشکند ... بخط مسعود قلبنی'

[جو اپنا خون دیتا ہے وہ اس پتھر کی پیشانی توڑتا ہے]

اس کتبہ سے بھی بظاہر یہی مطلب نکلتا ہے کہ میدان کارزار یہیں گرم ہوا اور یہ کتبہ مسعود قلبنی نے بطور یادگار لگوایا۔

مسعود قلبنی کے متعلق دریافت کرنے کی بہت کوشش کی گئی، لیکن اب تک پتہ نہ چل سکا کہ یہ کون تھے۔ مگر قرائن پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ملک افضل علویؒ کے لشکریوں میں سے ہی تھے۔

ملک افضل علوی کے ہمراہ بہت سے لوگ بنارس آئے اور ان میں جو لوگ

شہید ہوے ان کے مزارات آج تک موجود ہیں اور اکثر محلے جن میں ان کے مزارات ہیں ان شہیدوں کے نام سے ہیں۔محلّہ سالار پورہ میں ملک افضل علویؒ کا مزار ہے جو عرف عام میں علوی شہید کے نام سے موسوم ہے۔سر دست جتنے شہداء کے نام معلوم ہو سکے،ان کی تفصیل ذیل میں آرہی ہے:

ا۔ملک افضل علوی:

آپ بنارس میں حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے سپہ سالار تھے،جیسا کہ اوپر گزر چکا۔محلّہ سالار پورہ میں آپ کا مزار مبارک 'علوی شہیدؒ' کے نام سے زیارت گاہِ خلائق ہے۔

۲۔ملک سراج الدین قلیچی:

یہ بھی لشکریوں کے ہمراہ آئے تھے،محلّہ اورنگ آباد میں عالمگیر بادشاہ کی تعمیر کردہ پختہ سرائے کے قریب ہی ملک سراج الدین قلیچی کے نام سے ان کی قبر مشہور ہے۔

۳۔ملک محمد باقر:

آپ کے نام سے علوی شہید متصل سالار پورہ میں ایک محلّہ باقر کنڈ [جس کو بکریا کنڈ کہتے ہیں] واقع ہے۔اس محلّہ کی وجہ تسمیہ وہاں واقع ایک تالاب ہے جو آپ ہی کی طرف منسوب ہو کر باقر کنڈ کہلاتا ہے۔تالاب کے کنارے پچھم طرف بلند ٹیلے پر شاہ قطب علیؒ [متوفیٰ ۱۳۱۹ھ] اور شاہ صابر علی بنارسیؒ [متوفیٰ ۱۲۷۷ھ] کے قبے دار مقبرے بنے ہوے ہیں۔

حضرت ملک محمد باقرؒ کا مزار مبارک بھی وہیں بلندی پر تالاب کے اوپر واقع ہے اور باقر شہید کے نام سے موسوم ہے۔آپ بڑے مقدس اور جامع کمالات باطنی وظاہری تھے۔سید

سالار مسعود غازیؒ آپ کی بہت تعظیم کرتے تھے اور آپ کی نسبت مشہور ہے کہ راجا بنار کا قلعہ آپ ہی کی دعاؤں کی بدولت فتح ہوا تھا جیسا کہ تاریخ صنم کدہ بنارس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

مزار حضرت ملک محمد باقرؒ:
جس کے پیچھے حضرت شاہ قطب علیؒ کا مقبرہ بھی نظر آ رہا ہے۔

۴۔ ملک سید فخر الدین علویؒ:

آپ کا مزار محلّہ سالارپورہ میں ایک احاطہ کے اندر ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔ مزار مبارک پر قبہ ہے۔ احاطہ کے اندر بہت سی قبریں ہیں۔ احاطہ، مزار، گنبد، دروازہ و دہلیز کی مرمت و تعمیر آج سے ۶۰۰ سال قبل ضیاء الدین احمد حاکم بنارس نے ۷۸۰ھ مطابق ۱۳۷۷ء میں کرائی جو سلطان فیروز شاہ تغلق [متوفی ۱۳۸۸ء] کے وقت میں بنارس کے حاکم تھے۔

احاطہ مزار کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ، زینہ اور دہلیز ہے اور اس کی بیرونی دیوار پر کوفی رسم الخط میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

هوالعلّام
بناء گنبد و دہلیز روضہ سید — بعہد دولت فیروزشاہ اعظم بود
گذشتہ ہفت صد و ہشتاد از ہجرت — کہ مہر عقل ضیاء الدین بنا فرمود
۷۸۰ھ

← مزار و کتبہ و روضہ →
حضرت سید فخر الدین علوی شہیدؒ

۵۔ میران ناصر:

یہ لشکریوں کے کوتوال تھے، ان کا مزار 'سالار پورہ' کے قریب ہی ہے جو عوام میں 'بنا سی' کے نام سے مشہور ہے اور اسی نام سے یہ محلّہ بھی موسوم ہے۔ مزار کے سرہانے ایک پتھر نصب ہے، جس پر کچھ عبارت تحریر تھی، لیکن اب مٹ گئی ہے۔

۶۔ مسجد ایک کھمبا [بٹو شہید]:

اصلی نام معلوم نہیں، یا ممکن ہے یہی اصلی نام ہو۔ محلّہ ترلوچن[۱] میں بھارگو بھوشن پریس کے پیچھے دکھن جانب آپ کا مزار ہے۔ مزار کی عمارت کی چھت ایک ہی ستون پر ہے۔ لوگوں نے اس مزار کی عمارت کو مسجد کی حیثیت دے دی ہے اور اس کو یک کھمبا مسجد کہتے ہیں۔ اس مزار کی عمارت کو ۷۷۹ھ م ۱۳۷۷ء میں ضیاء الدین حاکم بنارس کے بیٹے نے بنوایا اور اس پر ایک کتبہ بھی نصب کرایا، لیکن اب یہ کتبہ عمارت سے علیحدہ ایک چبوترے پر نصب ہے، جس پر کوفی رسم الخط میں قطعہ تاریخ درج ہے[۲] افسوس کہ یہ کتبہ بھی تقریباً مٹ چکا ہے، بڑی دقتوں کے بعد فوٹو حاصل کر کے پڑھا جا سکا۔ عبارت یہ ہے:

بعہد دولت فیروز شاہ قلعہ کشائے　　اساس روضہ بٹو شہید بر پائے

بناء نہاد علم دین عالم ابن ضیاء　　بسال ہفت صد ہفتاد و نہ زعون خدائے ۷۷۹ھ

یہ تو چند شہیدوں کے نام ہوئے، لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور بنارس کے مختلف محلے ان شہیدوں کے نام سے بسے ہوئے ہیں۔ جیسے میر واحد عرف محمد شہید کے نام سے محلّہ محمد شہید آباد ہے اور اسی محلّہ میں لب سڑک آپ کا مزار بھی مشہور ہے۔ محلّہ ٹھٹھیری بازار میں بابر شہید کا، چوک تھانہ سے متصل لب سڑک محمد زاہد عرف مرد شہید کا اور

۱: مچھودری سے متصل یہ محلّہ واقع ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ترلوچن کے معنیٰ ہیں تین آنکھ والا۔ یہ ایک دیوتا کا نام ہے۔ اس کے نام سے اس علاقہ میں مندر بھی ہے اور گھاٹ بھی۔ یہ محلّہ بھی اسی کی منسوب ہو کر ترلوچن کہلانے لگا۔ ع ب [بحوالہ مرقع بنارس، ص ۳۲۳]

۲: افسوس کہ کچھ اپنوں کی کوتاہی، کچھ غیروں کی عیاری کے نتیجے میں اب نہ تو وہاں چبوترہ ہے اور نہ ہی کتبہ۔ ع ب نعمانی

محلّہ قطبن شہید میں قطب الدین شہید کا مزار واقع ہے۔

تاریخ صنم کدۂ بنارس کے مصنف نے ان تمام شہیدوں کو ملک افضل علویؒ کے رفقاء اور لشکریوں میں قرار دیا ہے۔

نور بافانِ بنارس

پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت سید سالار مسعود غازی [متوفی ۴۲۴ھ] نے بنارس اور اس کے نواح میں حضرت ملک افضل علویؒ کی سرکردگی میں اپنا تبلیغی قافلہ بھیجا اور راجا بنارس سے مقابلہ ہوا، ان کے رفقاء میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اور جو لوگ زندہ رہے وہ بنارس ہی میں رہ گئے اور یہاں انہوں نے رزق حلال جان کر ریشم کے کپڑے بننے کا کام اختیار کر لیا۔ چوں کہ یہ حضرات اپنی نیکی، دین داری اور شرافت خاندان کی بنا پر دوسری قوموں سے ممتاز تھے، اس بنا پر ان کو مومن اور 'شیخ' کے نام سے شہرت ہوئی، انہیں کی نسلیں بنارس میں بڑھیں اور دوسرے اطراف میں بھی منتقل ہوئیں۔ پھر ان کو 'نور باف' کہا جانے لگا جو کئی صدیوں تک ان کا خطاب رہا اور اب بھی قدیم شاہی فرامین میں نور باف ہی لکھا ہوا موجود ہے۔

علم الانساب کی کتابوں اور ہندوستان کے قدیم تاریخی دستاویز وں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نور باف ایک بڑی تعداد میں بنارس، جون پور، غازی پور، اعظم گڑھ کے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ لیکن یہاں کی دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط اور میل جول سے اب خاندانوں کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تقریباً ۹۰۰ سال پہلے سے 'پارچہ ریشم' بننے کا سلسلہ یہاں اب تک قائم ہے اور نسلاً بعد نسلٍ ہوتا آیا ہے اور اب اس کی ایک مستقل تاریخ بن گئی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کا وجود یہاں سلطان محمود غزنوی ہی کے وقت سے ہے اور مسلمان بہر حال غیر ملکوں سے آئے ہیں۔ اس لیے ان

کے انساب کا پتہ لگانا مشکل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کے جی میں جو آیا اپنی نسبت ادھر کر دی۔

موجودہ نور باف اپنے کو انصاری کہتے ہیں۔ حالاں کہ انصار سے مراد صرف اولاد انصار ہی ہو سکتے ہیں اور ہندوستان میں انصار کے خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر نور باف انصار ہی سے ہو، کیوں کہ ابتداء میں جن لوگوں نے اس پیشہ کو اختیار کیا وہ لوگ علوی اور سید تھے اور موجودہ نور بافوں کا ان سے تعلق بھی ظاہر ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ ۹۰۰ سال سے بنارس کی سرزمین کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے موجودہ نور بافوں کا سلسلہ ان حضرات سے ہونا زیادہ قریب قیاس ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں کسی تاریخی شہادت کے نہ ہونے کی بنا پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا بھی ناممکن ہے۔

باقی رہا لفظ جولاہہ کا انتساب، تو اس کے معنیٰ فارسی زبان میں پارچہ باف کے ہیں جب کہ اس کا صحیح تلفظ 'جولاہ' ہے جیسا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ [متوفی ۶۷۲ھ] نے فرمایا ہے:

شاہ را گوید کسے 'جولاہ' نیست　　این نہ مدح ست بلکہ مدح آگاہ نیست

یہ صرف پارچہ بافی کی بنا پر ہے۔ اس خطاب کا نسب اور خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے نام و نسب کی برتری اور خاندانی فرق کا خاتمہ آج سے بہت پہلے ہی کر دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم　　بیشک اللہ کے نزدیک تم میں کا سب سے با عزت
(الحجرات:۱۳)　　وہی ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

بنارس میں نور بافی کی اس قدیم صنعت کو شاہان مغلیہ نے بڑی ترقی دی اور اعلیٰ اقسام کے کپڑے ان کی طرف منسوب ہوئے۔ مثلاً پارچہ گلبدن۔ یہ ریشمی تھان کی ایک

اعلیٰ قسم تھی جو گلبدن بیگم ہمایوں کی ملکہ کے نام سے منسوب ہوئی۔اسی طرح پارچہ محمودی، جو کہ سلطان محمود ملک الشرق فرمانروائے جونپور و بنارس کے نام سے منسوب ہوا۔ان کے علاوہ ریشمی کپڑوں کی مختلف اقسام کے نام بھی شاہان مغلیہ ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔مثلاً زربفت،زری،کمخواب،اطلس،سنگی،چیرہ وغیرہ وغیرہ۔

کپڑوں کے لحاظ سے بنکروں میں بھی فرق مراتب تھا۔جن اعلیٰ قسم کے کپڑوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے بننے والوں کو نورباف، سفید ریشمی تھان بننے والوں کو قالین باف اور سوتی کپڑوں کے بننے والوں کو حائک کہا جاتا تھا۔یہ بنکر بنارس شہر اور اس کے مضافات میں خاصی تعداد میں آباد تھے اور ہندو مسلم دونوں کو ان ہی القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔بنارس سے یہ کپڑے تیار ہو کر ہندوستان اور باہر کے طول وعرض میں پہنچ جاتے تھے،جب کہ ذرائع ارسال اور وسائل بھی محدود تھے۔یہاں خرید وفروخت کی ایک زبردست منڈی تھی،اور جس طرح آج کے زمانے میں دلالوں کے ذریعہ مال کی خرید وفروخت رائج ہے اس زمانے میں بھی یہی طریقہ تھا۔

بنارس میں نوربافوں کی قدیم آبادی دو علاقوں میں منقسم ہے،مدنپورہ اور علوی پورہ۔اور ان نوربافوں کے بہت سے ایسے قدیم خاندان موجود ہیں جن کے پاس مغل بادشاہوں کے متعدد فرامین موجود ہیں۔ان میں سے بعض میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک محضر نامہ کا ذکر ناگزیر ہے جو مہتو نذیرالدین صاحب[1] [سربراہ باونی پنچایت] مدنپورہ کے پاس موجود ہے،جس پر ۲۲/رجب ۱۰۸۸ھ مطابق ۱۶۷۸ء درج ہے۔اس محضر نامہ کا پس منظر یہ ہے کہ اس زمانے میں دلالوں نے اپنی دلالی میں خوب اضافہ کر کے بنکروں کو بے حد پریشان کر دیا تھا جس سے اس کاروبار پر زبردست اثر پڑ گیا گیا تھا۔چنانچہ آپسی اتفاق سے ایک محضر نامہ تیار ہوا جس پر بنارس کے تمام ہی محلوں کے نوربافوں نے دستخط کر کے یہ معاہدہ کیا کہ ہم لوگ مال خود خریدیں گے اور بیچیں

---

[1] افسوس کہ مہتو صاحب بتاریخ ۲۰/۱۲/۲۰۰۸ء اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ع ب نعمانی

گے، دلالوں کو نہیں دیں گے۔ محضر نامہ کا مضمون یہ ہے:

'مایاں ہمہ نوشتہ مید ہم کہ اگر احیاناً از مایاں احدے تھان بدست ہندو دلال وترکی دلال بدہد گناہ گار باشد، وجرمانہ پنجاہ روپیہ بدہد۔''

اسی ضمن میں اس زمانے میں بنارس کے کچھ محلوں کی فہرست قابل دید ہے:

سلیم پور	لعل پور	چھجو پور	حیدر پور
قاضی کی منڈولی	ڈھول پور	اسپس سرائے	محلّہ قلعہ
چھتن پورہ	دوسی پورہ	لکسہ	عبداللہ پور کلاں
باغیچہ قاضی خواجہ	مبارک پور	سرائے کہنہ	دانیال پور
جیت پورہ	شکور آباد	قاضی پورہ	رسول پورہ
اوری پورہ	محسن پورہ	چندو پور	حاجی پورہ
رام دت پورہ	سرائے اودھو	سیدی پور	سرائے نصیر خاں
لوتل پور	ماناں پور	بھیلو پور	موضع اکھتا
موضع کونیہ	بدی پورہ	کماپورہ	بدکانو
موضع غوث پور	موکی پورہ	محلّہ دور	سرائے شیخ انبیاء
موضع تاج پور	کتواپورہ	راماپورہ	موضع آغاپورہ
موضع امین پور	شیخ پورہ	موضع آدم پورہ	لوہتہ
کرت محمد	موضع مخدوم پور	موضع سرہری	بھلوریا
نرہر پورہ	للا پورہ	ہولی پورہ	اتھم پرو
کاشی پورہ	سین پورہ	کلیان پورہ	سہابن پور
شعبان پورہ	لوہتک	کوٹوا ان	مدن پورہ
منڈی قاضی	سنار پورہ	شیخ پورہ	قاضی سعداللہ پورہ

جگجیون پور　　　دھنی پورہ　　　جبلا پورہ　　　حسن پورہ

ناصر پور

ان محلوں میں اکثر محلے بدستور اپنے پرانے نام سے موسوم ہیں، جب کہ بعض محلوں کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ ان کی جگہ نئے محلے آباد ہو گئے ہیں۔
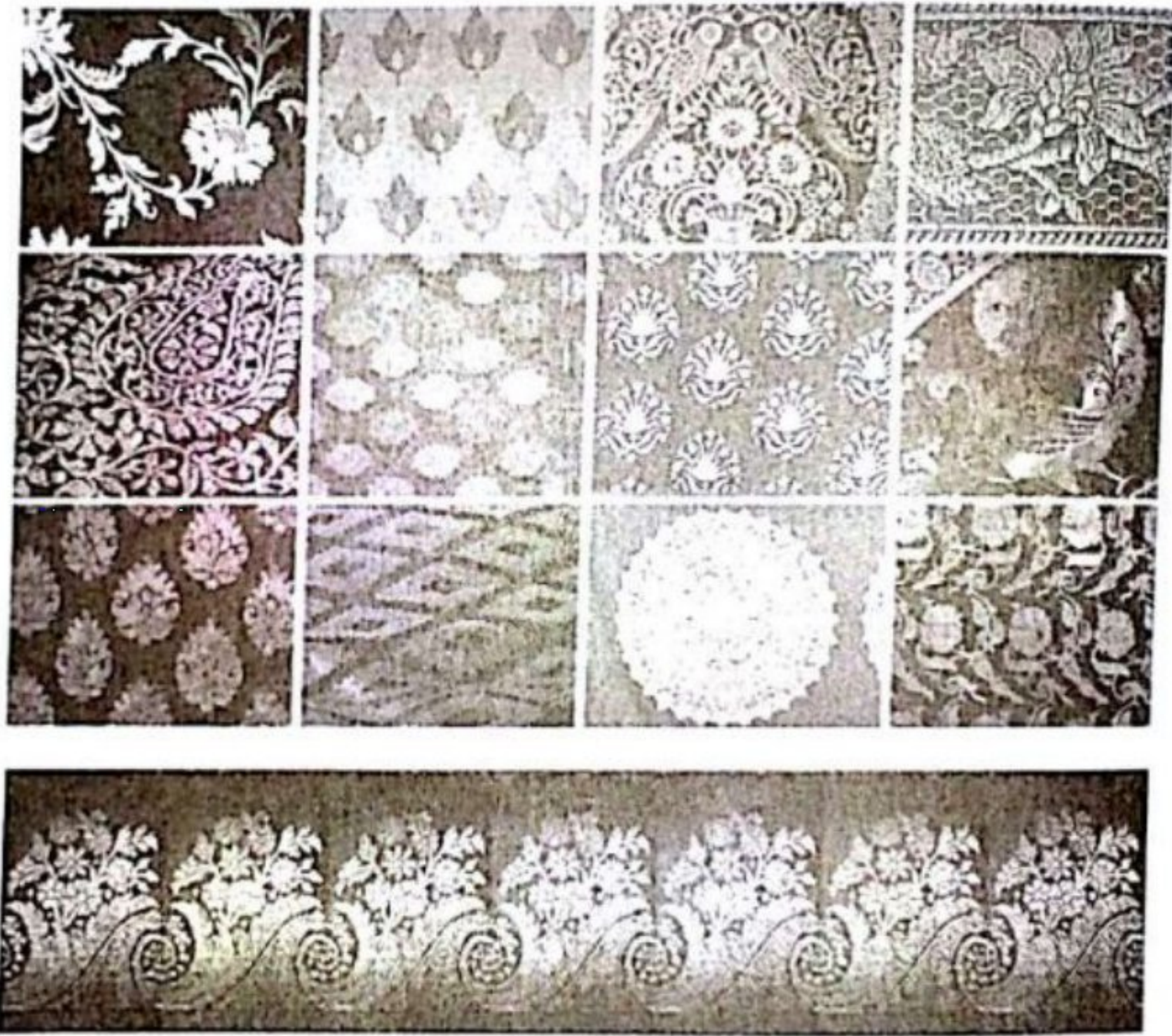
نور بافی کے چند نمونے
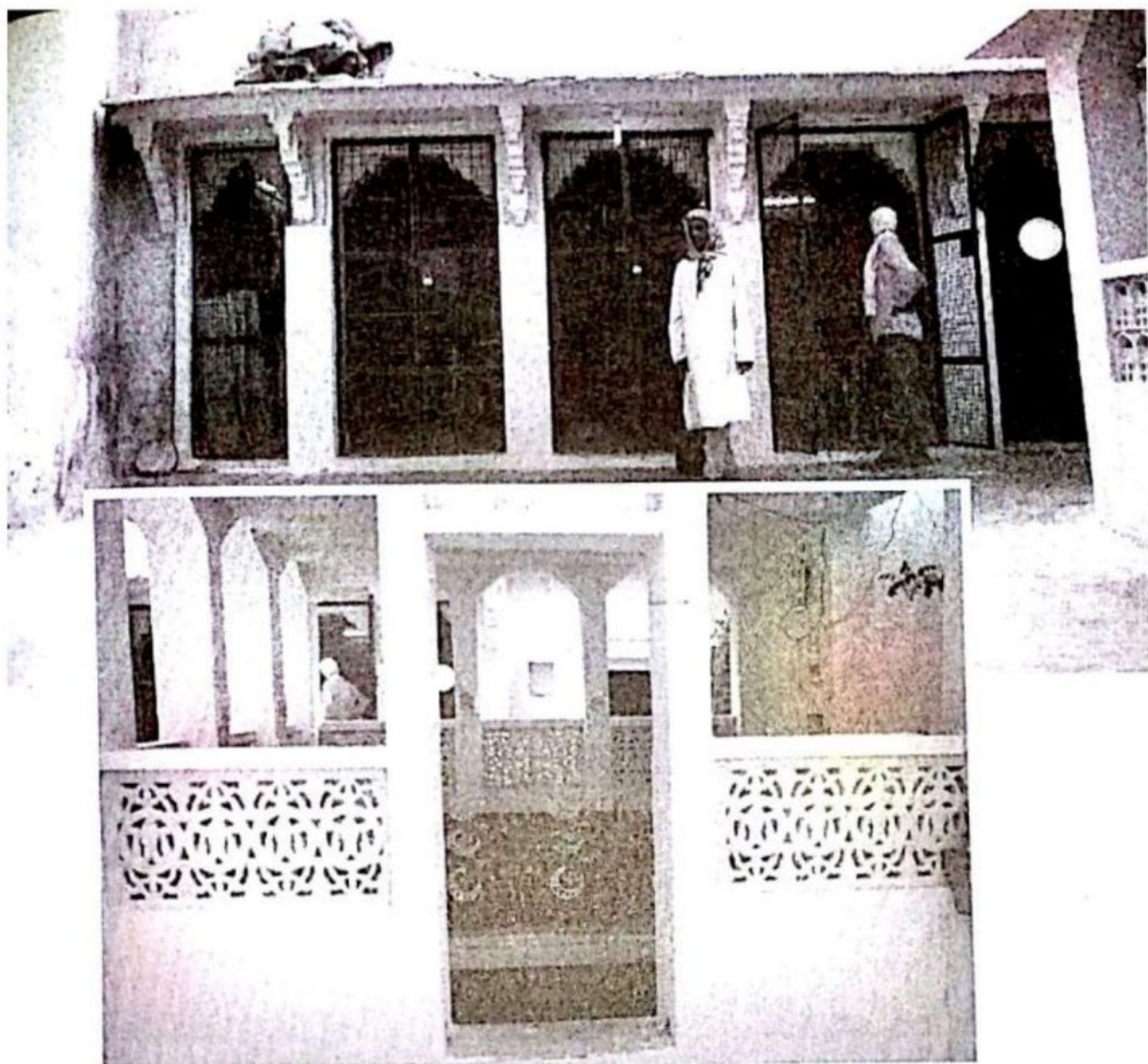
مسجد و مقبرہ حاجی محمد ادریس حاکم بنارس:
واقع محلہ حاجی درس [مچھودری] تصویر متعلقہ صفحہ ۱۰۸ و ۱۰۹
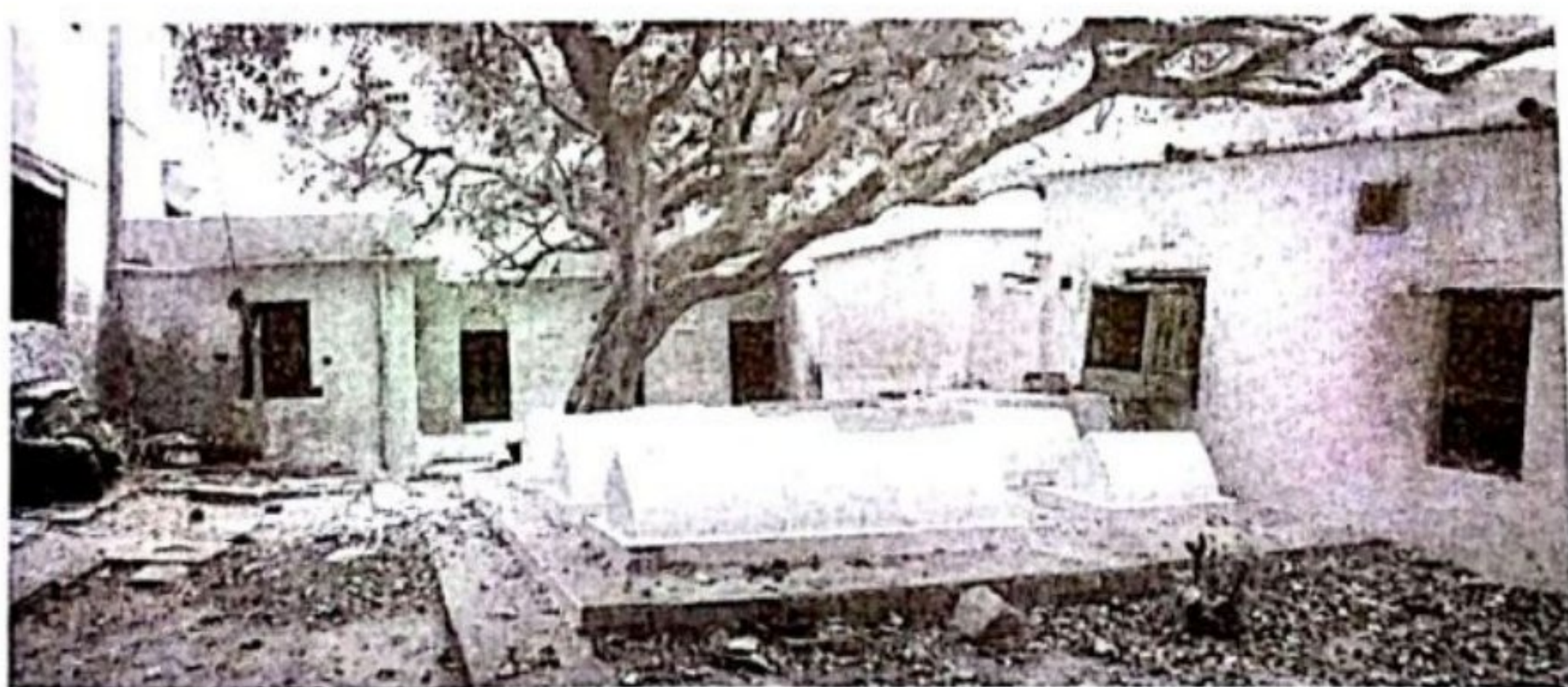
اسی محلہ میں واقع ایک دوسری مسجد اور اس کے احاطہ میں موجود قبریں۔ تصویر متعلقہ صفحہ ۱۰۹

غزنوی دورِحکومت کا خاتمہ اورغوری سلطنت کی ابتدا

غوری سلطنت سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔جس کی بنیاد غزنوی سلطنت کے کھنڈر پر قائم ہوئی ہے۔غیاث الدین غوری نے ۵۶۷ھ مطابق ۱۱۷۳ء میں غزنی کو مستقل طور پر فتح کرلیا اوراپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین غوری [مقتول ۱۲۰۶ء] کوسلطان معزالدین کا خطاب دے کرغزنی میں تخت پر بٹھایا۔یہ اگرچہ اپنے بھائی کا نائب تھا لیکن اس نے غزنی میں ایک آزادحکمراں کی حیثیت سے حکومت کی۔پھر اپنے بھائی شاہ غیاث الدین کی ۱۲۰۲ء میں وفات کے بعد اسی وقت سے پوری سلطنت کا مالک بنا۔

سلطان قطب الدین ایبک [متوفی ۱۲۱۰ء] جوکہ شہاب الدین غوری کا نامور ترک سپہ سالار اور ہندوستان میں اسلامی مساوات واخوت کا ایک روشن مینار تھا۔اگرچہ وہ غلام ترک تھا،لیکن غلاموں کی صف سے نکل کر سلاطین کے تخت پر جا بیٹھا۔اس کے بعد غلام درغلام دہلی کی سلطنت پر بیٹھتے گئے۔قطب الدین پہلی مرتبہ ترکستان سے نیشاپور لایا گیا جسے ایک سوداگر نے خرید کرسلطان شہاب الدین غوری کے دربار میں گراں قیمت پرفروخت کیا تھا اور وہ یہیں اپنی ٹوٹی ہوئی کف انگلی کی وجہ سے ایبک کے نام سے مخاطب کیا گیا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے قنوج کی لڑائی کے بعد قطب الدین ایبک کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور دے دی،جو بعد میں غلام حکومت کے بانی کے طور پرمشہور ہوا۔

والی قنوج جے چند نے پرتھی راج چوہان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے جب سلطان شہاب الدین غوری سے مقابلہ کی تیاری کی تو قبل اس کے کہ شہاب الدین کا اس سے مقابلہ ہوتا، قطب الدین ایبک نے پہلے ہی قنوج پر حملہ کر دیا اور دوران جنگ جے چند کی آنکھ میں جب تیر لگا اور اسی لڑائی میں جے چند مارا گیا تو اب چوں کہ قطب الدین ایبک کی راہ روکنے والا کوئی موجود نہ تھا، اس لیے وہ مختلف علاقوں کو فتح کرتا ہوا بنارس تک قابض ہو گیا اس طرح بے شمار دولت اس کو ہاتھ لگ گئی۔

سید جمال الدین صوبہ دار بنارس:

۱۱۹۳ء میں شہاب الدین محمد غوری نے راجا جے چند والی قنوج کو شکست دے کر بنارس پر قبضہ کر لیا اور سید جمال الدین نامی شخص کو صوبہ بنارس کا صوبہ دار مقرر کیا۔ محلہ جمال الدین پورہ جو علوی پورہ ہی کا ایک حصہ ہے، انہی کے نام سے موسوم ہے اور اسی محلہ میں ان کا مقبرہ بھی ہے جو عوام میں 'شاہی مزار' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ محلہ بڑی بازار کے قریب ہے۔ اس عہد حکومت میں بنارس کا کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں۔

شہاب الدین غوری خود تو ہندوستان میں نہ رہا، لیکن اپنے غلام قطب الدین ایبک کو یہاں کا نائب سلطنت مقرر کرتا گیا۔ یہی قطب الدین ہے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ایسی سلطنت قائم ہوئی جو سات سو برس تک رہی۔ قطب الدین چوں کہ غلام تھا اس لیے تاریخ میں اس کے بعد کے بادشاہ غلام خاندان کی طرف منسوب ہوے اور چھوٹے بڑے ملا کر دس بادشاہ ہوے جن میں شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن بہت مشہور ہوے۔
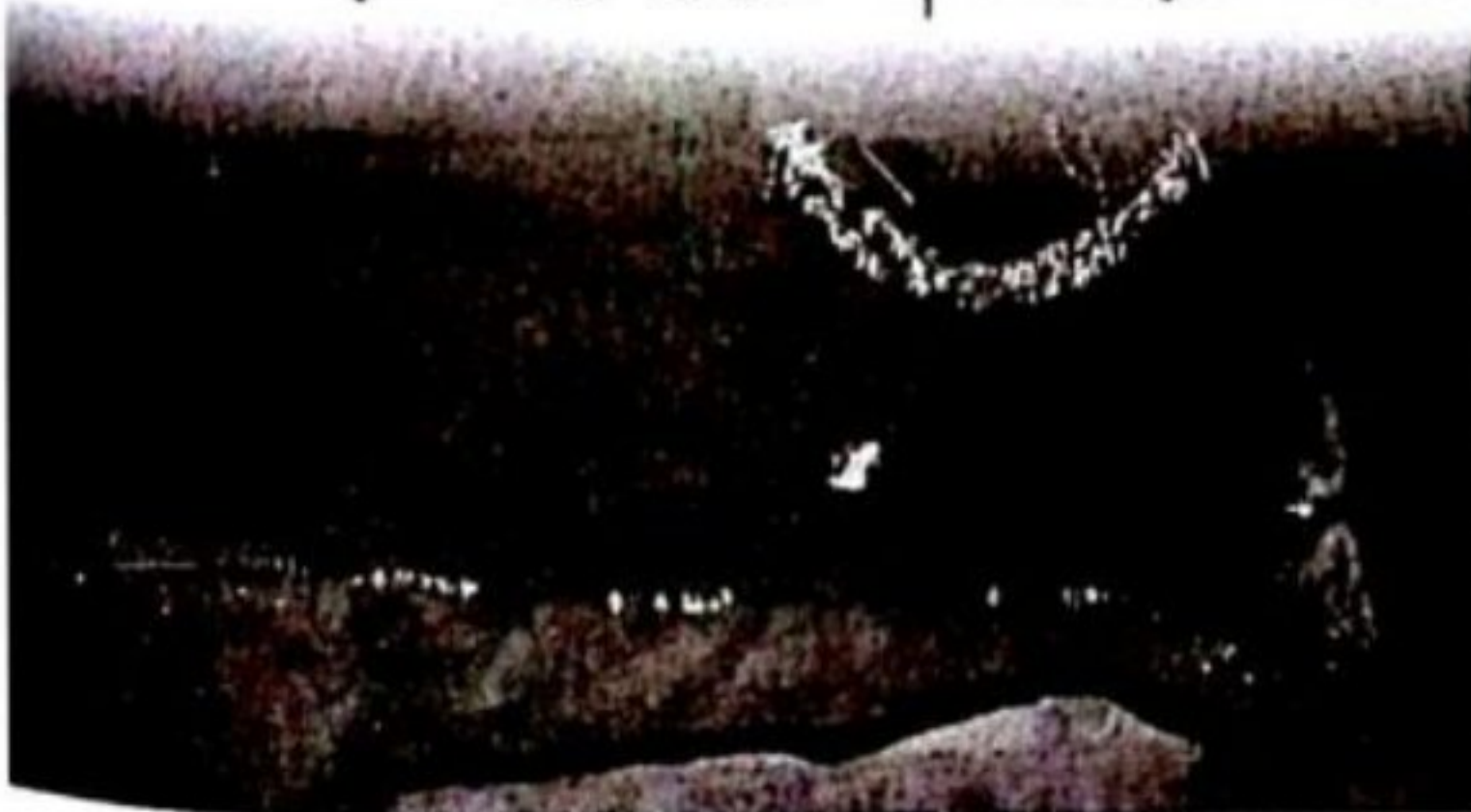
سلطان شمس الدین التمش کا دورِ حکومت اور بنارس

سلطان قطب الدین ایبک کا بیٹا آرام شاہ[1] ۶۰۶ھ م ۱۲۱۰ء میں اس کا جانشین ہوا۔ لاہور دار السلطنت کے فوجی افسروں نے ایبک کی وفات کے بعد اس کی بادشاہی کا اعلان لاہور میں کیا۔ مگر قسمت اس کے منصب کے لیے ایک دوسرے نوجوان کو منتخب کر چکی تھی جس کا نام شمس الدین التمش ہے۔ دلی کے فوجی افسروں نے اس کو مدعو کر کے تخت پر بٹھایا۔ یہ قطب الدین ایبک کا داماد بھی تھا۔ آرام شاہ نے ۶۰۷ھ م ۱۲۱۱ء میں دلی پر فوج کشی کی، مگر وہ لڑائی میں مارا گیا۔

التمش نے اپنے دورِ حکومت کے بہت سے حریفوں اور مخالفوں پر نظر دوڑائی اور ان کا قلع قمع کرنے کے لیے حکمت عملی سے کام لیا۔ بالآخر اپنے دورِ حکومت میں مغرب کی شوالک پہاڑی سے مشرق میں بنارس تک قبضہ کر لیا اور ان کے انتظام میں مصروف ہوا[2]۔

---

[1]: یہ نہایت نااہل و آرام طلب تھا جس کی وجہ سے 'آرام شاہ' سے مشہور ہوا۔ اپنی نالائقی ہی کی وجہ سے نظام حکومت سنبھال نہ سکا۔ بالآخر دہلی کے ترکوں نے شمس الدین التمش کو بادشاہ منتخب کر کے آرام شاہ کو ایک سال کے اندر ہی اندر نہ صرف تختِ حکومت بلکہ دنیا سے بھی رخصت کر دیا۔ ع ب نعمانی

[2]: التمش دہلی کی غلام سلطنت کا تیسرا حکمراں اور قطب الدین ایبک کا غلام تھا۔ اس کی صلاحیت و ہونہاری کی بنا پر قطب الدین ایبک نے اسے اپنا داماد بھی بنا لیا تھا۔ یوں تو اس نے دورانِ حکومت کئی علاقوں کو فتح اور متعدد باغیوں اور سرکشوں کو اپنا مطیع بنایا ہی اس کے علاوہ تعمیرات بھی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کی تعمیرات میں دہلی کی 'مسجد قوت الاسلام' کا قطب مینار [جسے قطب الدین ایبک صرف بنیادی منزل کو بنوا سکا تھا] اس کی تین منزلیں اور خود 'مسجد قوت الاسلام' کی توسیع خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ آخر عمر میں اس نے اپنا جانشین اپنی بیٹی رضیہ سلطان [متوفیہ ۱۲۴۰ء] کو بنایا اور مورخہ یکم مئی ۱۲۳۶ء کو دہلی میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ مدفن دہلی میں مہرولی علاقہ میں واقع ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

حاجی محمد ادریس حاکم بنارس

اب جبکہ سلطان قطب الدین ایبک [متوفی ۱۲۱۰ء] کی سلطنت کا تختہ ہی پلٹ گیا تھا اور سلطان شمس الدین التمش [متوفی ۱۲۳۶ء] کی حکومت کا سکہ چل رہا تھا۔ سلطان نے بنارس شہر کو صوبہ بنارس کا دارالسلطنت مقرر کیا۔ التمش نے بنارس کا حاکم کس کو بنایا؟ یہ تو پتہ نہیں، البتہ اس کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن [متوفی ۱۲۸۷ء] نے ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء میں حاجی محمد ادریس کو بنارس کا صوبہ دار بنایا۔

اس دور حکومت کے چند اہم واقعات:

[۱] حاجی محمد ادریس ایک زندہ دل وعلم دوست آدمی تھے اور سیر وسیاحت کا بھی زیادہ شوق تھا۔ جس زمانے میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے حرمین شریفین کا سفر کیا اسی زمانے میں بغرض سیاحت شیراز گئے۔ وہاں شیخ سعدی شیرازیؒ [متوفی ۶۹۱ھ] بھی موجود تھے۔ حاجی صاحب نے شیخ سعدیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کی مشہور تصانیف 'گلستاں'، 'بوستاں' وغیرہ کی نقل لے کر بنارس آئے اور یہیں سے ان کتابوں کے پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہوگیا۔

گلستاں کا یہ قدیم نسخہ سید مہدی حسن صاحب تحصیل دار بنارس نے تقریباً ۶۰۰ سال کے بعد ۱۸۴۸ء م ۱۲۶۵ھ میں نواب علی ابراہیم خاں بہادر، سابق جج بنارس کے کتب خانہ میں ان کے نواسے جناب نواب عنایت حسین خاں کے ذریعہ دیکھا تھا جو نہایت پارینہ اور کرم خوردہ ہوگیا تھا۔

نواب علی ابراہیم صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا مزید تذکرہ انگریزوں کے دور حکومت کے ضمن میں اس کتاب کے آخر میں آئے گا۔

[۲] حاجی محمد ادریس کے نام سے مچھودری پارک میں بھارگو بھوشن پریس کے پیچھے ایک محلّہ 'حاجی درّس' کے نام سے مشہور ہے جہاں مسلمانوں کی خاصی آبادی تھی لیکن اب نہیں ہے۔

وہاں کئی مسجدیں اور قبریں ہیں جو اسی دور کی ہیں۔ [ان مسجدوں اور قبروں کی تصاویر صفحہ ۴۰۱ پر ملاحظہ فرمائیں]

[۳] حاجی محمد ادریس نے بنارس میں رفاہ عام کے بھی کام کیے ہیں۔ ان میں سب سے اہم کارنامہ اس پختہ و سنگیں کنویں[۱] کی تعمیر ہے جو محلّہ انصار آباد میں حضرت میر آفرینؒ[۲] کے مزار سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ وہیں ایک احاطہ کے اندر آپ کا مزار و مقبرہ بھی ہے۔ جس کے لب سڑک کنواں ہے اور اس کنویں کے ہر چہار جانب سہ دری آپ کی یادگار ہے۔ کنواں دو منزلہ ہے، سہ دری کے بیرونی جانب کلمہ طیبہ اور آیۃ الکرسی کندہ ہے۔ تینوں دروں پر کتبے لگے ہوئے ہیں جن کی عبارتیں اتنی مٹی ہوئی ہیں کہ بڑے تفحص و تامل کے بعد پڑھی جا سکیں۔ کتبہ یہ ہے:

فرحت افزا بود جائش ...... منظرش طور و دل نشیں خواہ

ایں ندا گفت ہاتف ...... باغ و رواق و چاہش زیبا

کوثری .... تشنہ شدند ہاتف زغیب گفت ساقی 'مشکل کشا' ۱۱۷ھ

---

۱ یہ کنواں اب سے چند دہائیوں قبل تک آباد تھا لیکن افسوس کہ پہلے تو وہ ناجائز قبضے کا شکار ہوا، بعد میں اس علاقہ کے ایک متمول نے بجائے اسے آزاد کرانے کے، خرید لیا۔ اب وہ اسی شخص کا مقبوضہ و مملوکہ، ویران و غیر آباد ہو کر رہ گیا ہے۔ ع ب نعمانی

۲ آپ کا مستقل تذکرہ حضرت مصنفؒ کی دوسری کتاب 'تذکرہ مشائخ بنارس' میں ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی

کنویں کا سال تعمیر ۷۱۱ھ م ۱۳۱۱ء معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ حاجی محمد ادریس کی حکومت ۶۹۰ھ تک ختم ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدت حکومت ختم ہونے کے بعد انہوں نے تعمیر کرایا۔

[۴] 'گلستاں'، 'بوستاں'، کے قلمی نسخوں کے آنے کے بعد بنارس میں دہلی کی مرکزی حکومت کی جانب سے شاہ غیاث الدین بلبن [متوفیٰ ۱۲۸۷ء] نے کئی مدرسے تعمیر کرائے اور دوسرے شہروں، حتیٰ کہ دوسرے ملکوں میں بھی اسلامی درس گاہوں کا قیام ہوا۔ چناں چہ ہندوستان کے حکمرانوں میں یہی وہ بلند حوصلہ بادشاہ ہے جس کے نام سے مکہ معظّمہ میں ایک مدرسہ موسوم ہوا جسے قائم کرنے کے لیے اس نے زرِ خطیر روانہ کیا۔ غیاث الدین بلبن کے قائم کردہ کچھ اور مدرسے بھی ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ 'اعلام' اور 'شفاء الغرام' تاریخ مکہ میں موجود ہے۔

عزیز الدین حاکم بنارس

۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۶ء میں سلطان علاؤ الدین خلجی [متوفیٰ ۱۳۱۶ء] نے عزیز الدین کو بنارس کا حاکم مقرر کیا۔ اس حاکم کے زمانے میں بنارس میں 'پلنگ پیڑھی' کی رسم جاری ہوئی جو ہر سال سید سالار مسعود غازیؒ کے میلہ کے موقع پر بہرائچ جاتی ہے۔

پلنگ پیڑھی کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ سید جمال الدین ساکن قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی کی لڑکی مسماۃ زہراء نابینا تھی۔ اسے سید سالار مسعود غازیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ حکمت خداوندی سے ایک روز اچانک زہراء کی آنکھ روشن ہوگئی۔ اس نے خود بہرائچ جاکر سید سالار مسعود غازیؒ کا روضہ تعمیر کرایا اور تعمیر کے بعد جلد ہی وفات کر گئی اور وہیں مدفون ہوئی۔ اس کی ماں کو بڑا صدمہ ہوا، چنانچہ اپنی تسکین کے لیے ہر سال رودولی سے اپنی بن بیاہی بیٹی کے لیے پلنگ پیڑھی لے کر بہرائچ جاتی تھی اور اپنی ناقص عقل میں

اس کو سامان شادی اور جہیز تصور کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ رسم وہاں سے بنارس اور دوسرے شہروں میں رائج ہوگئی اور آج تک یہ رسم ادا کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے۔ [گنج ارشدی ص ۱۹۶ قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور]

عبدالرزاق حاکم بنارس

خاندان خلجی[1] کے دور حکومت میں ہندوستان کے بہت سے صوبے خودمختار ہو گئے تھے، آگے چل کر یہ خاندان ہی ختم ہوگیا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ مبارک شاہ[2] ہے اسی کے دور حکومت میں عبدالرزاق حاکم بنارس تھے جن کا مزار گنگا کے کنارے اسی نام سے مشہور ہے۔ مزار سیلاب میں ایک بار منہدم ہوگیا تھا۔ اب مسلمانوں کی توجہ سے دوبارہ بن گیا ہے اور اس کی باہری دیوار پر ایک کتبہ کوفی رسم الخط میں تحریر ہے جس کی عبارت کچھ اس طرح ہے:

---

[1]: ہندوستان کا ایک ترکی حکمراں خاندان جس نے افغانی رسم ورواج اور فارسی زبان اپنالیا تھا۔ سلاطین دہلی کے بعد ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک خلجی بادشاہ ہندوستان پر حکمراں رہے۔ خلجی خاندان کی بنیاد جلال الدین خلجی نے ۶۸۹ھ میں رکھی۔ جلال الدین کا اصل نام ملک فیروز اور شائستہ خان اس کا خطاب تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد جلال الدین سے مشہور ہوا۔ ۱۷ رمضان ۶۹۴ھ میں اس کے بعد اس کا بھتیجہ علاء الدین خلجی تخت نشین ہوا جس کے قبضہ میں پورا ہندوستان آیا۔ علاء الدین خلجی [متوفی ۷۱۶ھ] کے بعد اس کے جانشین نااہل ثابت ہوئے۔ بالآخر تغلقوں کے ہاتھوں خاندان خلجی کا خاتمہ ہوا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خلجی ترک تھے، لیکن درحقیقت یہ افغان قبیلے غلجئی سے تعلق رکھتے تھے اور یہی غلجئی نام ہندوستان میں خلجی کی صورت اختیار کر گیا۔ [منتخب التواریخ] ع ب نعمانی

[2]: یہ علاء الدین خلجی کا لڑکا تھا جس کا پورا نام قطب الدین مبارک شاہ ہے۔ علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد کافور نامی شخص جو اس کا منظور نظر تھا، اس کا جانشین ہوا لیکن عوام نے اسے پسند نہ کیا اور اس کے خلاف سورش بپا ہوگئی، بالآخر ایک ہی ماہ میں یہ قتل کر دیا گیا تو اس کی جگہ یہی مبارک شاہ بادشاہ ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت بدطینت اور عیاش صفت تھا۔ بدخلقی اور دین بیزاری کا یہ عالم تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ [متوفی ۱۳۲۵ء] جو اس زمانے کے ایک نہایت خدارسیدہ بزرگ تھے اور جن کی ولایت برصغیر میں مسلم الثبوت تھی، مبارک شاہ ان کا بھی سخت دشمن تھا، حتی کہ ان کے قتل کا بھی منصوبہ بنایا، اگرچہ ناکام رہا۔ اپنی انہیں دسیسہ کاریوں کے نتیجے میں بتاریخ ۵ ربیع الاول ۷۲۱ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۳۲۱ء اپنے محل ہی میں اپنے ایک غلام خسرو خاں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ [مستفاد از 'ہندوستان پر اسلامی حکومت'] ع ب نعمانی

مزار وکتبہ عبدالرزاق اور مسجد کا مغربی حصہ

اس مسجد کے جنوبی سرے پر گنگا بہتی ہے جب کہ بقیہ تین طرف مسجد کی کافی زمین تھی لیکن بیشتر حصے پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے۔ البتہ مغربی سرے پر کچھ مسلم خاندان بطور 'کرایہ دارِ مسجد' آباد ہیں۔

بعہد شاہ قطب الدین بودہ مبارک شاہ سلطاں ابن سلطاں

بسال ہفت صد و ہزدہ زہجرت مکمل شد بنائے خلد ساماں

۷۱۴ھ مطابق ۱۳۱۴ء

مزار سے متصل ایک مسجد تھی۔ پہلے یہ مسجد لب گنگا تھی، جو منہدم ہوگئی تھی۔ صرف اس کی مغربی دیوار، زینہ و دروازہ اور محراب کا نشان باقی رہ گیا تھا، لیکن ۱۲۴۸ھ م ۱۸۳۱ء میں جبین قصاب نامی ایک شخص نے اس کی از سرِ نو تعمیر کرائی اور محراب میں ایک کتبہ نصب کرایا جو فارسی زبان میں چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور اس کے آخری مصرعہ سے تاریخِ تعمیرِ نو نکلتی ہے۔ کتبہ یہ ہے:

جبین چو کہ این مسجد بنا کرد متاع دین و ایمان یافت منت

سروش سال وی از روی اشا عبادت خانہ دین آمدہ گفت

۱۲۴۸ ہجری
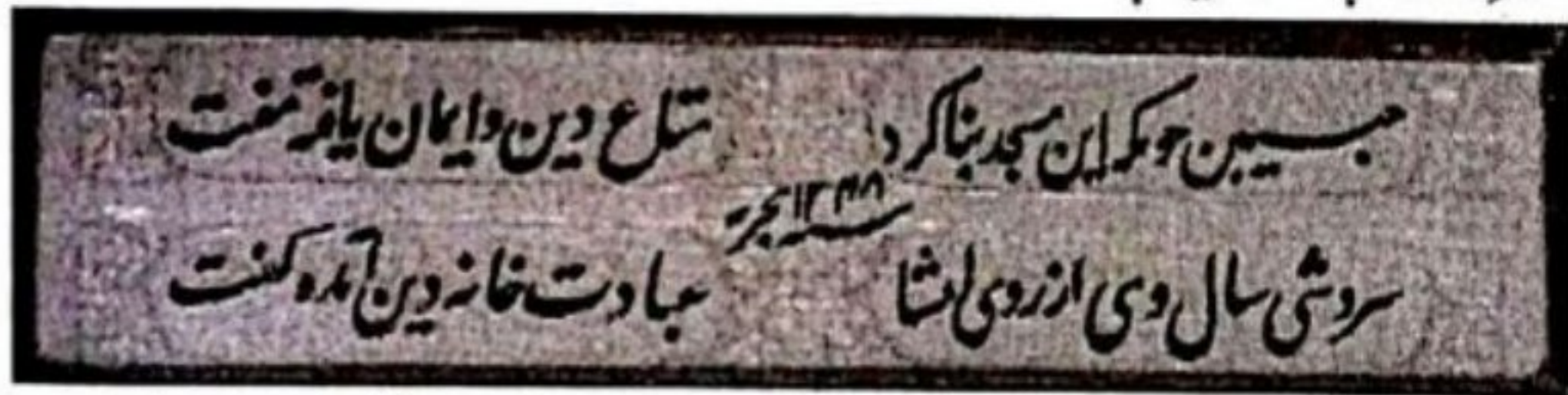
ہر سال ربیع الاول کی ۱۲ر تاریخ کو حاجی عبدالمجید، ساکن تلیا نالہ[1] کے زیر انتظام عبدالرزاق شاہ کا عرس ہوتا ہے۔

---

[1]: آپ کا آبائی مکان مرغیہ ٹولہ متصل کٹیہر بنارس تھا۔ بعد میں تلیا نالہ منتقل ہوگئے۔ ۱۹۹۳ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ پھر آپ کی جگہ پر حاجی محمد ابراہیم ساکن چوہٹہ بنارس متولی ہوئے۔ بتاریخ ۵ر مئی ۲۰۰۵ء کو آپ بھی انتقال کر گئے جس کے بعد سے اب تک وہاں کا کوئی متولی نہ ہوا۔ انتظامی امور آغا وکیل مرزا، عرفان احمد اور باقر علی صاحبان کے زیر نگرانی انجام پاتے ہیں۔ ع ب نعمانی بشکریہ حافظ جمال احمد نعمانی، ساکن سلیم پورہ بنارس

محمد باقر خاں حاکم بنارس

عبدالرزاق کے انتقال کے بعد محمد باقر خاں اسی دور حکومت میں بنارس کے حاکم مقرر ہوے۔ 'تاریخ صنم کدہ بنارس' سے معلوم ہوتا ہے کہ محلّہ 'باقر آباد' اور روٹی کی ایک مشہور قسم 'باقر خانی' انہیں کے نام سے موسوم ہوئی۔

جمال الدین حاکم بنارس

۱۳۲۰ء میں خاندان خلجی کے خاتمہ کے بعد خاندان تغلق کی حکمرانی شروع ہوئی۔ ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق [متوفی ۱۳۲۵ء] اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہوا۔

غیاث الدین تغلق نے تخت پر بیٹھتے ہی بڑے بڑے رفاہ عام کے کارنامے انجام دیے اور ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں جلوس سلطنت کے پہلے ہی سال ظفر آباد شہر آباد کیا اور اس کو دارالحکومت بنایا۔ پھر حضرت مخدوم حاجی چراغ ہند ظفر آبادیؒ [متوفی ۷۴۴ھ] کا عالی شان روضہ اور دروازہ بنوایا، جس کے دروازے پر کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

غیاث الدین تغلق کے بعد محمد تغلق [متوفی ۱۳۵۱ء] نے اس کی جگہ لی، جو حافظ قرآن ہونے کے ساتھ عربی و فارسی خطاطی کا بھی ماہر تھا۔ اس بادشاہ کی وفات کے بعد امراء نے غیاث الدین تغلق کے بھتیجے فیروز شاہ تغلق [متوفی ۱۳۸۸ء] کو بادشاہ مقرر کیا جس نے ۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء تک حکومت کی۔ اس بادشاہ نے بہت کچھ تعلیمی خدمات کے ساتھ رفاہ عام کے بھی ہزاروں کام انجام دیے، جن میں دواخانے سرائیں، نہریں اور سڑکیں و کنویں خاص طور سے قابل ذکر ہیں[1]

یہ بادشاہ بہت دین دار اور نیک تھا، اس نے ایک گھڑی ایجاد کی تھی، جس

---

[1] اس بادشاہ کو جدید شہر آباد کرنے کا بھی بے حد شوق تھا، چنانچہ جونپور، فیروز آباد و فتح آباد وغیرہ کئی شہر آباد کیے، جس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ ع ب نعمانی

کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی تھی کہ:

یخرج فی ساعة منها صوت عجیب یترنم بھٰذا البیت ،

ترجمہ: اس گھڑی سے ہر گھنٹہ ایک آواز پیدا ہوتی ہے اور نغمہ کے ساتھ یہ شور سنائی دیتا ہے:

ہر ساعتے کہ بر در شاہ فاس می زنند

نقصان عمر می شود آں یاد می دہند

ترجمہ: بادشاہ کے دروازے پر ہر گھنٹہ گھڑیال بجاتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ کم ہو گیا۔

[نزہتہ الخواطر]

غیاث الدین تغلق نے اپنے زمانے میں جمال الدین احمد کو بنارس کا حاکم مقرر کیا۔ محلّہ جمال الدین پورہ انہیں کے نام سے موسوم ہے ـــ پھر جمال الدین کے بعد جلال الدین احمد اسی بادشاہ کے دور میں حاکم بنارس ہوے جن کے نام سے محلّہ جلال الدین پورہ موسوم ہوا۔

ضیاء الدین احمد حاکم بنارس

۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء میں محمد تغلق کا انتقال ہو گیا اور اس کا چچازاد بھائی فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ اس نے ۷۵۷ھ م ۱۳۵۶ء میں بنگال کے سفر سے واپس آتے وقت فرمانروائے بنارس سے جنگ کی اور اس کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے زمانے میں ضیاء الدین احمد کو بنارس کا حاکم مقرر کیا۔ اس نیک دل اور دین دار حاکم نے بہت سے رفاہ عام کے کام کیے۔ شہر کی بہت سی تاریخی عمارتیں اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ علوی پورہ میں باقر کنڈ کے کنارے حضرت شاہ صابر علی صاحبؒ کی خانقاہ اور مقبرہ سے متصل ایک لنگر خانہ تعمیر کرایا جو آج بھی موجود ہے اور لنگر کے نام سے مشہور ہے۔

مقبرہ حضرت فخر الدین شہید علویؒ:

محلّہ سالار پورہ میں واقع حضرت فخر الدین شہید علویؒ کا یہ مقبرہ بھی ضیاء الدین ہی نے تعمیر کرایا اور اس کے ملحق ایک مسجد، گنبد، برآمدہ احاطہ اور دالان بھی تعمیر کرائی۔

مسجد جھاڑو شاہ :

یہ مسجد اسی تالاب کے کنارے بڑی پرفضا جگہ پر واقع ہے۔ پوری عمارت سنگین ہے اور مسجد کا طرز تعمیر فیروز شاہی تعمیرات کا نمونہ ہے۔ اس کے اندر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ازعون عنایت ربانی وتائید ظل یزدانی مسجد ودھلیز
وحجرہ ونردبان حوض۔ محوطہ مقام متبرکہ
فخر الدین شہید علوی طاب اللّٰہ ثراہ وجعل الجنتہ
مثواہ بعہد سلطان الاعظم بتائید الرحمٰن ابو المظفر

فیروز شاہ خلداللہ ملکہ عمارت بندئہ مسکین ضیاء الدین احمد۔

حق تعالیٰ بندئہ خود راعاقبت بخیر گرداند، بحق محمد وآلہ واصحابہ من غرۃ ربیع الاول سبع وسبعین وسبع مأۃ من الھجرۃ

کتبہ سے ظاہر ہے کہ یہ مسجد[1] ۷۷۷ھ م ۱۳۷۵ء کی تعمیر شدہ ہے۔

چوکھمبا کی مسجد:

محلّہ چوکھمبا میں اسی نامور حاکم نے یہ مسجد بھی تعمیر کرائی جو 'چوکھمبا کی مسجد' سے مشہور اور مکمل طور پر سنگین ہے۔ مسجد کے سال تعمیر کا پتہ نہ چل سکا۔ اس مسجد کے علاوہ بھی
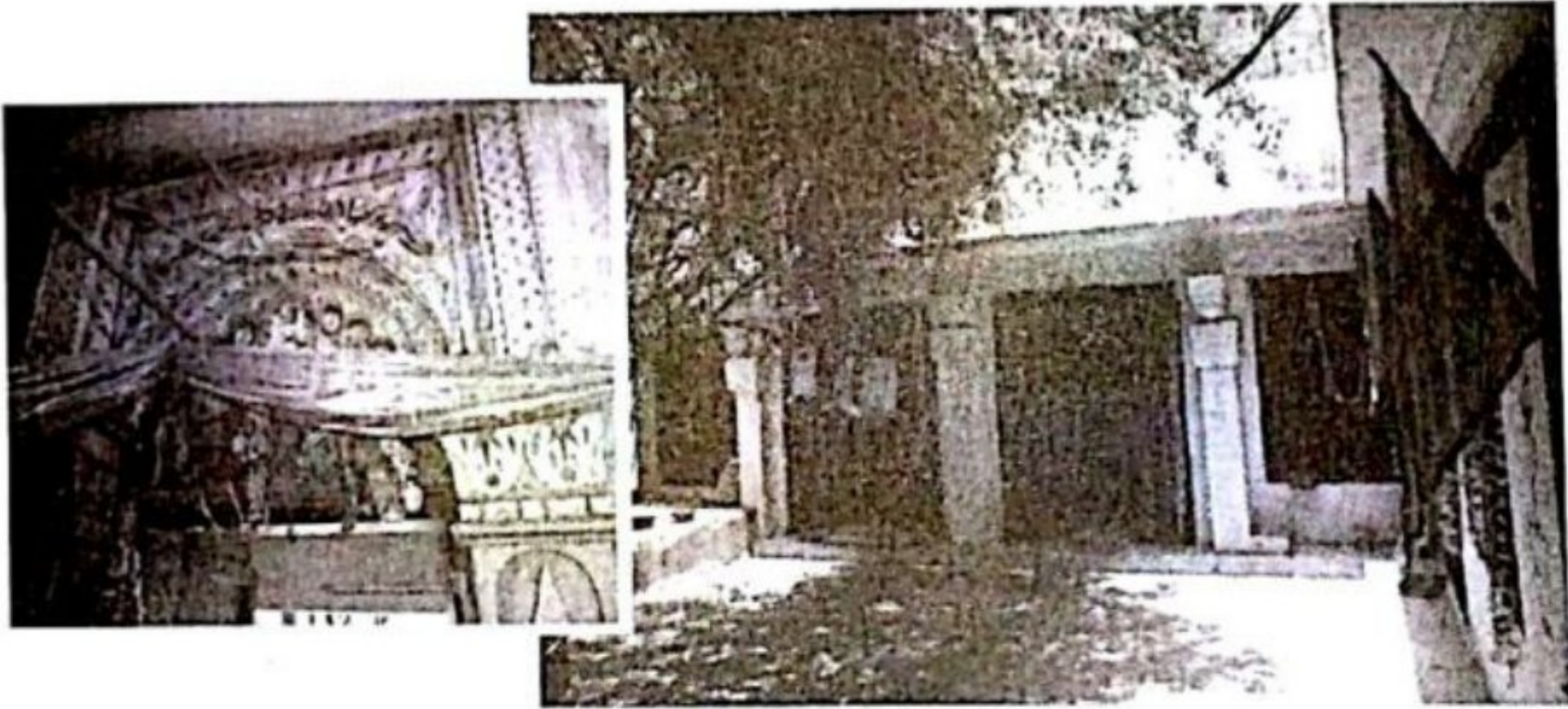
مسجد چوکھمبا: اندرونی حصہ اور داخلی دروازہ۔ بنارس کے مشہور گوپال مندر کے جنوب میں واقع

اس مسجد کے شمالی حصے کی دالان میں چار عظیم الشان قبریں بھی موجود ہیں جو چار درویش کی قبر نام سے مشہور ہیں۔ ان چاروں درویشوں کے نام تارا شاہ، میراں شاہ، انار شہید اور چوکھمبا شاہ بتائے جاتے ہیں۔

---

[1] اس مسجد کا اصل نام 'فیروز شاہی مسجد' ہے لیکن عوام میں 'جھاڑو شاہ کی مسجد' مشہور ہوئی جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک ضعیف العمر آدمی مسجد مذکور میں ہمہ وقت مقیم رہتے اور صفائی ستھرائی کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے اس اہتمام سے متاثر ہو کر عوام میں ان کا نام جھاڑو شاہ پڑ گیا۔ ان کا مزار مسجد کے صدر دروازے کے پاس ہے۔ یہ مسجد سنگین اور نہایت مضبوط ہے، اصل مسجد کو اپنے حال پر باقی رکھ کر اس کے سامنے کی خالی جگہوں کو جدید تعمیر سے آراستہ کر کے اصل مسجد سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ ع ب نعمانی

اس نے کئی مسجدوں کی تعمیر میں ہاتھ لگایا،لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ نامکمل رہ گئیں۔
اس کی بنوائی مسجدوں میں ذیل کی دو مسجدیں بھی قابل ذکر ہیں۔

[ا] راج مندر کی مسجد[1]:

ضیاء الدین حاکم بنارس کے زمانے میں حسین بن شرف حسینی نامی شخص نے ایک خاتون کی یادگار کے طور پر یہ ۷۶۵ھ م ۱۳۶۴ء میں یہ مسجد تعمیر کرائی جو لب دریا، بلندی پر واقع ہے۔عمارت بہت مضبوط اور سنگین ہے۔مسجد کے اندر پوربی دیوار میں دروازے پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

"از عون عنایات الٰهی و تائید فضل لامتناهی بعهد سلطان
الاعظم فیروز شاه خلد ملکه سلطان مسجد تعمیر نمود،
عمارت بنده مسکین حسین شریف حسینی ست،امید از
پرورد گار آنست که....حاصل گردد ،درجریدهٔ اعمال
اسیرخاتون ملك نصیرالدین ملحق گردد۔"
العاشرمن جمادی الاول سنته خمس وستین وسبع مآة

---

[1] وشویشور گنج دودھ منڈی سے ہوتے ہوئے جو راستہ دریائے گنگا کو جاتا ہے وہیں شیتلا گھاٹ پر چاروں طرف ہندوؤں کے مکانوں کے درمیان ایک تنگ گلی میں یہ مسجد واقع ہے۔اوپر متن میں مسجد کی جس عمارت اور کتبے کی بات کہی گئی ہے وہ اب نہیں ہے۔البتہ مسجد کا اندرونی حصہ اپنی اصل قدامت کے ساتھ باقی ہے۔
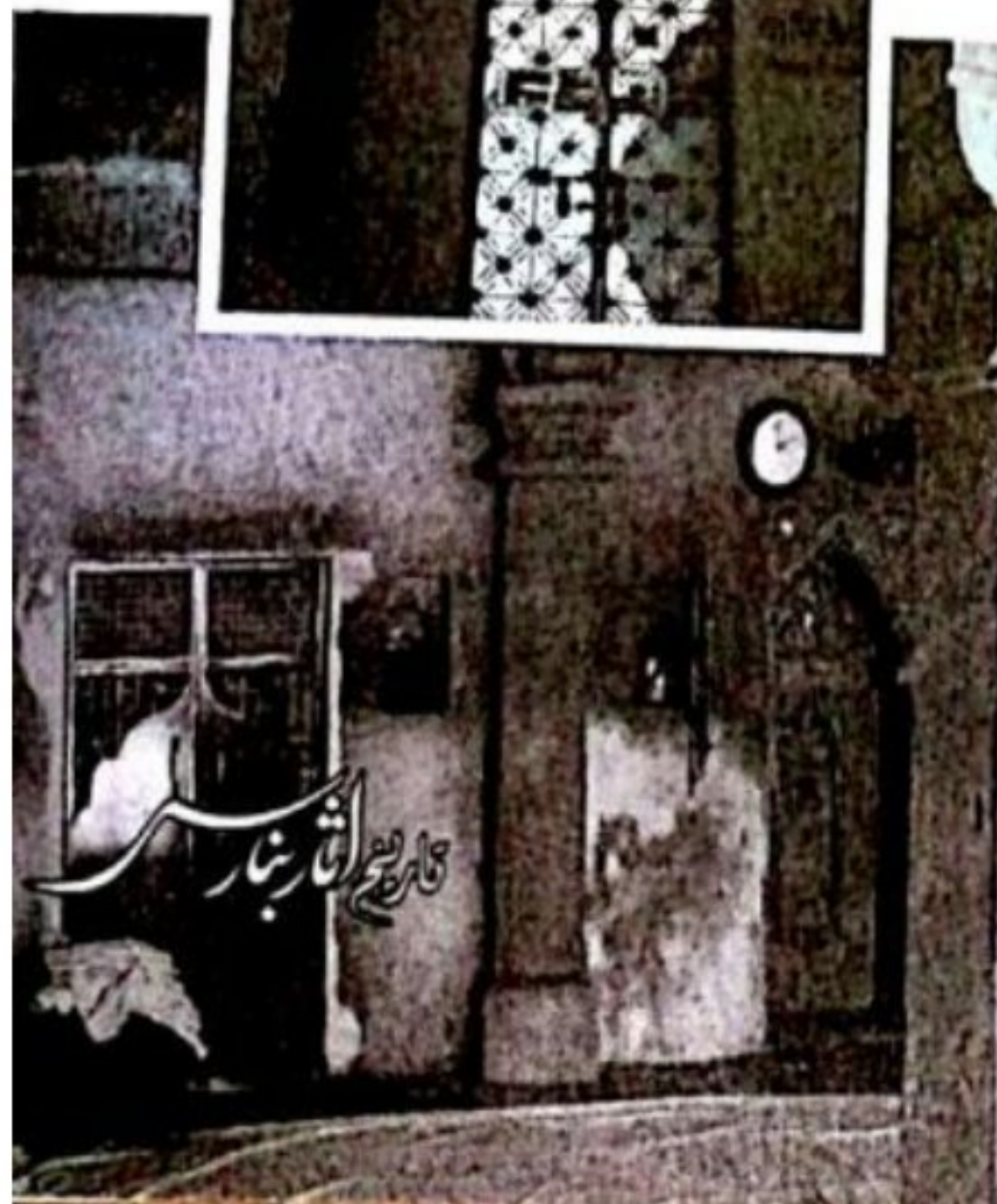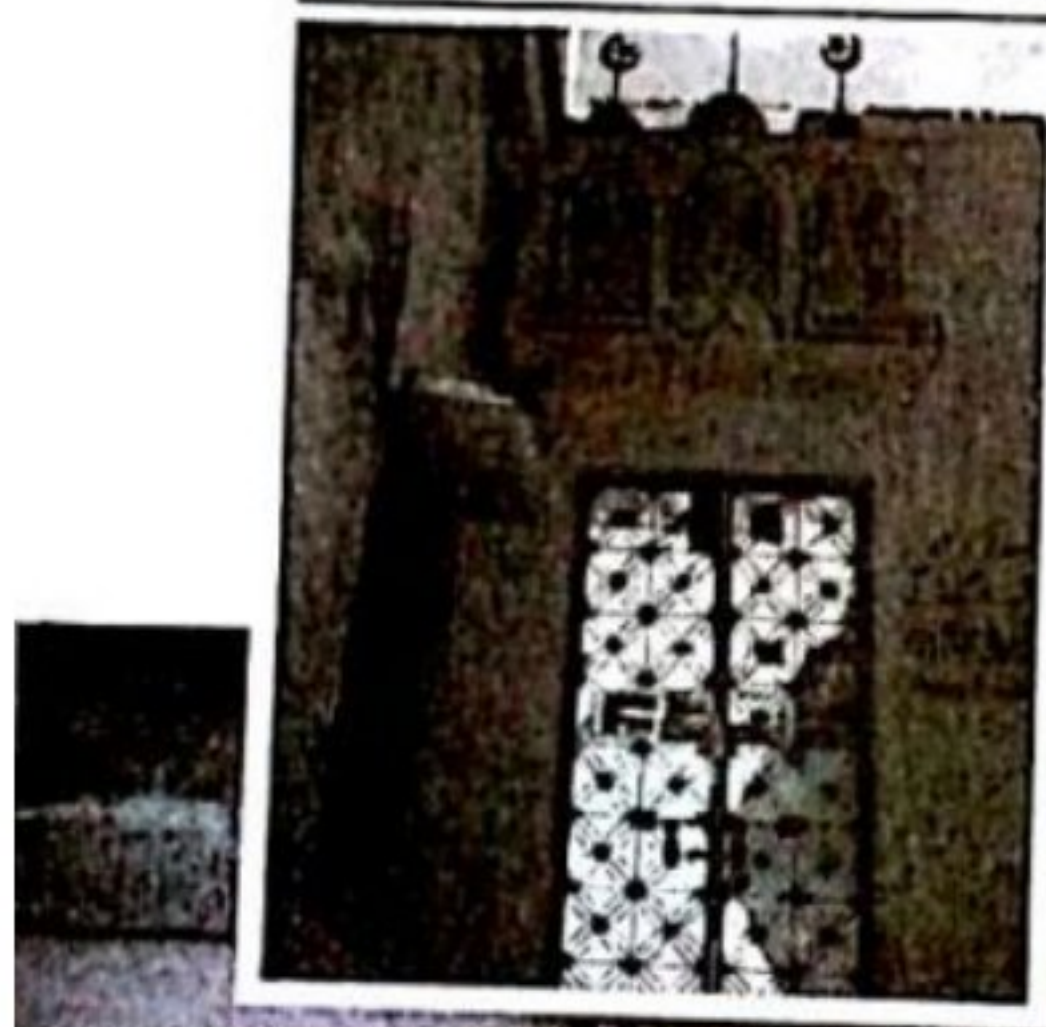
[۲] شکر تالاب کی مسجد:

یہ مسجد بھی سلطان فیروز شاہ تغلق [متوفی ۱۳۸۸ء] کے عہد میں ضیاء الدین حاکم بنارس نے تعمیر کرائی۔ لیکن اس کے بعض حصے منہدم ہوجانے کے بعد از سر نو تعمیر ہوئی۔

یہ 'شکر تالاب' نام بھی ایک مستقل وجہ تسمیہ رکھتا ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ رائے سدھن والیِ جاج نگر، باغی ہوگیا تھا۔ اس کی لڑکی کو جس کا نام شکر تھا، فیروز شاہ نے اپنی حفاظت میں رکھا اور جہاں رائے سدھن کا مکان تھا وہیں ایک تالاب بنوایا جو اسی لڑکی کے نام سے 'شکر تالاب' مشہور ہے۔ اب تالاب تو نہیں ہے صرف نام باقی رہ گیا ہے[1]

شکر تالاب میں اکثر بزرگان دین کی قبریں ہیں۔ خصوصاً حضرت شاہ نور محمد صاحبؒ لیکن ان کے حالات کہیں نہ مل سکے۔ خاکسار مصنف کے دادا شیخ امام الدینؒ کی بھی قبر وہیں ہے۔

فیروز شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے زمانے کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ۷۵۴ھ م ۱۳۵۳ء میں حاجی الیاس حاکم بنگال نے فیروز شاہ سے باغی ہوکر اپنا نام سلطان شمس الدین شاہ بھنگر رکھا اور بنارس تک قبضہ کرکے پنڈوہ کو اپنا دار السلطنت بنایا جو مالدہ [بنگال] کے قریب ہے شاہ دہلی اس کی سرکوبی کے لیے بنگالہ پہنچا اور چند لڑائیاں لڑکر تمام بنگالہ کو عبور کرگیا۔ بالآخر مسلمانوں کے قتل کے مواخذہ سے بچنے کے لیے صلح کرکے بادشاہ دہلی لوٹ گیا۔ اس کے لوٹتے ہی شمس الدین شاہ نے پھر سر اٹھایا اور سنارگاؤں [بنگال] کے حاکم ملک فخر الدین کو مار ڈالا[2]

فیروز شاہ کے زمانے میں گویا بنارس کچھ عرصہ تک شمس الدین شاہ حاکم بنگال کے زیر نگیں تھا اور اس کے مرنے کے بعد پھر فیروز شاہ دہلی کے زیر فرمان ہوگیا۔

---

[1] تاریخ صنم کدہ بنارس۔ عبدالسلام نعمانی [2] تاریخ فرشتہ

بنارس خواجہ جہاں ملک الشرق کے عہد میں

فیروز شاہ کی وفات کے بعد اس کے پوتے غیاث الدین، پھر دوسرے پوتے سلطان ابوبکر، پھر ناصر الدین محمد شاہ، پھر سکندر شاہ، پھر ناصر الدین محمود شاہ دہلی کی سلطنت پر قابض رہے۔ ان سب بادشاہوں کے عہد حکومت میں ضیاء الدین احمد ہی حاکم بنارس رہے۔ لیکن اس خاندان کے آخری تاجدار محمود شاہ [متوفی ۱۴۱۳ء] کے زمانے میں اچانک امیر تیمور[1] دل بدل فوجوں کے ساتھ نمودار ہوا اور دہلی پر حملہ کرکے قابض ہوگیا اور سارے ہندوستان میں اس کے نام کا ایک خطبہ پڑھا گیا۔ امیر تیمور صرف ۱۵ دن ٹھہر کر اپنے ملک سمرقند چلا گیا۔ اس کے بعد خواجہ جہاں ملک الشرق جونپور کے مستقل بادشاہ ہوئے۔ بنارس بھی ان کے زیر سلطنت ہوگیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۷۹۶ھ م ۱۳۹۴ء میں ناصر الدین محمود شاہ [متوفی ۱۴۱۳ء] نے اپنے وزیر خواجہ جہاں[2] کو جون پور کا صوبہ دار مقرر کیا اور بنارس کو بھی سپرد

---

[1]: ہندوستان میں دو سلطنتیں تیموری کہلاتی ہیں: ایک تو وہی جسے مغلیہ سلطنت کہا جاتا ہے۔ دوسری سلطنت تیمور یہ وہ ہے جو مغلیہ سلطنت سے بہت پہلے امیر تیمور نے قائم کیا تھا۔ یہ امیر تیمور ۱۳۳۶ء میں سمرقند کے قریب کیش نامی علاقہ میں پیدا ہوا۔ یہ ماں کی طرف سے چنگیز خاں [متوفی ۱۲۲۷ء] کی نسل سے تھا۔ اس کے باپ کا نام امیر ترغی تھا جو تاتاری ترکوں کا سردار تھا۔ اس نے اپنی بے نظیر جنگی قابلیت کی بنا پر نہ صرف سمرقند، بلکہ خوارزم، ترکستان، خراسان، عراق، آذربائیجان سمیت تقریباً ایک درجن شہروں کو فتح کرتا ہوا ۱۴۰۵ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ [ہندوستان اسلامی حکومت ص ۳۳۴] ع ب نعمانی

[2]: اس کا اصل نام تاج الدین تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا پوتا تغلق شاہ جب ۱۳۸۸ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے تاج الدین کو وزیر اعظم کا عہدہ عطا کرنے کے بعد خواجہ جہاں کا بھی خطاب دیا۔
[ہندوستان میں اسلامی حکومت۔ ص ۳۲۵] ع ب نعمانی

کردیا۔لیکن انہوں نے مرکزی حکومت سے سرتابی کر کے جونپور میں خاندان شاہان شرقی کی بنیاد ڈالی اور اپنے لڑکے مبارک شاہ کو ملک الشرق کا خطاب دے کر اپنا مدار المہام مقرر کیا۔قنوج سے لے کر بہار تک تمام صوبے اس کے زیر حکومت ہو گئے اور اس طرح بنارس جونپور دارالحکومت کے ماتحت ہو گیا۔

خواجہ جہاں کا انتقال ۸۰۲ھ م ۱۳۹۹ء میں ہوا۔ بنارس کا خواجہ بازار نامی علاقہ انہیں کے نام سے موسوم ہے جس کو اب کھجواں بازار کہتے ہیں۔

سمرقندی مسلمانوں کا قافلہ بنارس میں

امیر تیمور صاحبقراں کے لشکر میں سمرقند اور عراق سے مسلمانوں کے دو بڑے قافلے آئے۔ اول مسلمانان سمرقند جن کو پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر قادر جیلانی [متوفی ۵۶۱ھ] سے خاص عقیدت تھی اور یہ لوگ شریف، دین دار اور باعزت تھے۔ چونکہ یہ لوگ بہ نیت جہاد مع اہل وعیال ہندوستان آئے تھے اور یہاں کے مسلمانوں میں خود نفاق تھا، اس وجہ سے علیحدہ ہو گئے۔

ملک الشرق خواجہ جہاں [متوفی ۱۳۹۹ء] سلطان جونپور کے زمانے میں یہ لوگ بنارس آئے اور رزق حلال کی خاطر یہاں کے نوربافوں کا پیشہ اختیار کیا اور ان میں گھل مل کر ایک ہو گئے۔ آپس میں قرابت داریاں قائم کر لیں اور کافی جاہ و مال کے مالک بن گئے۔

دوسرا قافلہ مسلمانان عراق کا ہے جن کے خاندانی بزرگ حضرت حر شہیدؒ کربلا کے نسبی متعلقین ومعتقدین میں سے تھے۔ یہ لوگ شہدائے کربلا کے ماتم میں عام طور سے سیاہ لباس پہنا کرتے تھے اور یہ لوگ بھی جہاد ہی کی نیت سے ہندوستان آئے تھے، لیکن باہمی جنگ دیکھ کر کچھ تو کنارہ کش ہو گئے، کچھ بنارس ہی میں رہ گئے اور کچھ اعظم گڑھ، جون پور، غازی پور کے قریبی اضلاع میں منتقل ہو گئے اور اپنا ذریعہ معاش

تجارت بنالیا۔اب تک مسلمانان عراق کی یہ نسل مذکورہ بالا اضلاع میں موجود ہے،جنہیں بجائے عراقی کے بگاڑ کر 'رانکی' کہا جاتا ہے۔

ملک مبارک شاہ ملک الشرق ثانی

خواجہ جہاں کے انتقال کے بعد ہی ۸۰۲ھ م ۱۳۹۹ء میں ان کے لڑکے مبارک شاہ ملک الشرق سلطنت پر قابض ہوئے،لیکن صرف دو ہی سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گئے۔ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سلطان ابراہیم[1] ملک الشرق ہوئے جن کے دور حکومت میں بنارس میں بڑی ترقی ہوئی جن کی تفصیل آگے آرہی ہے:

محمد خالص حاکم بنارس:

ابراہیم شاہ ملک الشرق کے دور حکومت میں محمد خالص ۸۰۴ھ م ۱۴۰۱ء میں بنارس کے حاکم تھے۔بنارس میں محلہ خالص پورہ ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔

ان کے دور سلطنت میں سلطان ظل اللہ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے دس سال تک سمنان[2] میں حکومت فرما کر اپنے بھائی سلطان اعز شاہ کو اپنا جانشین بنا دیا اور حکومت ترک کر کے درویشی اختیار فرمائی اور پھر تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ہندوستان تشریف لائے۔خوش قسمتی سے اسی زمانے میں جونپور ہوتے ہوئے بنارس بھی تشریف لائے جو آگے چل کر مخدوم شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے بنارس میں چند روز قیام فرمایا۔یہاں قیام کے دوران ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل لطائف اشرفی میں درج ہے

---

[1] یہ بادشاہ بڑا ہی علم دوست تھا۔اس کے دربار میں دنیا کے مشہور علماء کا ہجوم رہتا تھا۔بڑی شان سے چالیس سال حکومت کرنے کے بعد ۸۴۴ھ مطابق ۱۴۴۰ء میں وفات پائی۔
[ہندوستان میں اسلامی حکومت۔ص ۹۰] ع ب نعمانی

[2] ایران کا ایک صوبہ۔ع ب نعمانی

اور اسی سے یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

"ایک دن حضرت مخدوم صاحب سیر کرتے ہوئے ایک بت خانہ کی طرف گزرے۔ ہندو برہمن صدق و نیاز کے ساتھ بت کی پرستش میں مشغول تھے۔ مخدوم صاحب وہیں کھڑے ہو گئے اور بڑی دیر تک دم بخود رہے اور برجستہ یہ شعر پڑھا:

اگر نقش ورخ زلفت نبودے در ہمہ اشیا
مغاں ہرگز نکردندے پرستش لات وعزیٰ[1]

پجاریوں نے حضرت کو دیکھا تو دوڑے ہوئے آئے اور ملاقات کرنے کے بعد کچھ دین و مذہب کی فضیلت پر گفتگو شروع ہوئی۔ برہمنوں نے اپنے مذہب کی ترجیح پر دلیلیں پیش کیں اور مخدوم صاحب نے بھی بڑی دیر تک اسلام کی حقانیت اور صداقت پر تقریر فرمائی۔ جب دیکھا کہ یہ لوگ اپنی ضد سے باز نہیں آئیں گے تو اتمام حجت کے طور پر فرمایا کہ اگر یہ بت تمہارے دین کی تکذیب کریں تو ایمان لاؤ گے؟ برہمنوں نے اقرار کیا اور وعدہ کیا کہ اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے تو ہم ضرور اسلام کا کلمہ پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت مخدوم صاحب نے ہاتھ بڑھا کر ایک بت ہاتھ میں لے لیا اور کہا اے بت! اگر دین محمدی برحق ہے تو لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ۔ خدا کی قدرت سے بت نے کلمہ پڑھا اور لوگوں نے سنا، اس طرح برہمنوں کی ایک

---

[1] ترجمہ: اے محبوب حقیقی! اگر تیرے رخ اور زلف کا نقش تمام چیزوں میں نہ ہوتا تو مغاں [آتش پرست] لات اور عزیٰ [بتوں کے نام ہیں] کی پوجا نہ کرتے۔ عبدالسلام نعمانی

جماعت حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔"

[لطائف اشرفی ص۳۴۲ مطبوعہ ۱۲۹۷ھ نصرۃ المطابع دہلی]

حضرت مخدوم صاحب قدس سرہ کی اس بے مثال کرامت اور آپ کی بنارس میں تشریف آوری سے کفروشرک کے اندھیرے میں توحید کی کرن پھوٹی اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی قائم ہوگئی۔

۲۸ محرم ۸۰۸ھ م ۱۴۰۵ء میں مخدوم صاحب کا انتقال ہوا۔ مدفن کچھوچھہ شریف ہے جہاں ہندوستان کے گوشے گوشے سے زائرین حاضر ہوتے ہیں اور ہر سال عرس ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا بدیع الدین قطب المدار[1]:

محمد خالص حاکم بنارس کے دور حکومت میں دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ

[1]: آپ یکم شوال ۲۴۲ھ کو ملک شام کے حلب نامی علاقہ میں پیدا ہوے۔ یہ بہت عظیم فقیروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی ظاہری وضع قطع ان کے باطن سے بہت مختلف تھی۔ یعنی باطن روشن تھا۔ ظاہر کو دیکھ کر عموماً لوگ بدظنی کا شکار ہوتے۔ نہایت ذہین وفطین اور اوائل عمر ہی میں اتنے علوم ومعارف حاصل کر لیے جو عموماً اس عمر میں حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ حج کرنے کے ارادے سے حرمین شریفین تشریف لے گئے، بعد حج زیارت نبوی سے سرفراز ہونے کی غرض سے مسجد نبوی تشریف لے گئے۔ وہاں روزانہ عبادت میں مصروف رہتے اور مراقبہ بھی فرماتے۔ ایک روز دوران مراقبہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہوا کہ بدیع الدین! تم ہندوستان جاؤ اور وہاں جا کر مخلوق کی ہدایت کی کوشش کرو۔ اس ارشاد نبوی کی بنا پر آپ ہندوستان روانہ ہوے اور دین کی زبردست خدمت انجام دی۔ آپ نے کافی طویل حیات پائی تھی، چنانچہ ہندوستان میں آپ سے یہاں کے اجلہ مشائخ وصوفیاء سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ [متوفی ۶۳۳ھ] کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ سلاطین شرقیہ میں ابراہیم شاہ شرقی [۸۴۴ھ] اور عظیم بزرگ حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ [متوفی ۸۴۹ھ] کے زمانے میں بھی آپ موجود تھے۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ کے ظاہری احوال دیکھ کر بدظنی میں مبتلا ہونے والوں میں قاضی صاحب مذکور بھی تھے، مگر بعد میں جب حقیقت کا انکشاف ہوا تو آپ کی یہ بدظنی حسن عقیدت میں تبدیل ہو گئی۔ یوں تو آپ نے ارشاد نبوی کے مطابق ملک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فرائض تبلیغ انجام دیے، لیکن آخر عمر میں ضلع کانپور کے ایک شہر مکن پور میں مقیم ہوگئے اور وہیں ۱۷ جمادی الاول ۸۳۸ھ میں وفات پائی۔ مزار مبارک پر سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ایک بڑا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا۔

[تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیاء جونپور۔ ۱۰۲۶/۲، وتذکرۃ المتقین فی احوال خلفاء الخ] ع ب نعمانی

مورخہ ۱۷ ر جمادی الاولیٰ ۸۳۸ھ مطابق ۱۴۳۴ء کو سید بدیع الدین قطب المدارؒ نے مکن پور میں انتقال فرمایا، جو ان کا مدفن بھی ہے۔ بنارس میں ان کے معتقدین نے یہ کیا کہ محلّہ کتواپورہ میں بطور آپ کی یادگار ایک مقبرہ بنا کر میلہ لگانا شروع کر دیا۔ اس فرضی مقبرے پر ہر سال جمادی الاولیٰ میں سترہویں کے نام سے میلہ لگتا ہے، نذر و نیاز کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

غلام انبیاء حاکم بنارس:

۸۴۴ھ م ۱۴۴۰ء میں سلطان محمود ملک الشرق[1] نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور غلام انبیاء نامی ایک شخص کو بنارس کا حاکم مقرر کیا جن کے نام سے 'انبیاء کی منڈی' نامی علاقہ ہے جو اب 'امیا منڈی' سے مشہور ہے[2]
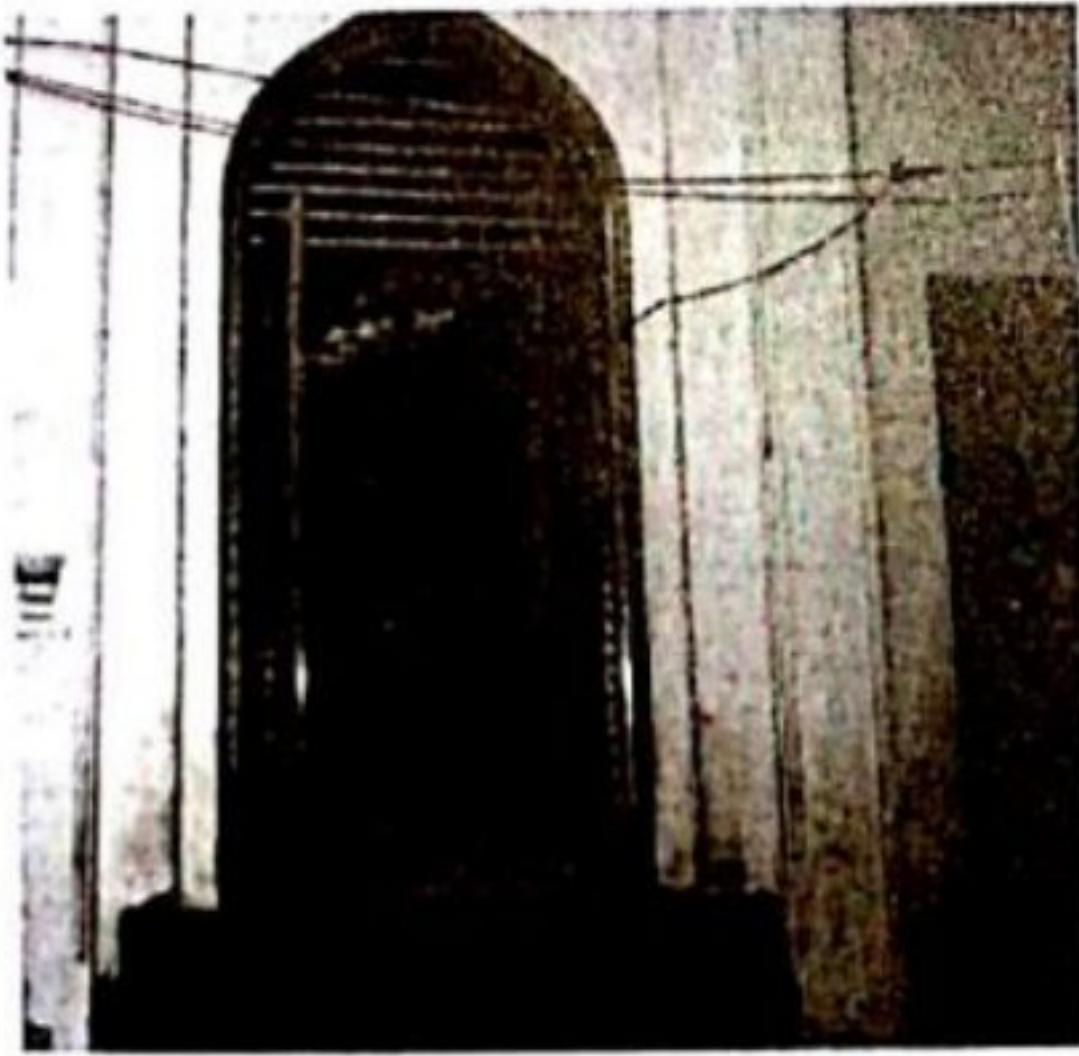
غلام انبیاء حاکم بنارس:
مقبرہ اور مزار واقع محلّہ انبیاء کی منڈی

پارچہ محمودی:

سلطان محمود کے نام سے بنارس کے ریشمی ملبوسات میں 'پارچہ محمودی' مشہور تھا

---

[1] یہ ابراہیم شرقی کا بیٹا اور بہت نیک بادشاہ تھا، ۸۳۶ھ مطابق ۱۴۵۷ء میں وفات پائی۔ [ہندوستان میں اسلامی حکومت] ع ب نعمانی

[2] محلّہ امیا منڈی میں واقع مکان نمبری K.50/104 [مملوکہ غلام محمد عرف چھیدی] کے جز و حصہ میں ایک آستانہ کی شکل میں تعمیر شدہ عمارت میں غلام انبیاء کا مزار واقع ہے اور صاحب مکان غلام محمد مذکور کے زیر اہتمام ہر سال صفر المظفر کی ۱۷ تاریخ کو ان کا عرس بھی ہوتا ہے۔ ع ب نعمانی

جسے شاہی خاندان میں ایک عرصہ تک مقبولیت حاصل رہی۔

راجابی بی:

سلطان محمود نے بنارس کی ایک بیوہ اور غریب عورت سے شادی کر لی تھی جس کا نام راجابی بی تھا اور اسے داخل محل کر کے 'ملکہ شرقیہ' کا خطاب دیا۔ یہ سید طالب علی عرف سید طالبن [جو ایک زمانے میں راجا جے چند کی طرف سے بنارس کے حاکم تھے] کی بیٹی تھیں۔ چونکہ کم سنی ہی میں باپ کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ان کی والدہ ماجدہ سوت کات کر نور بافان بنارس کی عورتوں کے یہاں فروخت کر کے ان کی پرورش کرتی تھیں۔ اتفاق سے اس محلّہ کی اکثر شریف عورتیں بیوہ تھیں اور صرف سوت کات کر ہی اس کی مزدوری سے گزر اوقات ہوتا تھا۔ اسی وقت سے اس محلّہ کا نام کتوا پورہ مشہور ہوا[1]

راجابی بی بڑی ذہین اور پر مغز تھیں۔ اپنی دانش مندی و طباعی کی بنا پر امور سلطنت اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت حسن و خوبی سے انتظامات کیے۔

فیروزہ خانم:

راجابی بی کی ایک مصاحب خاص فیروزہ خانم تھیں، جن کو ملکہ نے گلبدن کا خطاب عطا کیا تھا، بڑی زیرک اور دانشمند تھیں۔

پارچہ گلبدن:

بنارس کے ریشمی ملبوسات میں 'پارچہ گلبدن' جو بڑا مشہور ہوا، ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ ملکہ شرقیہ راجابی بی نے اپنی سلطنت کے زمانے میں جاہل عورتوں کی سہولت کے پیش نظر عربی مہینوں کے الگ سے کچھ نام رکھے جو کافی مشہور ہوئے اور یہی

---

[1]: یہ تمام تفصیلات 'تاریخ صنم' کدہ بنارس اور 'تاریخ بنارس' میں موجود ہیں۔ عبدالسلام نعمانی

نام آج تک عورتوں کی زبان پر ہیں۔ وہ نام یہ ہیں:

دا ہا [محرم] تیرہ تیزی [صفر] بارہ وفات [ربیع الاول] گیارہویں [ربیع الثانی] مدار صاحب [جمادی الاولیٰ] خواجہ معین الدین [جمادی الاخریٰ] مہ رجب [رجب] شبرات [شعبان] روزہ [رمضان] عید [شوال] خالی [ذی قعدہ] بقرعید [ذی الحجہ]۔

بی بی راجا کی مسجد [مسجد بی بی رضیہ]:

راجابی بی نے شہر کا مرکزی بازار یہاں کے چاندنی چوک کو قرار دیا جواب صرف 'چوک' کے نام سے مشہور ہے۔ وہیں پر ایک بڑی شاندار مسجد تعمیر کرائی جو 'بی بی راجا کی مسجد' کے نام سے آج بھی بلندی پر واقع اور آباد ہے اور عرف عام میں 'بی بی رضیہ کی مسجد' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا سن تعمیر معلوم نہ ہو سکا۔

سلطنت شرقیہ کا زوال:

راجابی بی نے اپنے دور حکومت ہی میں سلطان حسین[1] نامی شخص کو مستقل طور پر سلطنت کا وارث بنایا اور سلطنت شرقیہ سے بنارس منقطع ہو گیا۔[2] یہ حکومت ۸۸۰ھ م ۱۴۷۵ء تک قائم رہی۔

---

[1]: یہ سلطان ناصرالدین محمود [متوفی ۱۴۵۷ء] کا بیٹا تھا۔ یہ اپنے بھائی سلطان محمد شاہ کے دور ہی میں جونپور میں تخت نشین ہو گیا تھا۔ [ہندوستان پر اسلامی حکومت۔ ص ۴۹۱] ع ب نعمانی

[2]: اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب سلطان حسین شاہ شرقی تخت نشین ہوا تو جلد ہی بہلول لودی [متوفی ۱۴۸۸ء] سے اس کی کئی لڑائیاں ہوئیں لیکن کسی لڑائی میں وہ سر جیت نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں حسین شاہ کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح بہلول لودی نے جونپور کو فتح کرنے کے بعد اسے بھی دہلی کی حکومت میں شامل کر لیا۔ حسین شاہ نے سلطان بہلول لودی کے لڑکے اور جانشین سکندر لودی [متوفی ۱۵۱۷ء] سے اپنی سلطنت واپس لینے کے لیے کئی مرتبہ جنگ کی مگر ناکامی ہی ہاتھ لگی۔ غرض کہ سلطان حسین شاہ ۱۹ سال حکومت کرنے کے بعد بنگال چلا گیا۔ اس طرح شاہان شرقی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ [ایضاً۔ ص: ۴۹۲] ع ب نعمانی

سید غلام امین حاکم بنارس:

سلطان حسین ہی کے زمانے میں سید غلام امین بنارس کے حاکم ہوے۔ ان کے زمانے میں بنارس پھر جونپور کے ماتحت ہوگیا لیکن صرف چند ہی دنوں کے بعد شاہ بہلول لودی[1] [متوفی ۱۴۸۸ء] نے حملہ کیا اور اس کے بعد خاندان شرقیہ کو زوال شروع ہوا۔

۱۴۷۸ء میں سلطان بہلول لودی نے سلطان حسین کو شکست دے کر جونپور کی سلطنت پھر دہلی میں شامل کر لی اور پھر بنارس صوبہ کے نام سے موسوم ہو کر دہلی کے ماتحت ہو گیا۔ بہلول لودی نے اپنے بھائی باربک کو یہاں کا صوبہ دار بنایا۔

سلطان حسین نے ایک بار پھر کوشش کی کہ بنارس پر قبضہ کرے۔ چنانچہ بہار کے بہت سے زمین داروں کو ملا کر باربک کو نکال دیا اور پھر بنارس پر قابض ہو گیا۔ لیکن ۹۰۲ھ م ۱۴۹۴ء میں شاہ سکندر لودی [متوفی ۱۵۱۷ء] نے حسین کو شکست دے کر پھر بنارس وجونپور کو دہلی کی مرکزی حکومت میں شامل کر لیا۔

مہاراجا بیر سنگھ حاکم بنارس:

سلطان سکندر لودی نے اپنی فتح کے بعد عارضی طور پر مہاراجا بیر سنگھ کو بنارس کا گورنر مقرر کیا اور سکندر لودی نے فتح پاتے ہی مساجد ودیگر عمارات مقدسہ کو چھوڑ کر دوسری عمارتوں کے منہدم کرنے کا حکم دے دیا تھا لیکن اس علاقے کی علمی بزم اب بھی منتشر نہ ہو سکی۔

کبیر داس:

اسی دور حکومت میں بنارس کے صوفی منش وشاعر 'کبیر داس' بھی موجود تھے جو

---

[1]: اس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں حکمرانی کرنے کے بعد ۱۴۵۱ء میں ہندوستان میں لودی حکومت کی بنیاد رکھی اور ۱۴۸۸ء میں انتقال کیا۔ ع ب نعمانی

۸۴۴ھ م ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۹۲۴ھ م ۱۵۱۸ء میں وفات پاگئے۔

کبیر داس کے دوہے اور پہیلیاں بہت مشہور ہیں لیکن یہ راز آج تک نہ کھل سکا کہ یہ ہندو تھے یا مسلمان؟ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے تذکرہ کی کتابوں میں کبیر داس کو ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کا امتیاز یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے ہندوؤں کو اسلام سے قریب کرنے کی خاطر کوشش کی اور ان کے دوہے بھی کچھ اسی انداز کے زباں زد عوام وخواص ہیں۔ مثلاً:

''ذات پات نہ پوچھے کوئی ہر کا بھجے ہر کا ہوئے''

'تذکرہ اولیاء ہند' میں شیخ کبیر جولاہہ قدس سرہ لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت شیخ تقی سہروردی جھونسویؒ کے خلیفہ تھے۔

بہر حال اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں کبیر داس، گرونانک، سوامی چیتنیہ کی خدمات بھی اپنے رنگ میں کسی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ ان لوگوں نے اسلامی تصوف کے 'فنافی اللہ'[۱] کے اصول کو عام کر دیا تھا اور اپنی برادری میں داخل کرنے کے لیے ہندو مسلمان کی قید اٹھا دی تھی۔ اس لیے ان لوگوں کے خلفاء میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا نام بھی نظر آتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ ان صوفیوں کی شرعی حیثیت کیا تھی؟ یہ ایک ناقابل فہم بات ہے۔ لیکن ہمیں مغلوب الحال صوفیوں کو اپنے حال پر قیاس نہ کرنا چاہئے ورنہ انا الحق [میں خدا ہوں] کا نعرہ بلند کرنے والے حضرت منصور حلاج اور سبحانی مااعظم شانی [میں پاک ہوں اور میری شان بہت بڑی ہے] کا ترانہ گنگنانے والے حضرت بایزید بسطامیؒ کے متعلق پھر کیا سوچا جا سکتا ہے؟[۲] العیاذ باللہ

---

۱ خدا تعالیٰ کی معرفت میں ڈوب جانے کا مرتبہ۔ ع ب نعمانی

۲: کبھی کبھی اولیاء وصوفیاء کرام سے وجد کی حالت میں لاشعوری طور پر بعض ایسے کلمات زبان سے نکل جاتے ہیں جنہیں سنتے ہی ایک عام مسلمان بھی انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے۔ حضرت منصور حلاجؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کے تعلق سے اوپر جو کچھ تحریر ہوا وہ اسی حالت وجد میں کہے ہوئے کلمات ہیں۔ حضرت منصور حلاج کی زبان مبارک سے جب یہ کلمہ ادا ہوا تو حسب فطرت لوگوں کو ان سے سخت بدظنی پیدا ہوئی لیکن [باقی اگلے صفحہ پر]

کبیر داس کے متعلق ہندو اور مسلمان دونوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ نیرو نامی ایک مسلمان کو اچانک محلہ لہرتارا میں ایک نوزائیدہ لڑکا زمین پر پڑا ہوا ملا۔ نیرو نے بچہ کو اٹھالیا اور اپنے گھر لاکر اس کی پرورش کی اور اس کا نام کبیر رکھا۔ پھر یہی بچہ بڑا ہو کر 'کبیر داس' کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ نیرو کپڑا بننے کا کام کرتا تھا اس لیے کبیر داس بھی بڑے ہو کر یہی کام کرنے لگے۔

کبیر داس نے گرو رامانند[1] کی خدمت میں چند روز رہ کر ہندی فن شاعری میں کمال پیدا کیا اور ہندی میں تصوف و معرفت کے مضامین سب سے پہلے انہوں نے ہی بیان کیے اور گرو نانک نے ان کی تقلید کی۔

شیخ تقی سہروردیؒ کے بعد کبیر داس نے حضرت شیخ بھیکو چشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں گروہ ان کے معتقد تھے، جو ہندو ان کے سلسلے کے ہیں وہ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں اور اب تک وہ لوگ مرنے کے بعد بجائے جلانے کے قبروں میں دفن کیے جاتے ہیں۔

[گزشتہ صفحہ کا بقیہ] جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں کو حقیقت معلوم ہوتی گئی۔ اسی طرح حضرت بایزید بسطامیؒ سے پہلی بار جب حالت وجد میں یہ کلمہ ادا ہوا تو اس حالت کے ختم ہونے پر وہاں موجود ان کے عقیدت مندوں نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے یہ جملہ کیوں ادا کیا؟ فرمایا مجھے تو علم نہیں کہ میں نے یہ جملہ کہا ہو، لیکن اگر آئندہ اس قسم کا کوئی جملہ میری زبان سے نکل جائے تو مجھے قتل کر ڈالنا! اس کے بعد دوبارہ حالت وجد میں آپ نے پھر یہی جملہ ادا کر دیا۔ چنانچہ حسب ہدایت مریدین نے آپ کو قتل کرنے کی تیاری کر لی، لیکن پورے مکان میں انہیں ہر سمت بایزید ہی بایزید نظر آئے اور جب انہوں نے چھریاں چلانی شروع کیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پانی پر چھریاں چل رہی ہوں آپ کے اوپر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر جب کچھ وقفہ کے بعد وہ کیفیت رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی تو دیکھا کہ آپ محراب میں کھڑے ہیں اور جب مریدین نے واقعہ بیان کیا تو فرمایا کہ اصل بایزید تو میں ہوں اور جن کو تم نے دیکھا وہ بایزید نہیں تھے۔ [تذکرۃ الاولیاء: ص ۸۸] ع ب نعمانی

[1] گرو رامانند اپنے زمانے کے سنتوں میں سے تھے۔ ۱۳۶۰ء میں مالیکوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ تعلیم کے سلسلے میں بنارس آئے تھے اور یہاں سوامی راگھوانند سے تعلیم حاصل کی۔ یہ ذات پات کی تفریق کے سخت مخالف اور انسانی مساوات کے سخت حامی تھے۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا بھی کام کرتے تھے۔ ان کی تعلیم کا نچوڑ یہ تھا کہ خدا سے محبت کی جائے اور انسان پر مہربانی کی جائے۔ ۱۴۵۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔
سکھ مذہب: ص ۲۳ [از پروفیسر محمد رفیق خاں، مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس] ع ب نعمانی

کبیر داس کے مرنے کی روایت یہ مشہور ہے کہ مرنے سے کچھ دن پہلے مگہر[1] میں تھے، بجلی خاں ناظم مگہر نے مسلمان سمجھ کر اسلامی طریقے سے تجہیز و تدفین کر کے دفن کر دیا۔ جب مہاراجا بیر سنگھ حاکم بنارس نے موت کی خبر سنی تو بوجہ ارادت مندی مگہر آیا اور قبر کھود کر لاش نکالنے کا ارادہ کیا جس سے مسلمان مزاحم ہوئے لیکن لڑنے جھگڑنے کے بعد صلح ہو گئی۔ قبر کھودی گئی تو لاش کا پتہ نہ تھا۔ بجائے لاش کے پھول ملا جسے ہندوؤں نے دفن کر کے سمادھی بنوادی اور وہ آج تک موجود ہے۔

کبیر چوڑا[2] : کبیر داس کے نام سے بنارس میں محلّہ 'کبیر چورا' اور اب مشہور سڑک 'سنت کبیر روڈ' پر زنانہ ہسپتال کے عقب میں فرضی مقبرہ بھی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

سنت روی داس:

سنت کبیر داس کے تذکرہ کے بعد سنت روی داس کا تذکرہ نہ ہونے سے یہ کتاب نامکمل رہ جائے گی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً سنت روی داس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔

آپ کبیر داس کے ہم عصر اور استاد بھائیوں میں سے تھے۔ اور بہت ہی اہم شخصیت کے مالک تھے۔ اس دور کے ایک زبردست شاعر ہوئے ہیں۔ ۸۷۵ھ م ۱۴۷۱ء میں سور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام سنتوش داس اور ماں کا نام کلسی دیوی تھا۔ ان کے باپ چمڑے کا کاروبار کرتے تھے اور کسی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی

---

[1] گورکھپور کے قریب ایک علاقہ۔

[2] کہا جاتا ہے کہ جہاں کبیر داس کا فرضی مقبرہ بنا ہے اس میں ایک چبوترا تھا جس پر ان کی سمادھی تھی وہ 'کبیر چبوترا' سے مشہور تھا اب کثرت استعمال کی وجہ سے 'کبیر چورا' ہو گیا۔ واللہ اعلم ع ب نعمانی

غرض سے نہیں گئے۔البتہ سوامی رامانند کے شاگرد ہوئے جن کی صحبت سے کبیر داس، نرہرداس، دھاناداس، سین داس وغیرہ فیضیاب ہوئے۔سنت روی داس ان استاد بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور یہ تمام ہی لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔کبیر داس نے ان کے متعلق ایک دوہا بھی لکھا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے:

"روی داس ایک ایسے مہاتما تھے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ان کی حقیقت کو پہچان نہ سکے۔"

ان پر استاد کی کافی توجہ تھی، اس لیے یہ وید، پران کے ساتھ قرآن پر بھی مہارت رکھتے تھے جیسا کہ ان کے وعظوں میں اس کی جھلک ملتی تھی۔سادھو سماج میں ان کی کافی عزت تھی، حتیٰ کہ میرا بائی نے بھی ان کو اپنا استاد تسلیم کرلیا۔یہ صرف شاعر اور سنت ہی نہیں بلکہ قومی مصلح اور انقلابی شخصیت رکھتے تھے، انہوں نے پورے ہندوستان کی سیاحت کی، ہندو مسلم تفریق کے قطعی قائل نہ تھے، اس لیے علماء اور برہمنوں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتے رہے۔

بنارس کے پنڈتوں نے ایک مرتبہ ان کے خلاف کاشی نریش شری ویرسنگھ سے شکایت کی کہ یہ چمار ہوکر مندر بنوا کر بھگوان کی پوجا کرتے ہیں اور ست سنگھ میں وعظ کرتے ہیں، ہریجنوں کو کھانا کھلاتے ہیں جس سے ہمارے مذہب کو نقصان پہنچ رہا ہے۔کاشی نریش نے روی داس کو بلا کر اس کی حقیقت دریافت کی۔انہوں نے جواب دیا کہ انسان کی تخلیق پانچ عناصر سے ہوئی ہے۔سورج سب کو روشنی بخشتا ہے، ہوا سب کے لیے چلتی ہے۔چمار اور نیچ وہی ہے جو رام بھجن نہیں کرتا اور دوسروں کو دکھ دیتا ہے۔خدا کی بندگی کرنا کسی ذات یا قوم کی میراث نہیں ہے۔رام کا دربار سب کے لیے کھلا ہوا ہے اور میں یہی کر رہا ہوں۔

کاشی نریش نے ان باتوں سے متاثر ہوکر ان کو ایک اونچا مقام عطا کیا۔

سنت روی داس نے ۱۵۹۷ بکرمی میں انتقال کیا۔

افغانیوں کا بنارس پر حملہ:

۹۳۳ھ م ۱۵۲۶ء میں جب سکندر لودی [متوفی ۱۵۱۷ء] کے لڑکے سلطان ابراہیم لودی کو ظہیر الدین بابر [متوفی ۱۵۳۰ء] نے شکست دی جس میں ابراہیم لودی مارا گیا۔ اس وقت افغانی پٹھانوں نے بنارس کی سلطنت پر قبضہ کرلیا جو صوبۂ بہار میں آباد ہو گئے تھے اور دریا خاں عرف محمد سلطان نے بنارس میں حکومت شروع کردی لیکن ۹۴۳ھ م ۱۵۳۶ء میں ہمایوں بادشاہ [متوفی ۱۵۵۶ء] نے محمد سلطان کو شکست دی اور غازی پور کے مقامات شاہ بابر کے نام سے فتح کر لیے۔ لیکن ہمایوں کے واپس جانے کے بعد پٹھانوں نے پھر قبضہ کرلیا۔

۹۳۶ھ م ۱۵۲۹ء میں شاہ بابر نے بنارس پر فوج کشی کی اور چنار گڑھ کے قلعہ سے کشتی پر شاہی فوج بنارس فتح کرتی ہوئی غازی پور اور بہار تک چلی گئی۔ شاہ بابر نے عبدالعلی خان نامی ایک شخص کو بنارس کا ناظم مقرر کیا، مگر اس کے واپس ہونے کے بعد پٹھانوں نے بنارس پر پھر حملہ کیا اور عبدالعلی خان کو قتل کر کے جونپور کی سلطنت از سر نو قائم کی اور اپنے سردار دریا خاں کے لڑکے پہاڑ خاں کو مقرر کیا۔

شاہ بابر نے نہ صرف بنارس اور جون پور کی سلطنت کو از سر نو قائم کیا، بلکہ اودھ تک فوج کشی کرنے کے بعد پٹھانوں کو اودھ سے بھی نکالنے میں کامیابی حاصل کی، حتیٰ کہ گوالیار تک بڑھ گیا۔ گوالیار کو فتح کرنے کے بعد بابر پھر بنارس، اس کے بعد غازی پور آیا۔

اس فتح کی خوشی میں بابر نے اودھ کے ایک مشہور خطہ اجودھیا میں وہاں کے مقامی حاکم میر باقی کو ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا جو 'بابری مسجد' کے نام سے اس وقت عالم اسلام میں مشہور ہو گئی ہے۔ یہ مسجد ۹۳۵ھ م ۱۵۲۹ء میں تعمیر ہوئی، مسجد پر ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے، جس میں ''بود خیر باقی'' سے مسجد ہٰذا کا سال تعمیر [۹۳۵ھ] برآمد ہوتا ہے۔ کتبہ کا اردو ترجمہ یہ ہے[۱]:

۱] شاہ بابر کے فرمان کے مطابق جن کے عدل وانصاف نے ایسی عمارت تیار کی جو آسمان کے محل کی ہمسری کر رہی ہے۔

۲] فرشتوں کے نازل ہونے کا یہ مقام امیر سعادت نشان میر باقی نے تیار کیا۔

۳] "بود خیر باقی" جب اس کی تعمیر کا سال ہوا تو یہ بات عیاں ہے کہ یہ تعمیر خیر محکم اور اور مضبوط ہوگئی[2]

آج اسی بابری مسجد کو رام جنم بھومی بتلا کر بغض وعداوت کی آگ بھڑکائی جارہی ہے اور نام نہاد فرقہ پرست مورخین دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں[3]۔

---

[1] اس کے علاوہ مسجد کے درمیانی در کے اوپر دو میٹر اونچی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی پتھر کی تختی کا ایک کتبہ نصب تھا جس میں یہ اشعار کندہ تھے:

بنام آنکہ او دانائے اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفیٰ بعد از ستائش — کہ سرور انبیاء زبدہ جہانی
فسانہ در جہاں بابر قلندر — کہ شد در دور گیتی کامرانی
چنانکہ ہفت کشور در گرفتہ — زمیں راچوں مثالے آسمانی
دراں حضرت یکے میرے معظم — کہ نامش میر باقی اصفہانی
مشیر سلطنت تدبیر ملکش — کہ ایں مسجد حصار بست بانی
خدایا در جہاں تابندہ ماند — کہ چتر و تخت وبخت و زندگانی
دریں عہد و دریں تاریخ میموں — کہ نہ صد بج وسی بودہ نشانی

ع ب نعمانی۔ [بحوالہ ماہنامہ 'دار العلوم' دیوبند ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء]

[2] یہ اشعار اندرون مسجد منبر کے دائیں بائیں دونوں جانب نصب کردہ کتبہ میں کندہ تھے۔ اوپر متن میں جس کتبے کا اردو ترجمہ تحریر کیا گیا ہے وہ بائیں جانب نصب تھا۔

[دائیں جانب]

بمنشائے بابر خدیو جہاں — بنائے کہ با کاخ گردو عناں
بماند ہمیشہ چنیں بانشیں — چناں شہریار زمین وزماں

[بائیں جانب]

بنا کرد ایں خانہ پائیدار — امیر سعادت نشاں میر باقی
بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش — بنائیست باکاخ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبط قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی وسال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

[ایضاً]

[3] بابری مسجد پر خصوصی نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بابری مسجد : ایک تفصیلی نوٹ
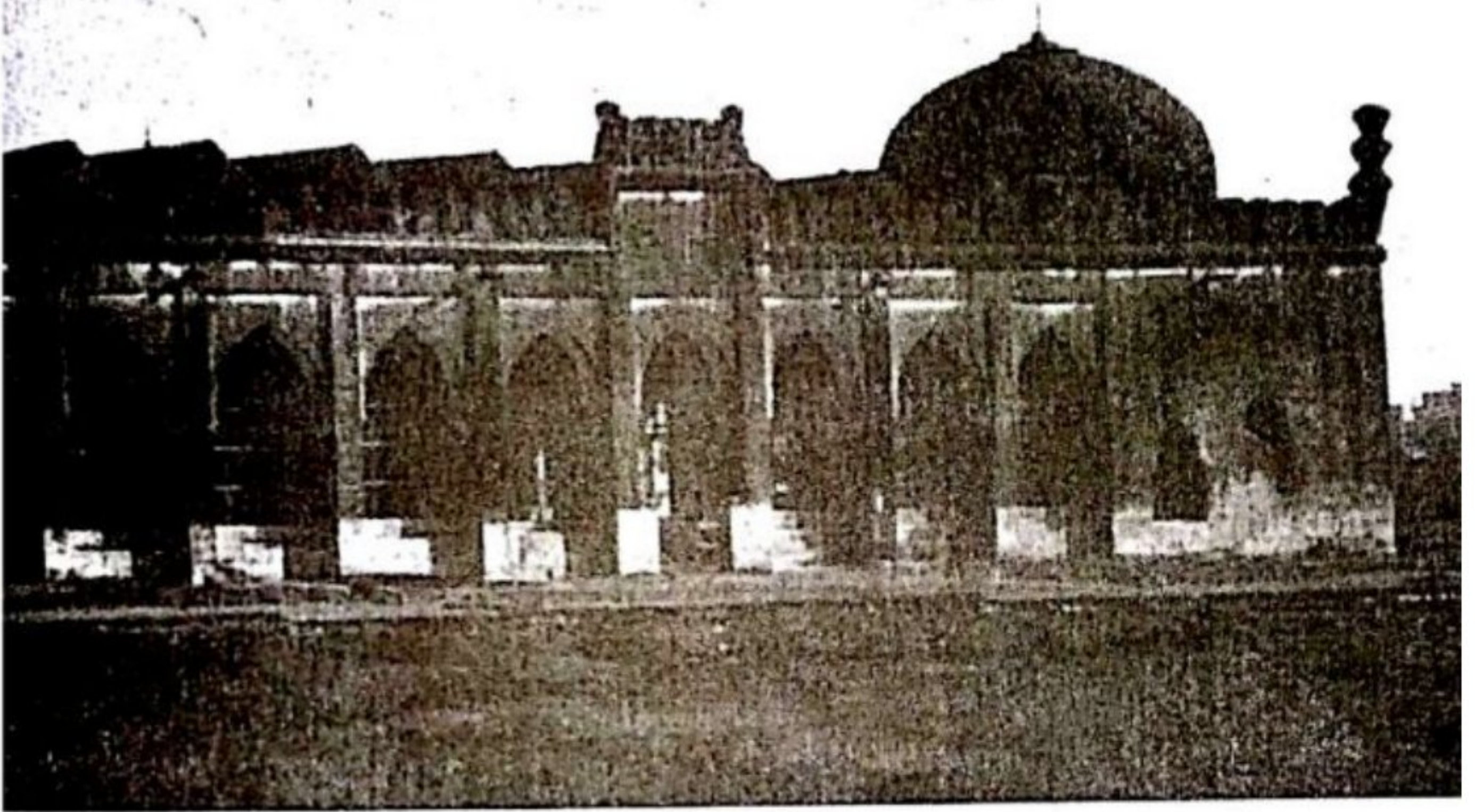
بابری مسجد اسلامی مغل فن تعمیر کے اعتبار سے ایک شاہکار تھی۔ اس مسجد کے اوپر تین گنبد تعمیر کیے گئے تھے جن میں درمیانی گنبد بڑا اور اس کے ساتھ دو چھوٹے گنبد تھے۔ گنبد کے علاوہ مسجد کو پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا جس میں صحن بھی شامل تھا۔ صحن میں ایک کنواں بھی کھودا گیا تھا۔ گنبد چھوٹی اینٹوں سے بنا کر اس پر چونا کا پلاسٹر کیا گیا تھا۔ مسجد کو ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے اس کی چھت کو بلند بنایا گیا۔ روشنی اور ہوا کے لیے جالی دار کھڑکیاں نصب تھیں۔ اندرونی تعمیر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ محراب میں کھڑے شخص کی سرگوشی کو بھی مسجد کے کسی بھی اندرونی حصے میں آسانی سے سنا جا سکتا تھا۔ مسجد کے مسقف حصہ میں تین صفیں تھیں اور ہر صف میں ایک سو بیس نمازی کھڑے ہو سکتے تھے۔ صحن میں چار صفوں کی وسعت تھی۔ اس طرح بیک وقت ساڑھے آٹھ سو مصلی نماز ادا کر سکتے تھے۔

ابتدائے تعمیر سے بابری مسجد میں نماز پنجگانہ اور جمعہ ہوتا رہا ہے۔ عدالتی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک اس مسجد کے امام وخطیب محمد اصغر نامی شخص تھے۔ ۱۸۷۰ء تا ۱۹۰۰ء کی درمیانی مدت میں مولوی عبدالرشید نے امامت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصہ میں یہ خدمت مولوی عبدالقادر کے سپرد رہی، اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء تک [یعنی مسجد میں مورتی رکھے جانے کی تاریخ تک] مولوی عبدالغفار کی اقتداء میں مسلمان اس مسجد میں نماز پنجگانہ اور جمعہ ادا کرتے تھے۔

بابری مسجد کے مصارف کے واسطے عہد مغلیہ میں مبلغ ساٹھ روپے سالانہ شاہی خزانے سے ملتے تھے۔ نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ چھ پائی کر دی گئی تھی۔ برطانوی دور اقتدار میں بھی یہ رقم بحال رہی۔ پھر بندوبست اول کے وقت نقد کی بجائے دو گاؤں بھورن پور اور شولا پور متصل اجودھیا اس کے
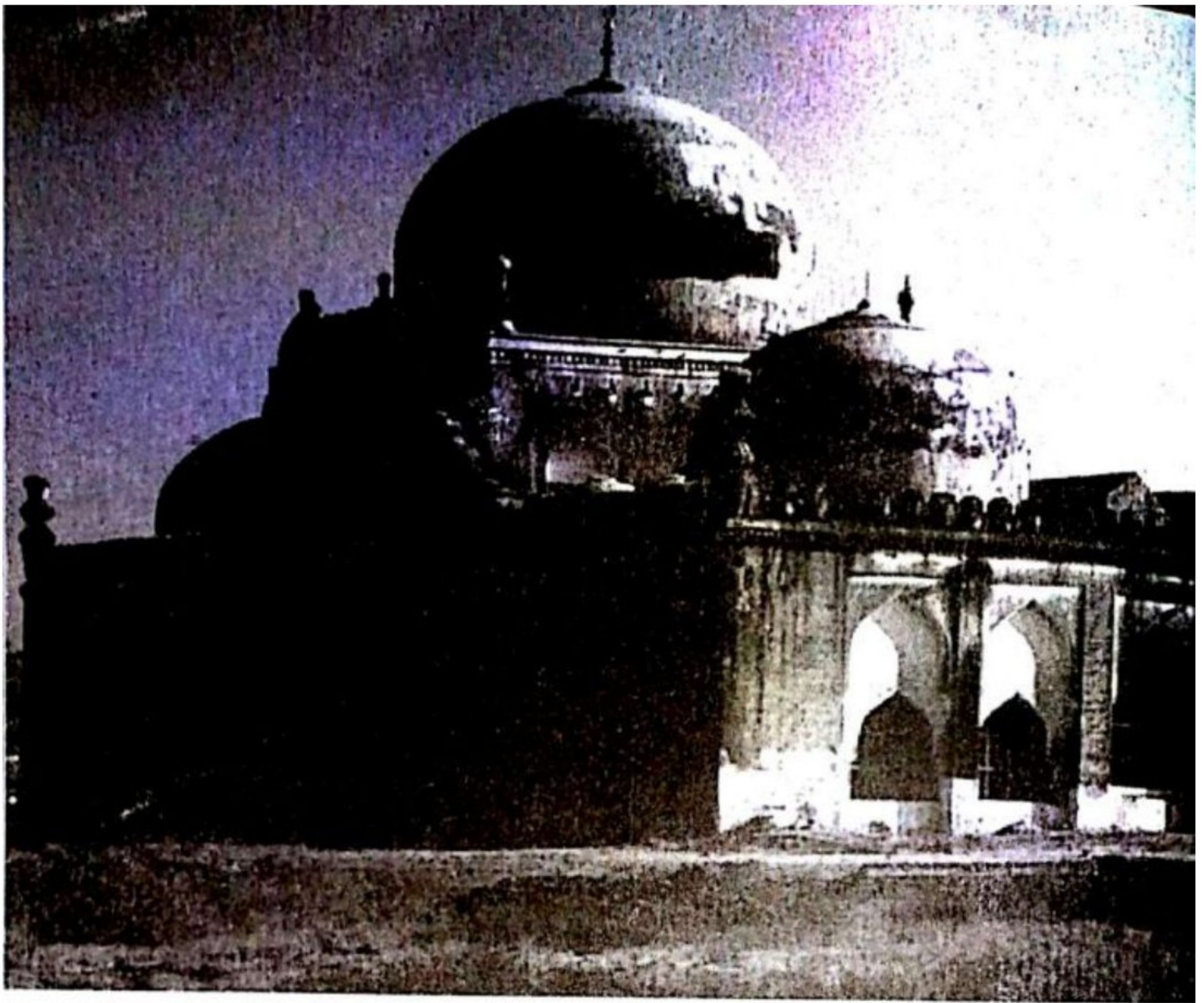
مصارف کے لیے دیے گئے۔ غرض کہ اپنی ابتداء تعمیر سے ۱۹۴۹ء تک یہ مسجد بغیر کسی نزاع واختلاف کے مسجد ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک مقدس ومحترم عبادت گاہ رہی اور مسلمان امن وسکون کے ساتھ اس میں عبادت کرتے رہے۔ [ایضاً]

لیکن افسوس کہ اس جمہوری ملک کے فرقہ پرستوں نے دن کے اجالے میں جمہوریت کا خون کرتے ہوئے یہاں کے 'اعلیٰ رہنماؤں' اور نیم فوجی دستوں کے سینکڑوں مسلح جوانوں کی موجودگی میں ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو اس مسجد کو شہید کر ڈالا۔ اناللہ و اناالیہ راجعون۔

اس اندوہناک واقعہ کے بعد دہلی اور ممبئی سمیت ہندوستان میں تقریباً دو ہزار مسلمانوں کو ہندو مسلم فسادات میں مار ڈالا گیا۔ جب کہ اس مسجد کی شہادت سے قبل ہندوؤں کے ایک مظاہرہ کے منتظمین نے یہ یقین دہانی کی تھی کہ مسجد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اس مظاہرے میں ہندوستان بھر سے تقریباً ڈیڑھ سے دو لاکھ لوگوں نے شرکت کی تھی۔ یہ مسجد ہندوؤں کے نظریہ کے مطابق رام کی جائے پیدائش پر یا رام مندر پر تعمیر کی گئی تھی، جبکہ مسلمان اس فاسد اور بے بنیاد نظریہ کو مسترد کرتے ہیں۔ شرپسندوں کی جانب سے عائد کیا ہوا یہ الزام کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کی ابتداء سال تعمیر ہی سے ہوگئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس معاملے نے کبھی اتنی شدت اختیار نہیں کی جتنی کہ ملک کی آزادی کے بعد ہوئی۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو [م ۱۹۶۴ء] کے حکم سے ۱۹۴۹ء میں مسجد میں تالا لگوا دیا گیا۔

بابری مسجد کا تنازعہ آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان باقی ہے اور اس کا مقدمہ اس وقت سپریم

کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ ذیل میں بابری مسجد سے متعلق اہم معلومات ملاحظہ فرمائیں:

۱۵۲۹ء: سال تعمیر۔

۱۸۵۳ء: ایودھیا کے پہلے مذہبی فسادات۔

۱۸۵۹ء: برطانوی نوآبادیاتی حکومت کی جانب سے عبادت کی جگہ تقسیم کردی گئی۔

۱۹۴۹ء: مسجد کے اندر رام کی مورتی رکھی گئی، بعدہ حکومت نے اسے متنازعہ قرار دے کر مسجد میں تالا لگا دیا گیا۔

۱۹۸۴ء: وشو ہندو پریشد کی جانب سے مفروضہ 'رام کی جائے پیدائش' کو آزاد کروانے کے لیے تحریک کا اعلان۔

۱۹۸۶ء: ضلعی عدالت کی جانب سے ہندوؤں کو متازعہ مقام پر پوجا کی اجازت، اور مسلمانوں کی جانب سے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا قیام۔

۱۹۸۹ء: وشو ہندو پریشد نے مسجد سے ملحقہ زمین پر رام مندر کی بنیاد رکھی۔

۱۹۹۰ء: وشو ہندو پریشد کے حامیوں نے مسجد کو جزوی طور پر نقصان پہنچایا۔ حکومت ہند کی جانب سے مسئلے کے حل کی کوشش۔

۱۹۹۱ء: ریاست اتر پردیش میں بی، جے، پی حکومت کا قیام۔

۱۹۹۲ء: وشو ہندو پریشد کے حامیوں کی جانب سے بابری مسجد کی شہادت۔ ہندو مسلم فسادات۔ تین ہزار افراد ہلاک

۲۰۰۱ء: انہدام کے ۹ برس مکمل ہونے پر وشو ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کا عزم نو۔

جنوری ۲۰۰۲ء: اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کے دفتر میں 'ایودھیا سیل' کا قیام۔

فروری ۲۰۰۲ء: بی، جے، پی کی جانب سے انتخابی منشور میں سے رام مندر کی تعمیر کی شق خارج۔ ایودھیا سے واپس آنے والے ہندوؤں کی ٹرین میں آتش زنی۔ ۵۸ رہلاک اور پھر اس واقعہ کا مسلمانوں کو ذمہ دار تصور کرتے ہوئے اس کے ردعمل میں گجرات کا فساد۔ وشو ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کے آغاز کے لیے ۱۵ مارچ کی تاریخ کا اعلان۔

اپریل ۲۰۰۲ء: ایودھیا کے متنازعہ مقام کی ملکیت کے بارے میں مقدمے کی سماعت کا آغاز۔

جنوری ۲۰۰۳ء: ماہرین آثار قدیمہ کی جانب سے عدالت کے حکم سے متنازعہ مقام کے جائزے کا آغاز۔

اگست ۲۰۰۳ء: ماہرین آثار قدیمہ کی جانب سے مسجد کے نیچے مندر کی موجودگی کے شواہد کا اعلان۔ مسلمانوں کی جانب سے اعتراضات۔

ستمبر ۲۰۰۳ء: عدالت کی طرف سے بابری مسجد کے انہدام پر اکسانے کے الزام میں سات ہندو رہنماؤں پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ۔

اکتوبر ۲۰۰۳ء: مسلم تنظیموں کی جانب سے ماہرین آثار قدیمہ کی رپورٹ کو مکمل طور پر مسترد کرنے کا مطالبہ۔

دسمبر ۲۰۰۳ء: انہدام کی گیارہویں برسی پر حیدرآباد دکن میں فسادات۔

جولائی ۲۰۰۴ء: شیوسینا کے رہنما بال ٹھاکرے کی جانب سے مسئلے کے حل کے لیے متنازعہ مقام پر قومی یادگار کی تعمیر کی تجویز۔

اکتوبر ۲۰۰۴ء: ایڈوانی کی جانب سے مندر کی تعمیر کے عزم کا اعادہ۔

نومبر ۲۰۰۴ء: الٰہ آباد ہائی کورٹ کی جانب سے بابری مسجد معاملے میں ایڈوانی کو نوٹس۔

اکتوبر ۲۰۱۰ء: الٰہ آباد ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں بابری مسجد کی زیادہ تر زمین ہندوؤں کو دے دی۔

ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

شیر خاں ناظم بنارس:

پہاڑ خاں نے اپنے سپہ سالار شیر خاں[1] کو بنارس کا ناظم مقرر کیا جو آگے چل کر شیر خاں، اس کے بعد شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہوا اور سارے ہندوستان کا ایک نامور بادشاہ بنا۔

۹۳۷ھ م ۱۵۳۰ء میں شاہ بابر کے انتقال بعد جب اس کی جگہ نصیر الدین محمد ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس وقت وہ ابھی بائیس سال کا نوجوان تھا اور ضرورت سے زیادہ نرم دل۔ اس لیے شیر شاہ نے اسے شکست دے کر ایران کی طرف بھگا دیا اور سوری حکومت کی بنیاد ڈالی۔ یہ خاندان تقریباً پندرہ سال تک ہندوستان میں حکمراں رہا۔

ہمایوں نے تخت سنبھالتے ہی چنار گڑھ کے قلعہ میں اپنا قبضہ جمانا چاہا جو شیر خاں کی تحویل میں تھا۔ چنانچہ اس نے جب قلعہ خالی کرنے کا پیغام بھیجا تو شیر خاں نے نہیں مانا، جس کے نتیجے میں ہمایوں نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا، جیسا کہ بلونت نامہ خیر الدین میں لکھا ہے کہ:

> " بعدازاں بجانب چنار رفتند وچنار وبنارس را گرفتہ، شیر خاں درچاہ کندہ بود و بخدمت حضرت عرض داشت کرد کہ بندۂ پیر غلام شماست مارا سرحدے بستہ بدہن کہ درآنجا نشستہ باشم۔"

لیکن ناکامی کا منھ دیکھ کر ہمایوں دہلی واپس ہو گیا۔ پھر ۹۳۸ھ م ۱۵۳۱ء میں ہمایوں کی شاہی فوج نے چنار گڑھ کے قلعہ کا دوبارہ محاصرہ کیا اور قلعہ فتح کر لیا۔ شیر خاں نے چنار

---

[1] اس کا اصل نام تو فرید خاں تھا، لیکن 'شیر شاہ' کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس لقب کے پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ بہار کے بادشاہ کی ملازمت کے دوران اس نے تلوار سے شیر کا شکار کر کے شیر کو قتل کر دیا تھا۔ اسی بہادری کے نتیجے میں شاہ بہار نے اسے شیر خاں کا لقب دیا۔ اس کے دادا ابراہیم خاں سوری اُن افغانی پٹھانوں کی نسل سے تھے جو سوری کہلاتے تھے۔ یہ تلاش معاش کے لیے ہندوستان اس وقت آئے تھے جب یہاں بہلول لودی [متوفی ۱۴۸۸ء] کی حکومت تھی۔ یہیں پر حسن خاں کی ولادت ہوئی جو شیر شاہ سوری کے والد تھے۔ شیر شاہ سوری ایک نہایت پختہ عالم باعمل تھا۔ نماز پنجگانہ کے ساتھ تلاوت، تہجد و اشراق کا سختی سے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ مشقت پسند اور محنتی انسان تھا۔ عیش پرستی و بدچلنی سے اس کو سخت نفرت تھی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ اردو کی چوتھی، از مولوی اسمٰعیل میرٹھی]

سے نکل کر گرہ رہتاس کے قلعوں پر قبضہ کرلیا اور ان کے ذریعے سے بنگال اور بہار کی سلطنت قائم کی۔

عثمان خاں حاکم بنارس:

اسی شیر شاہ سوری نے بنارس میں اپنی سلطنت کے زمانے میں ۹۴۷ھ م ۱۵۴۰ء میں عثمان خاں کو جنہیں حکومت کے انتظامات کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ بنارس کا حاکم علیٰ مقرر کیا۔ بنارس میں محلّہ عثمان پورہ انہیں کے نام سے موسوم ہے۔

میر فضل علی خاں حاکم بنارس:

شیر شاہ ہی کے زمانے میں بنارس کی سلطنت پر ہمایوں نے قبضہ کیا اور میر فضل علی خاں کو بنارس کا حاکم بنایا۔ شاہ ہمایوں نے اس عہد نامے[1] کی مخالفت کی جو اس کے اور شیر خاں کے درمیان ہوا تھا، اور دوبارہ بنگال پر ۹۴۵ھ م ۱۵۳۸ء میں حملہ کیا، جس کے نتیجے میں شیر شاہ نے بنارس پر حملہ کر کے سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ میر فضل علی بھی قتل کیے گئے۔

ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان مذکورہ محاذ آرائی ۲۶/جون ۱۵۳۹ء کو مقام 'چوسا[2]' میں ہوئی جو بنارس سے تقریباً اسّی میل پورب میں واقع ہے۔ اس محاذ میں شاہی فوج کو شکست ہوئی اور ہمایوں دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ شیر خاں نے اس کا تعاقب کیا

---

[1] اس عہد نامہ کی تفصیل یہ ہے کہ ہمایوں جب قلعہ چنار فتح کر کے بنارس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ شیر شاہ سارے بنگال پر قابض ہو چکا ہے تو اس نے یہی مناسب سمجھا کہ شیر شاہ جیسے مضبوط دشمن سے صلح کر لینے کے بعد اسے دوست بنالیا جائے۔ چنانچہ ہمایوں کا قاصد شیر شاہ کے پاس آیا تو شیر شاہ نے اسے جواب دیا کہ اگر بادشاہ بنگال سے باز آجائے تو اس کے لیے بھی آمادہ ہوں کہ بہار بادشاہ کے حوالے کردوں اور بنگال سے بھی بادشاہ کو دس لاکھ روپے سالانہ بھیجتا رہوں، بشرطیکہ بادشاہ آگرہ چلا جائے۔ جب ہمایوں نے یہ شرائط سنیں تو بہت خوش ہوا، کیونکہ وہ بنگال سے زیادہ بہار کا خواہشمند تھا اور وہ اسے مفت میں مل رہا تھا۔ بالآخر اسی پر صلح ہوگئی۔ لیکن دو تین ہی دن کے بعد بنگال کے بادشاہ وکیل نے ہمایوں کو شیر شاہ کے خلاف ایسا ورغلایا کہ اس نے عہد شکنی کر کے بنگال پر پھر سے چڑھائی کردی۔ [ہندوستان پر اسلامی حکومت۔ ص ۵۲۔۱۵۱] ع ب نعمانی [حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر]

اور قنوج میں ہمایوں کو شکست دے کر شیر شاہ کے خطاب سے ۹۴۷ھ م ۱۵۴۰ء میں دہلی کا تخت نشین ہوا۔ ہمایوں کو شکست دے کر بنگال سے پنجاب تک شیر شاہ کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ شیر شاہ اس آن بان کا آدمی تھا کہ معلوم نہیں کیا کر گزرتا، لیکن افسوس کہ عمر نے ساتھ نہ دیا اور بادشاہت کے پانچویں برس ۹۵۲ھ م ۱۵۴۵ء میں بندیل کھنڈ کے مشہور قلعہ کالنجر پر دھاوا کیا تھا کہ بارودخانہ میں آگ لگ گئی اور اس میں ایسا جھلسا کہ بچ نہ سکا۔

شیر شاہ کے رفاہ عام کے کارنامے زندۂ جاوید ہیں۔ ان میں سب سے اہم چیز گرینڈ ٹرنک روڈ [شیر شاہ سوری روڈ] ہے جو پشاور سے لاہور، امرت سر، کان پور، بنارس، آسنسول ہوتی ہوئی کلکتہ چلی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے کنویں، سرائیں اس کی یادگار ہیں۔

جلال خاں المقلب بہ سلیم شاہ ابن شیر شاہ سوری:

شیر شاہ سوری کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری ۹۵۲ء م ۱۵۴۵ء میں بادشاہ ہوا اور نو سال تک اپنے باپ کا نام زندہ رکھا۔ اس کے بعد ۹۶۰ھ م ۱۵۵۳ء سے ۱۵۵۷ء تک عادل شاہ[1] تخت پر بیٹھا۔ لیکن یہ اتنا نکما نکلا کہ باپ دادا کی عزت خاک میں مل گئی۔

[گزشتہ صفحے کا بقیہ]

۲۔ افسوس کہ حکومت کی لاپرواہی کے باعث چوسا کے اس تاریخی میدان کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ غازیپور سے تقریباً ۲۵ کیلومیٹر پورب میں واقع موضع بارا کے اس تاریخی میدان میں یہ جو عظیم جنگ لڑی گئی، اپنے آپ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو کہ اب مٹنے کے دہانے پر ہے۔ یہ میدان قرون وسطیٰ کی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم باب اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، لیکن اب اس مقام پر ایسا کچھ نہیں دکھلائی دیتا جس سے یہاں کی تاریخی حقیقت کا کچھ پتہ چل سکے۔ اس میدان تک پہنچنے کے لیے کیچڑ سے لتھ پتھ راستے اور مویشیوں کے طبیلے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اگر بھولے سے کوئی سیاح یہاں آ بھی جاتا ہے تو منھ پر رومال رکھ کر ہی اس انمول وراثت سے روبرو ہوتا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ اور ضلع انتظامیہ کی چشم پوشی کے نتیجے میں یہ میدان ناجائز قبضوں کا بھی شکار ہونا شروع ہو چکا ہے۔ اس میدان میں ایک کالم بنا ہوا ہے، جس پر اس تاریخی جنگ کے تعلق سے کچھ ضروری باتیں تحریر ہیں۔ غرض یہ میدان ایک ویران اور کھنڈر کی شکل میں ایک طویل عرصہ سے اپنی قسمت پہ آنسو بہا رہا ہے۔ ع ب نعمانی

---

[1] اس کا اصل نام محمد تھا، سلطنت پر قابض ہونے کے بعد یہ لقب اختیار کیا اور ۱۵۵۷ء میں مارا گیا۔ ع ب نعمانی

ہندووزیر ہیمو بقال[1] نے اس کو اور بھی تباہ کر ڈالا سارے ملک میں جھگڑے اور فساد اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر بھگا دیا تھا جس کے بعد ہمایوں راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستانوں میں پریشان پھرتا رہا اور یہیں امرکوٹ کے مقام پر اس کا بیٹا اکبر پیدا ہوا۔ پھر وہاں سے ایران گیا جہاں کے بادشاہ طہماسپ[2] اس کے ساتھ بڑے حسن سلوک سے پیش آیا اور پھر اسے فوج دی، جس کی مدد سے اس نے ۹۵۲ھ م ۱۵۵۵ء میں قندھار اور ۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء میں کابل فتح کیا۔ پھر ۱۵۵۴ء میں ملک ہندوستان آیا اور دہلی و آگرے پر قابض ہو گیا۔ پھر اس نے عادل شاہ اور ہیمو بقال کا یہ تماشہ دیکھا تو اس کے لیے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ اتفاق سے ایک روز کسی طرح اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے پھسلا اور گر کر مر گیا[3]

---

[1] یہ عادل شاہ کا وزیر اعظم تھا، ۱۵۵۶ء میں پانی پت میں مغل فوجوں سے مقابلہ کرتے ہوئے انہی کے ہاتھوں سے اس کی آنکھ میں تیر لگا پھر گرفتار ہوا، اور بعد میں بیرم خاں [م ۱۵۶۱ء] کے ہاتھوں اس کا قتل ہوا۔ ع ب نعمانی

[2] یہ ایران کی حکومت صفویہ کے بانی شاہ اسمٰعیل [متوفی ۹۳۰ھ] کا بیٹا تھا، مروت، سخاوت، جزم و عزم میں مشہور تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد دس سال کی عمر میں تخت حکومت پر بیٹھا اور ۵۳ سال حکومت کرنے کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ [تاریخ ایران، از: سرجان مالکم۔ ص ۲۸۵] ع ب نعمانی

[3] یہ واقعہ ۱۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو پیش آیا۔ ع ب نعمانی

دور اکبری

تاریخ مغلیہ کا زریں دور

اکبر کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال کی تھی کہ اس کے باپ ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت وہ ہمایوں کے اتالیق بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں تھا۔ اس نے ہیمو بقال کے مقابلے کی خبر سن کر حملہ کیا، ہیمو پانی پت کے میدان میں گرفتار کر کے مارا گیا۔ یہ واقعہ ۹۶۴ھ م ۱۵۵۶ء کا واقعہ ہے۔

اکبر نے اپنی عقلمندی اور دانائی سے بغاوتوں اور جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا اور جلد ہی سارے ہند میں اکبر کا سکہ چلنے لگا اور چالیس پچاس سال کے عرصے میں قندھار سے لے کر آسام کی پہاڑیوں تک اور کشمیر سے حیدر آباد کے کناروں تک سلطنت کی حدیں پھیل گئیں اور اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوگئیں کہ تقریباً تین سو برس تک مغلوں کا نام زندہ رہا۔

خان زمان علی قلی خاں والی بنارس:

۹۶۳ھ م ۱۵۵۵ء میں شہنشاہ اکبر [متوفی ۱۶۰۵ء] نے اپنی تخت نشینی کے زمانے میں دہلی کی مرکزی سلطنت کو مستحکم کیا۔ اکبر کے حکم سے خاں زماں علی قلی خاں حاکم اعلیٰ دارالامارت جون پور نے ۹۶۴ھ م ۱۵۵۶ء میں شیر شاہ کے پوتے شیر شاہ ابن عادل شاہ [جو بنارس، غازی پور، چنار وغیرہ پر قابض ہو گیا تھا اور بنارس میں بھی کچھ عرصہ تک اس کی حکومت رہ چکی تھی] کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ خان زماں علی قلی خاں کے قابض ہونے کے بعد بنارس غازی پور، چنار وغیرہ صوبہ جونپور میں شامل ہو گئے۔

اکبر کی سلطنت کے زمانے میں خان زماں علی قلی خاں کے ساتھ بہادر خاں نامی شخص کا بھی بڑا اعزاز تھا۔ مغل سرائے کے قریب 'علی نگر' اور دریائے گنگا کے اس پار 'بہادر پور' نامی علاقہ اُنہی دونوں کی طرف منسوب ہے۔

خاں زماں علی قلی خاں نے جب غازی پور پر قبضہ کیا تو قصبہ زمانیہ آباد کیا اور یہی اس کا مرکز حکومت تھا۔

بنارس میں علی قلی خاں کی قبر ایک اونچے چبوترے پر باقر کنڈ متصل علوی پورہ حضرت فخر الدین شہیدؒ کے مقبرے سے قریب ہی ہے۔ اس پر ایک بڑا کتبہ لگا ہوا ہے، لیکن اس کے حروف بالکل مٹ چکے ہیں۔

راجا ٹوڈرمل حاکم بنارس:

اکبر بادشاہ نے اپنے دور حکومت میں راجا ٹوڈرمل[1] کو بھی بنارس کا حاکم مقرر کیا اور بے شمار جاگیریں عطا کیں۔ اس کی مدت حکومت زیادہ نہیں تھی۔ بنارس میں کٹرہ ٹوڈرمل اسی راجا کی یادگار ہے۔

مرزا عبدالرحیم خانخاناں:

یہ بیرم خاں [مقتول ۱۵۶۱ء] کے بیٹے تھے۔ اکبر بادشاہ بنگال کی فوج کشی کے

---

[1] یہ دربار اکبری کا رکن اعظم تھا۔ کھتری قوم سے تعلق تھا۔ عہد طفلی ہی میں غربت وافلاس اور یتیمی کی تکلیفیں جھیل کر بڑا ہوا تو محرران شاہی کے زمرے میں داخل ہوا۔ علم ریاضی کا ماہر تھا۔ حسن لیاقت اور صلاحیت کی بنیاد پر جلد ہی شاہی وزارت اور سپہ سالاری کا منصب حاصل کر لیا۔ دس سالہ بندوبست اسی کی طرف منسوب ہے۔ بعض تاریخ نویسوں کے مطابق رعایہ پر ظلم وناانصافی اس کی عادت میں شامل تھی، جس کی وجہ سے عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ اس سے ناراض تھا اور یہ ناراضگی اس کی زندگی کے آخر تک تھی۔ اس کی تائید ذیل کے قطعہ تاریخ سے بھی ہوتی ہے:

ٹوڈر آنکہ ظلمش آفاق راگرفتہ   چوں شد سوی جہنم گشتند خلق خرم

تاریخ رفتن او از پیر عقل جستم   شادی کناں بگفتا 'وی رفت در جہنم'

۹۹۸ھ

۸/نومبر ۱۵۸۹ء مطابق ۹۹۸ھ کو بمقام لاہور انتقال ہوا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: مفتاح التواریخ۔ ص ۱۹۴۔ ع ب نعمانی

ارادہ سے براہ کشتی بنارس آیا اور یہاں تین روز قیام کرنے کے بعد براہ کشتی پٹنہ روانہ ہوگیا۔ بنگال کی فتحیابی کے بعد منعم خاں خانخاناں کو وہاں کا صوبہ دار مقرر کیا اور بنارس، جون پور، چنار، غازی پور اور زمانیہ کا خاص انتظام اپنی ذمہ داری میں لے لیا۔

اس زمانے میں بنارس میں ایک منصب نظامت قائم کیا گیا۔ مرزا میرا ک رضوی، پھر شیخ ابراہیم سکری اس عہدہ نظامت پر مامور ہوئے۔ پھر ۹۸۴ھ م ۱۵۷۶ء میں جون پور میں صوبہ داری قائم کی گئی اور بنارس بھی اس صوبہ داری میں شامل ہوگیا۔

۹۹۸ھ م ۱۵۸۹ء میں مرزا عبدالرحیم خانخاناں جونپور و بنارس کے صوبہ دار مقرر ہوئے جن کی علم دوستی سے بنارس فیضیاب ہوا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے ہندی دوہے بہت مشہور اور ہندی شاعری کا ایک گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ۱۶۲۷ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

تلسی داس:

خانخاناں کے ذکر کے بعد ناانصافی ہوگی کہ دسویں صدی ہجری کے ہندی شاعر تلسی داس کا تذکرہ نہ کیا جائے، جو نہ صرف سنسکرت کے عالم تھے بلکہ عربی اور فارسی بھی جانتے تھے۔ فارسی کے مطالعہ نے ان کا ذوق تصوف بہت بلند کر دیا تھا اور ان کی صوفیانہ شاعری بھی ہندی اور فارسی کے ملے جلے الفاظ کی آئینہ دار تھی۔ تلسی داس نے اپنی زندگی کا آخری حصہ بنارس ہی میں گزارا[1]

اکبر کے متوسلین میں راجا ٹوڈرمل بنارس میں کافی جاگیروں کا مالک تھا۔ اسے تلسی داس سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے مکانات کے نشانات اب بھی بنارس کے محلّہ کچوڑی گلی میں موجود ہیں۔ پانچ گاؤں، بھدینی، ندیسر، شیوپور، چھیتو پور، لہرتارا اسی

---

[1] مزید: یہ ۱۴۹۷ء میں ضلع باندا کے راجا پور نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک غریب برہمن کے بیٹے تھے۔ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب رام چرترمانس انہی کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ایودھیا میں لکھا تھا۔ مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے وہ بنارس میں گنگا کے کنارے اسی گھاٹ پر قیام پذیر ہوئے اور اسی جگہ ۱۶۲۳ء میں ان کی موت ہوئی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]
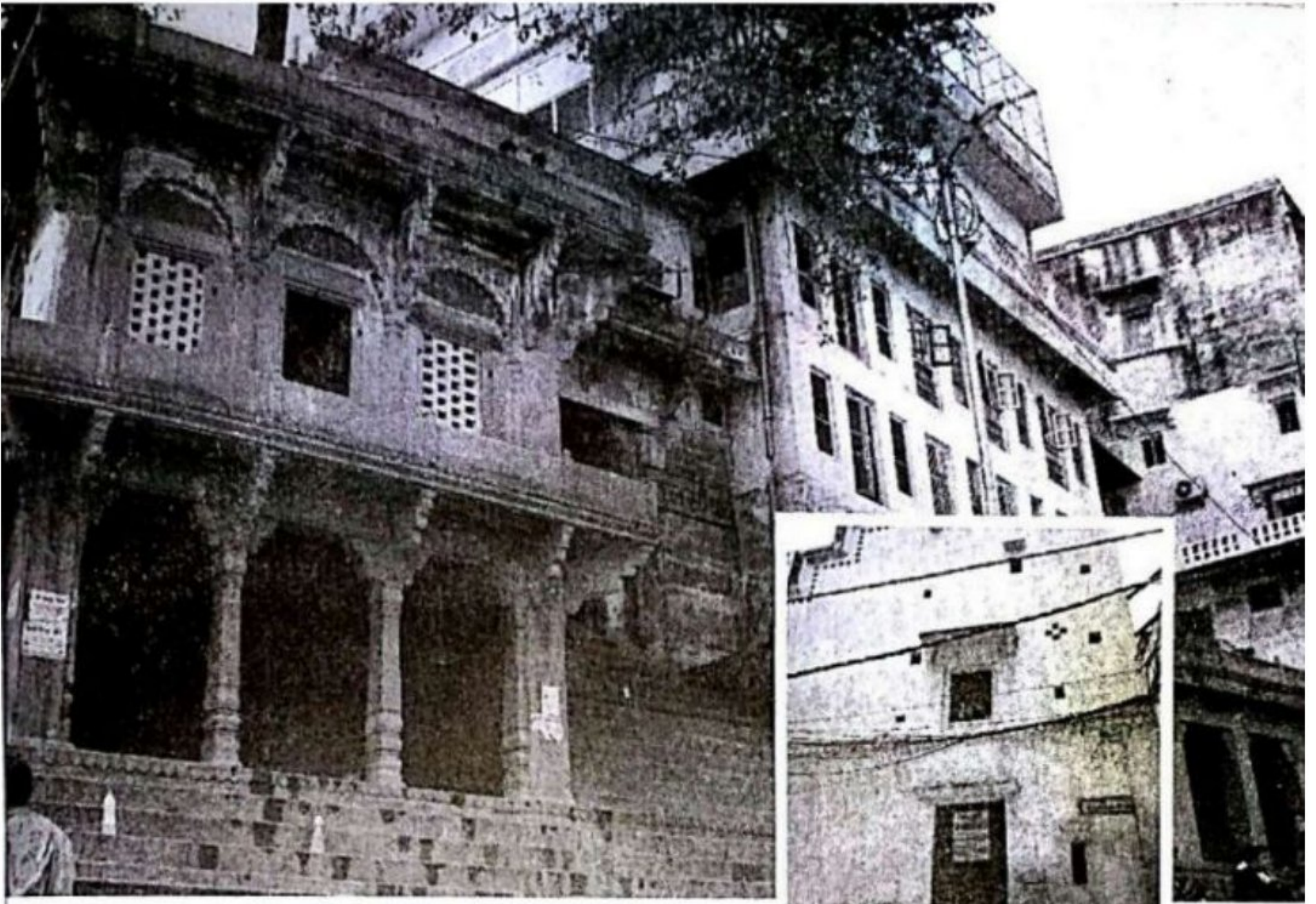
تلسی گھاٹ اور چوکھٹے میں گوپال مندر [واقع محلّہ چوکھمبا] کا وہ حجرہ جہاں
تلسی داس نے وِنَے پَترِکا لکھی تھی۔

کے ماتحت تھے۔ اب یہ سب گاؤں نہیں ہیں بلکہ شہر کے اہم محلے ہیں، جہاں ٹوڈرمل کے مکانات ہیں۔ ٹوڈرمل کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے انندرام اور پوتے کندھئی میں فساد ہوا جس میں تلسی داس حکم مقرر ہوئے اور ان کا فیصلہ گیارہ پشت تک قائم رہا۔ تلسی داس نے یہ فیصلہ فارسی میں لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فارسی سے کتنا شغف تھا۔ فیصلہ یہ ہے:

الله اکبر[1]

چون انندرام بن ٹوڈر بن دیورائے و کندھئی بن رام بھدر بن ٹوڈر درحضور آمده ودر مواضع متر وکہ تفصیل آن درھندی مذکور است بالمشافه وبتراضی جانبین قرار دادیم ،یک صدوپنجاه زمین زیاده درمواضع بھدینی انند

---

[1] اکبر کے دورِ حکومت کی تمام تحریروں کے شروع میں اللہ اکبر لکھا جاتا تھا۔ عبدالسلام نعمانی

رام مذکور و کندھئی بن رام بھدر تجویز نموده برین معنی راضی گشته.

مهرکرده :سعد الله

قسمت اندرام	قسمت کندھئی
قرعه	قرعه
نیپوره حصه ٹوڈرمل تمام	ندیسر حصه ٹوڈرمل تمام

چھیتو پوره حصه ٹوڈڑ مل تمام[1]

بنارس کے گھاٹوں میں تلسی گھاٹ انہی کے نام سے ہے جہاں انہوں نے رامائن لکھی نیز اور بھی یادگاریں ہیں۔ان کی یہ کویتا بہت مشہور ہے:

کاشی کروٹ لیت ہیں تیرتھ برت نکام
تلسی کاپا ناٹری بنا محمد نام

اکبر کی شاہی جاگیریں ہندوؤں کے نام:

اکبر کے دو حکومت میں بنارس کے برہمنوں کو بہت کچھ مراعات حاصل تھیں۔مندروں کے لیے انہیں زمین جائیداد اور جاگیریں عطا کی گئیں۔مہاراجا مان سنگھ نے ایک مندر بنوایا جو مان مندر کے نام سے مشہور ہے جس میں ایک عظیم الشان رصدگاہ بھی ہے۔

اکبر کے حکم سے مہاراجا مان سنگھ[2] نے ایک دوسرا مندر بنوایا جو 'سیتارام مندر' سے موسوم ہوا۔اس مندر کی دیوار مسجد دھرہرا کی دیوار سے لگی ہوئی ہے۔علاوہ ازیں دوسرے راجاؤں اور امیروں نے خوب دل کھول کر پوری آزادی سے مندر بنوائے

---

[1]: رسالہ ممتاز جوگی، لاہور۔بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء سے یہ فیصلہ نقل کیا گیا ہے۔عبدالسلام نعمانی

[2]: یہ آمیر [راجستھان] کے راجا اور اکبر کے بہت ہی قریبی تھے۔۱۶۱۵ء میں انتقال ہوا۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے دور حکومت میں جتنے مندر بنے اور جتنے مندروں کو جاگیریں دی گئیں، اتنی کسی بھی دور حکومت میں نہ ہوئیں۔

جنگم باڑی:

بنارس کے مشہور زمین دار 'جنگم' کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ اکبر ہی نہیں، بلکہ ہمایوں نے بھی جنگم کو بڑی گرانقدر جاگیروں سے مالا مال کیا تھا۔ چنانچہ ہم ذیل میں ہمایوں بادشاہ کا ایک فرمان نقل کر رہے ہیں جو 'ندوۃ العلماء' کے اجلاس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۴ء کے موقع پر بنارس میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ فرمان دارالمصنفین اعظم گڑھ میں آج بھی موجود ہے۔ فرمان یہ ہے:

آن نگردندو تعرض نرسانند..... واصلاً وقطعاً مزاحم بآن

زمین نشوند... بتقدیم رسانند..... تحریر ......

ایک اور فرمان ملاحظہ فرمائیں جو بادشاہ جلال الدین اکبر کی جانب سے

۱۰۴۵ھ میں لکھا گیا:

اللہ اکبر

چوں سابقاً بموجب فرمان عالی شان موازی چهارصد وهشتادبیگهه زمین از پرگنه ... بنارس دروجه مدد معاش مطیع الاسلام ملک ارجن وجنگم مقرر بوددریں ولابرعرض اشرف اقدس وسید حکم جهان مطاع صادر شدکه من ابتداء خریف سمی بیل ازجمله آراضی مذکور موازی دوصد وبست بیگهه زمین بطناب بانس ازهمان محل سابق حسب الصلاح عمدة الملک رکن السلطنة راجه ٹوڈرمل دروجه مدد معاش مشارالیهامقرر باشد که حاصلات آنراسال بسال متصرف شده بدعاگوئے دوام دولت اشتغالے نماید،می باید که حکام وکروریاں وجاگیرداران حال واستقبال پر گنه مذکوره زمین مذکور راازمحله قدیم پیموده و چک بسته بتصرف اوگزارند علت مال وجهات وسائر عوارضات چوں قتلفه وپیشکش وده نیم ومهرانه ومحصلانه جر یبانه وتکرار زراعت وکل تکالیف دیوانی مزاحمت نسازنده هرسال دریں باب پروانچه مجدد طلبیده بدارند واگردر محل دیگر خیرے داشته آنر اعتبار نکنند.

اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمایوں کے زمانے میں جس قدر جاگیر مقرر تھی اکبر نے اپنے زمانے میں اس پر اضافہ کر دیا۔

ابھی حال ہی میں جنگم باڑی کے ایک متولی نے ان تمام فرامین کا عکسی فوٹو لے کر کتابی شکل میں شائع بھی کر دیا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اکبر کے ان فرمانوں میں جو ہندووں کے نام ہیں،

ان کو مطیع الاسلام [اسلام کے فرمانبردار] کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے یہ بات ضرور تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اکبر ہندوؤں کی نہایت خاطر داری کیا کرتا تھا۔ ہندو مطیع الاسلام کے لقب سے ایک طرح کا فخر محسوس کرتے تھے۔ غالباً یہ لقب ٹوڈرمل اور دیگر ہندو امراء کی سفارش سے قرار پایا ہوگا۔

اکبر کے مذکورہ بالا فرمان میں یہ بھی لکھا ہے کہ راجا ٹوڈرمل کی سفارش سے یہ فرمان عطا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور فرمان شاہجہاں بادشاہ [متوفی ۱۶۵۸ء] کا ہے جو درج ذیل ہے:

۱۲ جمادی الثانی ۱۰۴۱ھ

چوں بموجب فرمان عالیشان، حضرت صاحب قرآن چو موازی دوصدھفتاد وھشت بیگھه زمین بنواحی دروجه مدد معاش جماعت جنگماں حسب الضمن از پرگنه حویلی بنارس سرکار مذکور مضاف به صوبه اله آباد مذکور است دریں ولاکه اسناد خودر اظاهر ساخت بنا براں حسب الحکم جاه مطاع. باید که جمله کروریان پرگنه مذکور زمین سطور رابشرط قبض تصرف ازمحل قدیم بخام دارندکه محصول حویلی مکور بدعاگوئی دوام دولت.

بنارس میں اکبر کا دور حکومت جس قسم کا گزرا ہے وہ مذہبی آزادی کا ایک مثالی دور تھا۔ ہندوؤں کو بڑی بڑی مراعات حاصل تھیں اور ہندو اتنے خوش تھے کہ جان ہتھیلی پر رکھے رہتے تھے۔ راجا مان سنگھ جس نے اکبر کی اجازت اور خاص مہربانی کی بنا پر بنارس میں مان مندر بنوایا تھا، ۹۹۶ھ م ۱۵۸۷ء میں جب بہار کا گورنر ہو کر جانے لگا اور اکبر نے بیعت کا ذکر کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ حضور اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو

آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہوں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اور اگر حضور کی مراد تبدیلی مذہب سے ہے تو ہندو ہوں، فرمایئے مسلمان ہو جاؤں اور راستہ میں جانتا نہیں کہ کون سا اختیار کروں۔ چنانچہ اکبر ٹال گئے۔ [دربار اکبری ص ۲۰۵]

اکبر کے حکم سے راجا مان سنگھ کا بنوایا ہوا 'سیتا رام مندر' دریائے گنگا کے کنارے پنچ گنگا گھاٹ پر واقع ہے، جیسا کہ اس مندر کے محضر نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ:

> شری مہاراجہ مان سنگھ بہادر بیکھنٹھ باسی در کاشی جی آمدہ بجہت استدراک سعادت معرفت و حقیقت تلاش پنڈتاں و محققاں نمودندو از بزرگان من گوشائیں رام گوپال جیو کہ بالائی پنج گنگا ریاضت می نمودندملاقات کردند واز حسن ارشادات گوشائیں موصوف اطمینان خاطر خود حاصل ساختہ ہر گاہ کہ از سیر اطراف وجوانب معاودت کردند بازبکاشی جی تشریف آوردند بالائی پنج گنگا بسیاری زمین زرخرید نمودہ یکی مندر سیتا رام جی ودائمی مندر بندمادھو جی تیار کنانید ند.

اس میں مہاراجا مان سنگھ کا بنوایا ہوا دوسرا مندر بند مادھو کا بھی ذکر ہے کہ اکبر کے دور میں انہوں نے بنوایا اور اس مندر پر اکبر کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا، جس میں ۱۶ر محرم الحرام ۱۰۱۴ھ تاریخ درج ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ:

> مبلغ یک صد روپیہ دروجہ معاش ٹھاکر بند مادھو جی کہ دربنارس واقع است مقرر نمودیم

دین الٰہی کا رواج بنارس میں

۹۹۰ھ م ۱۵۸۲ء میں اکبر نے دین الٰہی کی بنیاد رکھی، اس دین الٰہی کے متعلق تفصیلات بہم پہنچانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ اکثر وبیشتر روایات مبالغہ سے بھری ہوئی ہیں۔ دین الٰہی کے پیرو آپسی ملاقات میں 'السلام علیکم' کے بجائے اللہ اکبر کہتے تھے جبکہ دوسرا شخص اس کے جواب میں وعلیکم السلام کے بجائے 'جل جلالہ' کہتا۔ اکبری مہر کے سجع میں بھی اللہ اکبر کھدا ہوا تھا۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اکبر اس طریقے کو رائج کر کے خدائی کا دعویٰ کرنا چاہتا تھا حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ چنانچہ اس مہر کے متعلق اس زمانے کے ایک بزرگ حاجی ابراہیم سرہندی نے کہا کہ اس میں شبہہ ہوتا ہے، تو اکبر نے کہا کہ اس میں شبہہ نہیں، بلکہ وہم اور وسوسہ ہے۔ بندہ ضعیف، عاجز ومحتاج خدائی کا دعویٰ کیوں کر کر سکتا ہے؟

اکبر کی زندگی کے ابتدائی دور تو بڑے غنیمت تھے، پنج وقتہ نمازوں کا پابند تھا۔ مسجد میں اذان خود دیتا تھا۔ یہاں تک کہ جھاڑو بھی مسجد میں اپنے ہاتھ ہی سے دیتا۔ ہر سال پیدل اجمیر شریف جاتا اور منتیں مرادیں مانگتا تھا۔ علماء کی بڑی عزت کرتا۔ تمام فیصلے اسلامی احکام کے مطابق کرتا۔ لیکن اس کے دربار کے علماء اس وقت بری طرح زبانوں کی تلواریں کھینچ کر پلے پڑتے اور کٹ مرتے نیز آپس میں ایک دوسرے کو کافر بناتے تھے۔

اکبر نے ان علماء کا حال دیکھا تو اس کا دل کھٹا ہو گیا اور دن بدن اسلام سے اس کی رغبت کم ہوتی گئی اور یہی سبب تھا کہ اس کے دین الٰہی میں بڑی گنجائش تھی، ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔

اس موقع پر ایک انگریز مصنف ولمینٹ اسمتھ نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ دین الٰہی کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ حالانکہ اس دین الٰہی کے متعلق اکبر ہی کے زمانے میں اختلاف تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونیؒ صریحاً کفر کہتے تھے، جبکہ ابوالفضل کہتا تھا کہ یہ

اسلام کی ایک صورت ہے۔

نیتوں کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے، لیکن مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں صریحاً کفر کا اطلاق بھی صحیح نہیں۔ یہ سب اکبر کی سادہ لوحی کے نتائج تھے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مذہبی رواداری اور ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں اکبر کی کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔

اکبر کی موت کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے، جس سے اس کی سادہ لوحی پر ایک روشنی پڑتی ہے۔ گو اس واقعہ کا بنارس کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس کی یہ سادہ لوحی اس کے حق میں جان لیوا بھی ثابت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ:

اکبر کے دربار میں ایک بڑا ماہر طبیب حکیم علی بلایا گیا۔ اکبر کو دست کی شکایت تھی اور کسی طرح دست رکتے ہی نہیں تھے۔ حکیم نے اپنے کیسہ سے دوا نکالی۔ دوا پانی کے پیالے میں ڈالتے ہی پانی برف کی طرح جم گیا۔ حکیم علی نے اکبر کو دکھا کر کہا کہ دوائیں تو ہمارے پاس ایسی ہیں کہ پانی میں اثر کرتی ہیں اور پانی برف کی طرح جم گیا، لیکن اب آپ پر اثر نہ کرے تو میں کیا کروں؟ بادشاہ نے حکم دیا کہ یہی دوا مجھے دو۔ حکیم علی نے انکار کیا، لیکن ضدی اکبر نے نہ مانا۔ اس کو استعمال کیا جس سے دست تو رک گئے لیکن اب قبض ایسا پیدا ہوا کہ وہ بھی ناقابل برداشت تھا۔ پھر دست کی دوا دی گئی۔ یہاں تک کہ دست زیادہ ہوئے اور مر گیا۔ [مآثر الامراء]

یہ حکیم علی بڑا ماہر فنون تھا۔ اس نے ایک طلسمی[1] تالاب بنایا تھا، جس میں غوطہ مارنے کے بعد آدمی کو سیڑھیاں ملتی تھیں، ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے کے بعد آدمی ایک ایسے فرش فروش کے سجے سجائے کمرے میں داخل ہو جاتا، جس میں دس بارہ آدمی کے

---

[1] یہ شہر بدایوں کے اکابر میں سے اور شیخ مبارک ناگوریؒ [متوفی ۱۰۰۱ھ] کے شاگرد تھے۔ دربار اکبری کے خاص ملازمین میں شمار تھا۔ زیادہ تر ہندی کتابوں کے ترجمے یا تلخیص کی خدمات پر مامور تھے۔ رامائن کا فارسی ترجمہ بھی کیا۔ باوجود ملازم ہونے کے حق گو تھے۔ فارسی زبان میں ان کی کتاب 'منتخب التواریخ' [جو کہ مولوی احتشام الدین مراد آبادی کے اردو ترجمہ کے ساتھ ماہ نومبر ۱۸۷۴ء میں منظر عام پر آ چکی ہے] جسے تاریخ بدایونی بھی کہتے ہیں، ان کی حق گوئی کی گواہ ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ تذکرہ علماء ہند]

اٹھنے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ دستر خوان چنا ہوا رہتا تھا اور طاقوں میں کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ اکبر بادشاہ بھی اس تالاب میں گیا تھا اور جہانگیر نے بھی اپنی کتاب 'تزک جہانگیری' میں اس تعلق سے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ حکیم علی نے ایک چراغ بھی بنایا تھا جس سے حمام چوبیس گھنٹے گرم رہتا تھا اور چراغ نہیں بجھتا تھا۔

جامع مسجد گیان واپی:

اکبر کے دور حکومت میں یہ مسجد دین الٰہی کا مرکز بنی تھی۔ یہ تو کوئی بھی تاریخ نہیں بتاتی کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا، لیکن یہ بات بالکل مسلم ہے کہ یہ جامع مسجد اکبر بادشاہ کے وقت میں تعمیر ہو چکی تھی، جس کا ایک تاریخی ثبوت یہ ہے کہ اکبر کے دور حکومت میں ایک مشہور بزرگ اور ولی حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسیؒ[1] [متوفی ۱۶۳۲ء، جن کا مزار مبارک منڈواڈیہہ میں ہے] اس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے ہر جمعہ کو منڈواڈیہہ سے تشریف لاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی 'گنج ارشدی' میں درج ہے، وہ یہ کہ:

> "ایک مرتبہ حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسیؒ جمعہ کے دن جامع مسجد میں موجود تھے۔ خطیب نے خطبہ میں اکبر کا نام لیا۔ حضرت شاہ طیب بنارسیؒ نے صرف یہ سوچ کر کہ خطبہ میں کافر کا نام لیا گیا، خطیب کو منبر سے اتارنا چاہا، لیکن حضرت مولانا خواجہ کلاں اور دوسرے بزرگ بھی وہاں موجود تھے، ان لوگوں نے روک دیا اور کہا کہ اگر اکبر کو خبر لگی تو ہمارے مکانوں کو تاراج کر دے گا۔ اس لئے مصلحت یہی ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کی بجائے منڈواڈیہہ ہی میں پڑھ لی جایا کرے۔"

[گنج ارشدی قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جون پور]

۱: آپ کا تفصیلی تذکرہ حضرت مصنفؒ کی دوسری کتاب 'تذکرہ مشائخ بنارس' کے نئے ایڈیشن میں ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی
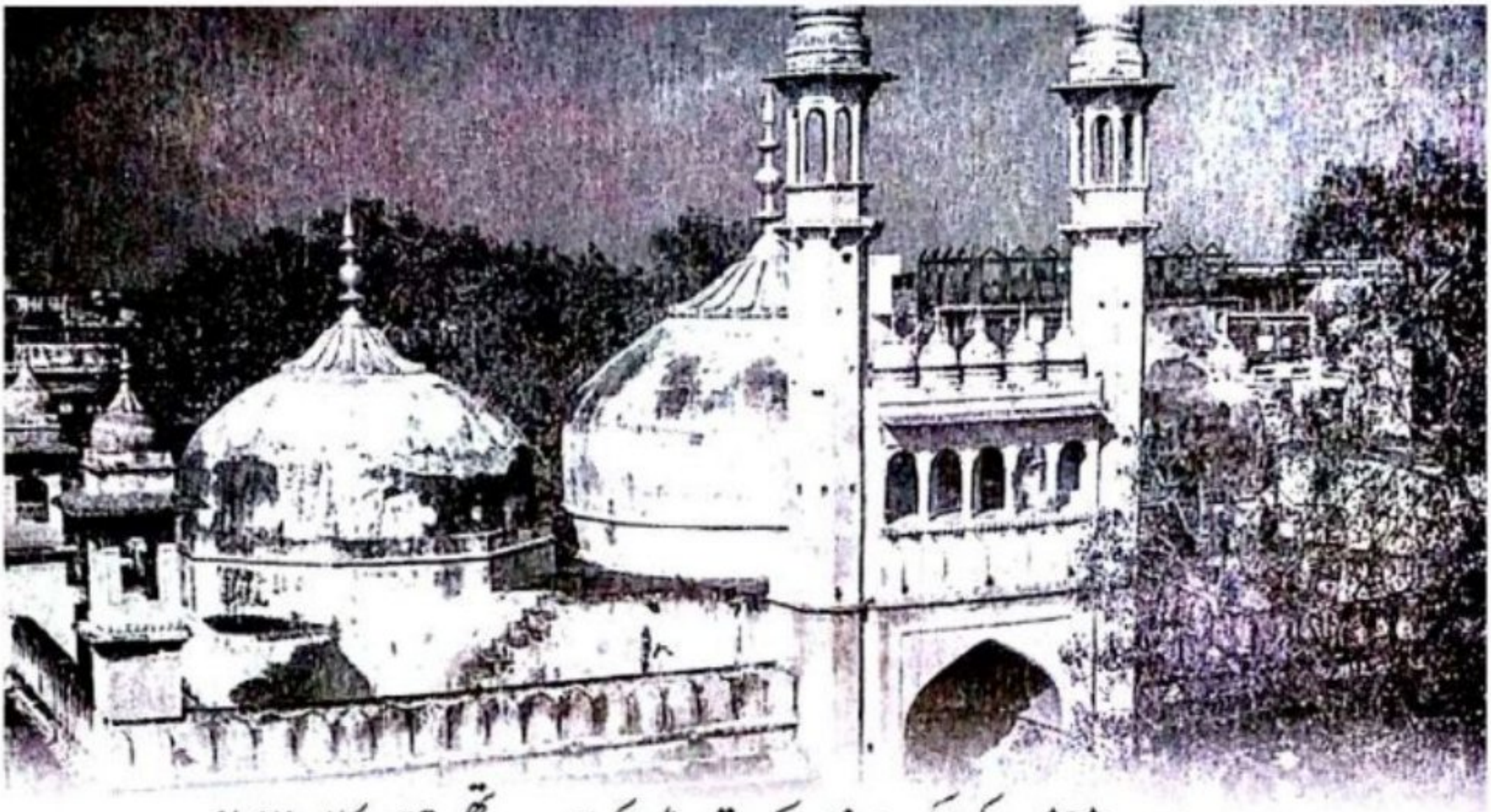
اس جامع مسجد کی اکبر بادشاہ کے وقت میں کیا صورت تھی؟ اس کا پورا اندازہ تو نہیں لگ سکتا، لیکن اوپر کے واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اکبر کے زمانے میں یہاں جمعہ کی نماز اور جماعت کا اہتمام تھا۔ لیکن مسجد کے متعلق اور کوئی اہم بات نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی کسی مندر کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

آج اس جامع مسجد کی تعمیر پر اتنے ماہ و سال اور مختلف حکومتوں کے اتنے دور گزر چکے ہیں کہ اب کسی بڑی سے بڑی تاریخی بنیاد پر بھی اس کے خلاف کوئی دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی عدالت اس مسجد کی حیثیت کے خلاف کوئی اور فیصلہ کرسکتی ہے۔

یہ جامع مسجد وشوناتھ جی کے مشہور سونے کے مندر سے متصل ہے۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم فرمانرواؤں نے ہندوستان میں جہاں بھی مسجدیں بنوائیں، ان کے ساتھ مندر بھی بنوائے۔ اور دونوں عبادت گاہوں کا ایک دوسرے سے متصل وجود رواداری اور اتحاد کے لیے ایک شاہد عدل ہے کہ دونوں فرقے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں فراغت قلب کے ساتھ مصروف عبادت ہوں جو مقتضائے عدل وانصاف ہے۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک جو مساجد بھی تعمیر ہوئیں ان میں یہی جذبہ کارفرما رہا ہے، جس کی تفصیل آگے کے صفحات میں آرہی ہے۔

اکبر [متوفیٰ ۱۶۰۵ء] کے بیٹے جہانگیر [متوفیٰ ۱۶۲۷ء] کے وقت میں اس مسجد میں کوئی خاص بات نہیں پیدا ہوئی، لیکن جہانگیر کے بیٹے شاہجہاں [متوفیٰ ۱۶۵۸ء]

نے اپنے دور حکومت میں اس مسجد میں ایک مدرسہ تعمیر کیا جس کا تاریخی نام 'ایوان شریعت' ہے، جس سے سال تعمیر ۱۰۴۸ھ م ۱۶۳۹ء نکلتا ہے۔

شاہجہاں کے ذوق سے امید بھی یہی کی جاسکتی ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کے اس پوربی علاقے کا نام ہی شیراز ہند رکھ دیا تھا۔ اب عالمگیر اس جامع مسجد کو کیوں چھوڑتا؟ اس نے اپنے جلوس سلطنت [۱۰۶۸ھ] کے دوسرے ہی سال اس کی طرف پوری پوری توجہ کی اور اتنی بڑی عالیشان عمارت کھڑی کر دی۔ یعنی موجودہ عمارت اکبری دور کی جامع مسجد کی بنیاد پر ہے۔
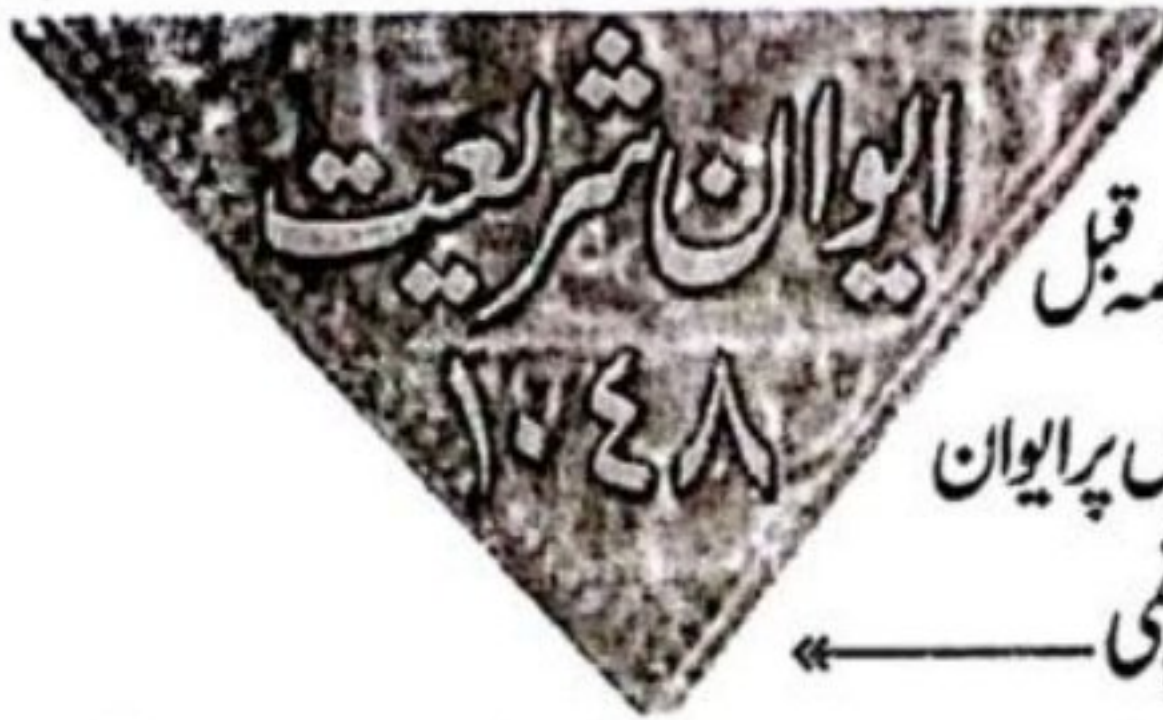
ایوان شریعت
۱۰۴۸

جامع مسجد کے پچھم جانب کے کھنڈرات میں حسن اتفاق سے کچھ عرصہ قبل ایک سہ رخا [تکونا] پتھر دستیاب ہوا تھا جس پر ایوان شریعت ۱۰۴۸ھ درج تھا۔ جس کی شکل یہ تھی ←

چند سال قبل تک یہ پتھر 'انجمن انتظامیہ مساجد بنارس'[1] کے دفتر میں موجود تھا، جس کا ذکر چودھری نبی احمد سندیلوی کی کتاب 'مرقع بنارس' میں بھی آیا ہے۔ لیکن انجمن مذکور کے کچھ غیر ذمہ دار اور نااہل اراکین کی غفلت شعاری کہیے کہ پتھر اب وہاں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے ضائع ہونے کا قوی امکان ہے۔ جنہیں دیکھنے کا شوق ہو وہ انجمن مذکور کے ذمہ داران سے باز پرس کر سکتے ہیں۔

---

[1] جامع مسجد گیان واپی ایک طویل عرصے سے 'انجمن انتظامیہ مساجد' کے زیر انتظام ہے۔ اس انجمن کا قیام ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء کو عمل میں آیا۔ اس کے اغراض ومقاصد اس کے نام ہی سے عیاں ہیں۔ اس کا دفتر ۱۹۳۹ء میں جامع مسجد ہی کے آس پاس تھا، پھر وہاں سے منتقل ہو کر شہر کے مختلف علاقوں میں گشت کرتا رہا، لیکن افسوس کہ اتنی اہم مسجد کا انتظام وانصرام کرنے والی اس انجمن کا آج بھی پورے شہر میں کوئی دفتر نہیں ہے۔ اس وقت انجمن مذکور کے زیر اہتمام شہر واطراف کی تقریباً تیس مساجد ہیں، جن کے ائمہ وموذنین کی تقرری، مساجد کی تعمیر ومرمت، چونا قلعی ودیگر انتظامات اور ان پر آنے والے اخراجات انجمن ہی برداشت کرتی ہے۔

جامع مسجد گیانواپی کے تعلق سے مزید معلومات احقر کی کتاب 'گیانواپی مسجد تاریخ کے آئینے میں' سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ع ب نعمانی

یہ مدرسہ ایوان شریعت ساڑھے تین سو سال سے اپنی قدیم روایات کے ساتھ ۱۹۷۱ء تک قائم تھا۔ درس نظامی کے ساتھ ساتھ طب یونانی اور الہ آباد بورڈ کے نصاب منشی، کامل، مولوی، عالم، فاضل وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسہ سے بہت سے علماء و اطباء فارغ ہوے، جن میں مولانا عبدالحمید مکیؒ [متوفی ۱۹۸۶ء] ساکن امیامنڈی بنارس کے والد ماجد مولانا حکیم عبدالمجید [متوفی ۱۹۳۷ء] مولانا حکیم محمد حسین الٰہی [متوفی ۱۹۵۰ء] ساکن رسول پورہ بنارس اور مولانا حبیب اللہؒ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

مدرسہ مذکور پر ۱۹۰۲ء میں مسماۃ چھوٹی خانم صاحبہ[1] نے ایک جائداد وقف کی، جس کی ۱۹۷۱ء تک ایک کمیٹی تھی، جس کے صدر محمد اطہر صاحب ایڈوکیٹ مرحوم[2] اور سکریٹری محمد جلیل خاں مختار مرحوم تھے۔ ان کے انتقال کے بعد وقف مذکور کی تحویل بینک اور ٹریزری میں ہونے کی وجہ سے آمدنی بند ہوگئی جس کو بحال کرانے کے لیے یوپی سنی سینٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کی منظوری سے ایک نئی کمیٹی تشکیل کی گئی اور مارچ ۱۹۷۳ء میں مدرسہ کا اجراء بھی کر دیا گیا، لیکن وقف کی آمدنی ابھی تک بحال نہ ہونے اور مدرسین کی دقت کی بنا پر ٦ ماہ بعد مدرسہ پھر بند ہوگیا جسے قائم کرنے کی کوشش پھر سے ہوئی، چنانچہ 'وقف چھوٹی خانم' کمیٹی [جس کا خاکسار مصنف سکریٹری اور جناب عبدالقیوم صاحب ایڈوکیٹ صدر ہیں[3]] نے ہنگامی چندہ کرکے مدرسہ چلانے کا فیصلہ کیا اور ۱۲ر

---

[1] آپ کا اصل نام قمر النساء تھا، چھوٹی خانم سے مشہور ہوئیں۔ آپ مرزا محمد حسن عرف مرزا اچھو [متوفی ۲٦ جون ۱۹۷۴ء] کی پردادی تھیں۔ ان لوگوں کا آبائی وطن تو ایران تھا، لیکن وہاں سے کشمیر، پھر وہاں سے بنارس کو مستقل قیام گاہ بنایا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ مسماۃ اختر جہاں صاحبہ بنت مرزا اچھو مرحوم]

[2] آپ بنارس کے ہردلعزیز معالج ڈاکٹر محمد ازہر نعمانی مرحوم [متوفی ۱۹٦۴ء] ساکن شیخ سلیم پھاٹک کے بھائی تھے۔ آبائی وطن ردولی شریف تھا۔ کسی زمانے میں ان لوگوں نے بنارس ہی کو مستقل مسکن بنالیا۔ آپ کے صاحبزادے جناب ضیاء الدین احمد صاحب آپ کی یادگار ہیں۔ ع ب نعمانی

[3] آپ اشفاق نگر کے رہنے والے ایک اچھے وکیل اور حضرت والد صاحبؒ کے احباب میں سے تھے۔ بعد میں بجرڈیہہ منتقل ہوگئے اور وہیں بتاریخ ۲۱ر جون ۲۰۱۱ء وفات پائی۔ ع ب نعمانی

اپریل ۱۹۷۵ء بروز سنیچر سے مدرسہ مذکور کا ایک بار پھر اجراء ہوا، لیکن چندہ اکٹھا کرنے کی دقتوں کی بنا پر چند ماہ بعد مدرسہ پھر بند ہو گیا اور ابھی تک بینک اور ٹریزری سے رقوم کی وصولیابی نہ ہونے کے سبب مدرسہ مذکور بند ہے جسے پھر جاری کرنے کوشش جاری ہے۔ اس کے لیے عدالت سے بھی رجوع کیا گیا اور عدالت کا فیصلہ بھی کمیٹی مذکور کے حق میں ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ سال رواں کے دوران تصفیہ ہو جائے گا۔

عام طور سے لوگ اس مسجد کو گیان وافی کہتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ صحیح لفظ 'گیان واپی' ہے۔ یہ نام پڑنے کی وجہ بھی خوب رہی۔ گیان کے معنی عقل اور واپی کے معنی باؤلی کے ہیں۔ لہٰذا پورا ترجمہ ہوا 'عقل کی باؤلی'۔ یہ باؤلی وشوناتھ جی کے مندر کے اندر موجود ہے۔ گیان واپی محلّہ کا نام ہے، اسی مناسبت سے مسجد اسی محلّہ کی طرف منسوب ہے۔

گیان واپی نام پڑنے کی وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہندوؤں کے مہادیو جی گو بچشم ظاہر پتھر ہیں، لیکن اپنی عقل کے زور سے اس باؤلی میں چلے گئے، پھر واپس نہیں ہوئے یہ روایت زبانی مشہور ہے۔

جامع مسجد گیان واپی کے متعلق عام طور سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ مندر توڑ کر بنائی گئی۔ پھر یہ غلط فہمی تو اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ اسے اورنگزیب عالمگیر نے بنوائی۔ حالانکہ اوپر ہم نے ان غلط فہمیوں کی صفائی کر دی ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے، ان کے پاس اپنے دعوے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ قدیم سے قدیم روایات میں بھی اس جگہ مندر رہونا ثابت نہیں ہے۔

[آرکیولاجیکل سروے آف انڈیا ج اول ص ۲۰۸]

عالمگیر [متوفی ۱۷۰۷ء] آج سے ۳۶۵ سال قبل تخت پر بیٹھا، جبکہ یہ مسجد ۴۰۰ برس سے بھی قبل سے موجود ہے۔ اس بنا پر عالمگیر کو کسی طرح اس کا بانی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ بعض لوگوں کو اس کتبہ سے بھی شبہہ ہوتا ہے جو انگریزوں کے زمانۂ حکومت میں سید

میراث علی نے، جو اس کے متولی تھے، ۱۲۰۷ھ میں نصب کرایا تھا۔ اب یہ جامع مسجد میں رکھا ہوا ہے[1] جس کی عبارت یہ ہے:

> **اول بحکم والا درسنه ۲ از جلوس حضرت عالمگیر خلد مکان ایں جامع مسجدتیار شده بعده در ۱۲۰۷هھ سید میراث علی متولی موروثی مسجد موصوفه مرمت صحن وغیره نمود**

ظاہر ہے کہ یہ کتبہ بہت بعد کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے دوسرے ہی سال جامع مسجد کی موجودہ تعمیر ہوئی۔ جبکہ حقیقت یہی ہے کہ عالمگیر کے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے پہلے ہی سے یہ جامع مسجد موجود تھی۔

حاصل یہ کہ عالمگیر کا تخت سلطنت پر جلوس ۱۰٦۸ھ میں ہوا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۰۷۰ھ م ۱٦٦۰ء میں اس کے ذریعہ اس مسجد کی جدید تعمیر ہوئی۔

اس مسجد میں انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں بھی جمعہ و جماعت کا انتظام تھا، لیکن پھر بھی یہ خانۂ خدا مسلمانوں کی غفلت اور بے توجہی کا شکار تھا۔ یہ بھی ایک حسن اتفاق ہی تھا کہ عین اس بدحالی کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے مولانا رحمت اللہ صاحب محدث دہلویؒ بنارس آئے جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ [متوفی ۱۲۳۹ھ] کے حلقۂ درس سے فارغ ہوئے تھے۔ مولانا نے اس مسجد میں جمعہ و جماعت کا انتظام کیا۔

اتفاق سے مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محلیؒ بھی بنارس تشریف لائے اور مدرسہ ایوان شریعت کی مسند درس کے صدر نشین بنے اور نماز جمعہ کی امامت بھی قبول فرمائی۔ مولانا قطب الدین فرنگی محلیؒ کا انتقال بنارس ہی میں ہوا۔ ان کے بعد ایک

---

[1] یہ کتبہ تقریباً ۲۰ رسال قبل تک جامع مسجد کے منبر پر رکھا رہتا تھا، لیکن بقول ذمہ داران انجمن انتظامیہ مساجد مذکورہ غلط فہمی کے ازالہ کی غرض سے وہ پتھر وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ ع ب نعمانی

دوسرے بزرگ مولانا عبدالصمد صاحب بنارسیؒ [متوفی ۱۳۲۷ھ] امام مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا محمد اکرام صاحب امام ہوئے جن کا ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی سے خاکسار مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحبؒ اس منصب پر فائز ہوئے اور چالیس سال تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد ۲۳ رصفر ۱۳۸۶ھ م ۱۳ رجون ۱۹۶۶ء کو وصال فرماگئے۔ خاکسار مصنف ان کی حیات کے آخری چند سالوں سے ہی ان کے حکم سے ان کی جگہ امامت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس طرح تقریباً ۲۶ سال سے یہ خدمت انجام دے رہا ہے[1]

اللھم اغفرلہ اکرم نزلہ

شاہ جہانگیر ابن اکبر بادشاہ:

اکبر کے بعد اس کا بیٹا ابوالمظفر نورالدین جہانگیر [متوفی ۱۶۲۷ء] ۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۰۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ جہانگیر باوجودیکہ بہت ہی ناز ونعمت کے ساتھ پلا تھا، پھر بھی اتنا سلیقہ مند تھا کہ بیس بائیس برس تک سلطنت باقی رکھا۔ جہانگیر اپنے باپ کے مقابلے میں بڑا دیندار تھا۔ حالانکہ اس بادشاہ پر عام مورخوں نے عیش پرستی کے الزامات عائد کیے ہیں۔ اگر بالفرض وہ صحیح بھی ہوں تو ان سے اس کی ان زندہ خدمات پر کیا اثر پڑتا ہے؟

نوٹ: حضرت مولانا رحمت اللہ محدث دہلویؒ کے تفصیلی حالات 'مرقع بنارس' میں صفحہ ۲۶۸ پر، مولانا قطب الدین فرنگی محلیؒ کے حالات 'تذکرہ مشائخ بنارس' کے صفحہ ۱۲۶ پر، مولانا عبدالصمد صاحبؒ کے حالات صفحہ ۱۹۶ پر اور مولانا محمد اکرام صاحبؒ کے حالات صفحہ ۲۰۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی

[1] حضرت والد ماجدؒ نے اس ذمہ داری کو نہایت مستعدی سے نبھایا، لیکن افسوس کہ مورخہ ۱۸ رجمادی الاول ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹ رجنوری ۱۹۸۷ء کو اچانک آپ کا وصال ہوگیا جس کے بعد یہ ذمہ داری آپ کے بھتیجے مفتی عبدالباسط ابراہیمیؒ کو سپرد کی گئی۔ ماشاء اللہ انہوں نے بھی اس منصب کا کما حقہ حق ادا کیا، لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور جلد ہی کچھ موذی امراض کا شکار ہوکر مورخہ ۲۴ رشوال ۱۴۲۲ھ م ۹ ر۱ ر۲۰۰۲ء کو وہ بھی راہی عدم ہوئے۔ بعدہٗ اس سیہ کار کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی۔ محض اللہ کے فضل وکرم سے بندہ یہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ ع ب نعمانی

جہانگیر کا کل دور حکومت ۱۶۰۵ء م ۱۰۱۴ھ سے ۱۶۲۷ء م ۱۰۳۷ھ تک ہے۔

خواجہ محمد صالح حاکم بنارس:

جہانگیر کے زمانے میں ۱۰۱۴ھ م ۱۶۰۵ء میں میر محمد باقر خاں حاکم اعلیٰ کی ماتحتی میں خواجہ محمد صالح بنارس کے حاکم مقرر ہوئے، جن کے نام سے تھانہ جیت پورہ کے ماتحت محلّہ خواجہ پورہ مشہور ہے۔

خوجہ کنواں:

انہوں نے محلّہ چھتن پورہ میں ایک کنواں تعمیر کرایا جو پہلے خوجہ کنواں، اور اب خوجد کنواں کے نام سے مشہور ہے۔

خوجہ کی مسجد:

چھتن پورہ میں خواجہ محمد صالح نے ۱۰۲۷ھ میں یہ مسجد جہانگیر بادشاہ کے حکم سے تعمیر کرائی۔ قدیم دستاویز میں تو اس مسجد کا نام 'خوجہ کی مسجد' ملتا ہے، لیکن عوام میں مذکورہ کنواں سے متصل ہونے کے باعث اب یہ 'خوجد کنواں کی مسجد' سے مشہور ہے۔ یہ مسجد بڑی خوشنما اور بارونق ہے اور اب تو جدید تعمیر نے اس کی دلکشی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں محراب کے اوپر ایک شاندار اور خوشخط نستعلیق کتبہ لگا ہوا ہے، جس کے آخری مصرعہ سے مسجد کا سال تعمیر ۱۰۲۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ کتبہ یہ ہے:

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر شہ کہ ہست — سایہ حق، حامی دیں، خسرو ملک رقاب
صورت اتمام بگرفت ایں بنا در عہد آں — باد باقی در جہاں تا موعد یوم الحساب
شد رواج دین احمد در بنارس زیں مقام — صالح است بانی ایں مسجد عالی جناب
از خرد چوں کرد طاہر سال تاریخش سوال — 'خانہ حق قبلہ دین نبی' گفتہ جواب
۱۰۲۷ھ

ترجمہ: ۱] شاہ نورالدین جہانگیر جو اکبر کے بیٹے، حق کے سایہ، دین کے حامی اور غلاموں کے ملک کے بادشاہ ہیں

۲] یہ بنیاد ان ہی کے عہد میں مکمل ہوئی اور یوم الحساب [قیامت] تک یہ جہاں میں باقی رہے۔

۳] بنارس میں اس جگہ سے دین احمد کا رواج ہوا اور اس عالیشان مسجد کے بانی محمد صالح ہیں۔

۴] عقل سے جب طاہر نے اس کی تاریخ کا سال پوچھا تو 'خانۂ حق قبلۂ دین' جواب ملا۔

اس کتبے کا یہ مصرعہ "شدرواج دین احمد در بنارس زیں مقام" یعنی اس مقام سے دین احمد کا رواج ہوا، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جہانگیر کے باپ اکبر کے زمانے میں دین الٰہی کی اشاعت سے جو گمراہی پیدا ہو چکی تھی، جہانگیر نے اس کا خوب سد باب کیا اور بنارس میں دین احمد کو رواج دیا اور اسلام کو خوب ترقی ہوئی۔

اسلام کی ترقی کا دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کی ایک عظیم شخصیت اور اولیاء اللہ کے سید الطائفہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سید احمد سرہندیؒ [متوفی ۱۶۲۵ء] جہانگیر ہی کے زمانے میں بنارس تشریف لائے۔ لاہور سے سرہند شریف اور دہلی ہوتے ہوئے بنارس کو آپ نے فیضیاب کیا اس کے بعد یہاں سے اجمیر شریف تشریف لے گئے۔

[تاریخ دعوت و عزیمت ۱۶۹/۴]

شاہجہاں:

۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین جو کہ شاہجہاں کے نام سے مشہور ہوا، تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں ہندوستان کو کافی ترقی ہوئی۔ ملک کی آمدنی میں سے صرف مال گزاری ساڑھے سینتیس کروڑ تک پہنچ گئی۔ قسم قسم کی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں آگرہ کا تاج محل، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی اس کی خوش ذوقی کی گواہ ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ حکومت کو بھی کافی ترقی ہوئی۔

مسجد ٹھٹیری بازار:

شاہجہاں کے دور حکومت میں بنارس کے ٹھٹیری بازار علاقہ میں ایک مسجد تعمیر ہوئی جو زوال سلطنت کے بعد منہدم ہوگئی تھی، لیکن انگریزی دور میں شیخ ثناء اللہ جائسی کوتوال نے اس کی دوبارہ تعمیر کرائی اور قطعہ تاریخ کا یہ کتبہ بھی نصب کرایا:

از محمد باقر درویش دل — مسجد خوش در بنارس شد تمام
در زمان سلطنت شاہجہاں — یافت ترتیب ایں چنیں عالی مقام
سال ترتیب بنائے آں زغیب — گفت ہاتف 'مسجد فیض دوام'
۱۰۴۸ھ

یہ کتبہ مسجد کی پہلی تعمیر کے وقت کا ہے جسے تعمیر نو کے بعد بجنسہ محراب میں نصب کر دیا گیا ہے۔

محمد شریف حاکم بنارس:

شاہجہاں [متوفی ۱۶۵۸ء] نے اپنی حکومت کے زمانے میں محمد شریف کو بنارس کا حاکم مقرر کیا۔ شاہجہاں کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۶۸ھ م ۱۶۵۸ء میں جب تخت پر بیٹھا تو اس وقت بھی محمد شریف بنارس کے حاکم تھے۔

۱۰۶۷ھ م ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں بیمار ہوا۔ اس وقت بڑا شاہزادہ دارا شکوہ دہلی میں اس کے پاس تھا جو کافی ناز و نعمت کا پروردہ تھا۔ دوسرا بیٹا شجاع بنگال کا صوبہ دار تھا، سب سے چھوٹا مراد گجرات میں تھا۔ اورنگ زیب مزاج و عادات میں تینوں بھائیوں سے بالکل الگ تھا۔ ادھر شاہجہاں کے انتقال کی خبر گشت کرنے لگی، اب ہر بھائی نے آگرہ کا رخ کیا اور شجاع کو جیسے ہی پتہ چلا، وہ بھی روانہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں عالمگیر ۱۰۶۸ھ م ۱۶۵۸ء میں دہلی کی مرکزی سلطنت پر قابض ہوگیا اور شجاع پر فوج کشی کر کے کھجوا ضلع فتح پور میں شکست دی اور بنارس اس کی سلطنت میں داخل ہوگیا۔

مسجد شاہ طیب بنارسیؒ:

حضرت شاہ طیب بنارسیؒ [متوفی ۱۰۴۲ھ] کے روضہ واقع منڈواڈیہہ سے متصل ہی یہ مسجد ہے جسے حضرت قطب الدین شاہ معین الدینؒ نامی بزرگ نے ۱۲۱۹ھ م ۱۸۰۴ء میں تعمیر کرایا تھا پھر اس کی نئی تعمیر ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔ محراب کے اندر یہ کتبہ مولانا وکیل احمد سکندر پوریؒ نے نصب کرایا:

از سر نو ساخت ایں مسجد معین دین حق — سالہا باشد برائے اہل ایماں یادگار
سال مسعود بنائش عاجز خستہ نوشت — 'مسجد درگاہ شاہ طیب والا تبار'
۱۳۰۵ھ

اورنگ زیب عالم گیر اور بنارس

عالمگیر کے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد اسی سال شجاع نے بنارس پر حملہ کیا۔ گنگا کے اس پار بہادر پور میں داراشکوہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ داراشکوہ کی فوج کا سپہ سالار جے سنگھ تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں شجاع شکست کھا کر بھاگا۔ دوسرے سال داراشکوہ کو عالمگیر نے شکست دی اور شجاع نے موقع پاکر بنارس پر حملہ کیا اور داراشکوہ کے قلعہ دار رام داس کو نکال کر شہر کے مہاجنوں سے روپیہ وصول کر کے الہ آباد کے محاصرہ کے لیے روانہ ہوا۔

داراشکوہ:

یہ شاہجہاں کا بڑا بیٹا تھا جسے شاہجہاں نے بنارس کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس نے بنارس میں وہ مثالی خدمات انجام دیں جو کسی بادشاہ نے بھی نہیں دیں۔ گو آپس کے جھگڑوں نے اس کو تخت پر بیٹھنے نہیں دیا، لیکن اس نے اپنے باپ شاہجہاں ہی کے عہد سے متعدد علمی کام کیے، جن کا تعلق بنارس ہی سے ہے۔ اس بنا پر داراشکوہ کے تذکرہ سے اس کتاب کا خالی رہنا ناانصافی ہوگی۔

شاہجہاں کے چار بیٹے ایک ہی ماں ممتاز محل بیگم [1] سے تھے۔ بڑا بیٹا یہی

[1] ممتاز محل کا اصل نام ارجمند بانو بیگم تھا۔ اپریل ۱۵۹۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام ابوالحسن آصف خان تھا۔ ۱۰ مئی ۱۶۱۲ء کو ۱۹ سال کی عمر میں شاہجہاں کی تیسری بیوی کی حیثیت سے اس کے نکاح میں آئیں۔ شاہجہاں کے نطفہ سے انہیں تیرہ اولاد پیدا ہوئی۔ چودھویں کی ولادت کے دوران ۱۷ جون ۱۶۳۱ء کو انتقال کر گئیں اور تاج محل میں مدفون ہوئیں۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

داراشکوہ تھا۔عربی وفارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اوران پرمثل اہل زبان کے عبور تھا۔سنسکرت کی تعلیم بنارس کے مشہور پنڈتوں سے حاصل کی تھی اوران کے قیام کے لیے بنارس میں عمارتیں بنوادی تھیں جوآج بھی موجود ہیں اور پرانی عدالت [1] کے نام سے مشہور ہیں۔

[وقائع عالمگیر مطبوعہ شیروانی پریس علی گڑھ]

شاہزادہ داراشکوہ کا علمی ذوق بہت بڑھا ہوا تھا اورفن خوشنویسی میں بھی ماہر تھا، اس کے لکھے ہوئے فارسی قطعے اکثر لائبریریوں میں موجود ہیں،جن کے نیچے لکھا ہوا ہے 'حررہ داراشکوہ'

بنارس میں داراشکوہ کے ہندو برہمنوں سے قریبی تعلقات قائم ہوئے اوران سے اہل ہنود کے علم سے واقفیت حاصل کی۔اورنگ زیب نے اس بات سے ناراض ہوکر کہ اہل ہنود مسلم طلبہ کوبھی اپنی تعلیم دیں،شہر کے بعض مدرسوں کو بند کرنے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ وہ ایک پرخطر سازش کا مرکز بن گئے تھے۔

داراشکوہ کوتصنیف وتالیف کا بڑا اچھا سلیقہ اور ذوق تھا۔سکینۃ الاولیاء،مجمع البحرین سراسرارحق وغیرہ اس کی بڑی بے مثال تصانیف ہیں۔

---

[1] پرانی عدالت کی تاریخ یہ ہے کہ تقریباً ۲۰ بیگھہ رقبہ پرمشتمل یہ جائیداد شاہجہاں بادشاہ[متوفی ۱۰۶۸ھ] کے زیرتصرف تھی اور دالمنڈی سے دشاسمیدھ تک محیط تھی۔شاہجہاں کا بیٹا داراشکوہ یہیں قیام پذیر رہ کر سنسکرت کی تعلیم [بقیہ اگلے صفحہ پر] حاصل کرتا تھا۔اسی جائیداد میں وہ حصہ جوکہ بارہ دری سے مشہور ہے وہاں مرزا غالب دہلوی[متوفی ۱۲۸۵ھ] کا قیام ہوا تھا،جو بعد میں 'کوچہ غالب' سے مشہور ہوا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس پوری جائیداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا جسے ان لوگوں نے عدالت میں تبدیل کردیا اور شہر کے سارے مقدمات یہیں آتے اور فیصل ہوتے۔بعد میں انگریزوں نے اسے نیلام کردیا جسے مولانا غلام مظہر صاحب[متوفی ۱۳۴۶ھ] ساکن دالمنڈی کے خانوادے کے ایک بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب نے بیس ہزار روپیہ میں خریدا اورآپ کے خانوادے کے لوگ یہیں قیام پذیر ہوئے۔لیکن افسوس کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا،یہ جائیداد بھی فروخت ہوتی گئی۔اس وقت صرف ایک کٹرہ[موسوم بہ غلام اطہر کا کٹرہ]اور بارہ دری ہی باقی رہ گئی ہے جو پرانی عدالت کے نام سے مشہور ہے۔مولانا غلام مظہر صاحب کے خانوادے کے کچھ لوگ اس میں رہائش پذیر ہیں۔ع ب نعمانی

اولیاے کرام سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے تذکروں سے اس کی عقیدت ظاہر ہے۔ خود بھی صوفی اور توحید کا پجاری تھا۔ اس زمانے کے مرتاض بزرگوں سے اس کے تعلقات تھے۔ بالخصوص حضرت شاہ محبّ اللہ صاحب الہ آبادیؒ[1] سے بڑی عقیدت تھی لیکن چونکہ وہ عقیدہ 'ہمہ اوست'[2] کا قائل تھا، اس لیے علماء شریعت اس کے مذہبی عقائد سے بہت بدظن تھے۔

ویدوں کا ترجمہ:

وید بیاس جی نے جو چار وید[3] مشہور کر رکھے تھے، وہ ہندووں کے یہاں سے گم ہو گئے تھے۔ ہندووں کی ہزاروں سلطنتیں گزر گئیں، مگر کسی نے بھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ شاہزادہ داراشکوہ نے کاشی اور کشمیر کی سیر کرنے کے بعد سولہ سال کی مدت میں تمام اپنشدوں[4] [ویدوں[5]]

---

[1] آپ علم وفضل کے بحر ذخار، صوفی علماء میں مشہور ترین اور علوم ظاہر و باطن میں ہمعصروں کے سرخیل تھے۔ وطن اصلی صید پور ضلع خیر آباد تھا، علم تصوف میں آپ کی تحقیقات اور باریک بینیاں اتنی ہیں کہ آپ کو اس علم کا مجتہد مانا گیا۔ مختلف تصانیف بھی منظر عام پر آئیں، جن میں رسالہ ہفت احکام' 'سرالخواص' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۹ رجب ۱۰۵۸ھ کو وفات پائی۔ [تذکرہ علماء ہند] ع ب نعمانی

[2] یعنی سب کچھ خدا ہے۔ بعض صوفیوں کا قول ہے کہ خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں، یہ خدا ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ [فیروز اللغات۔ ص ۱۴۸۷] ع ب نعمانی [3] انکھ پرکاش از منشی کنہیا لال

[4] اُپ نِشَد (Upanishad) ہندومت کی تقریباً دو سو مقدس اور نظری کتب کے مجموعے کا نام ہے، جن میں سے قدیم ترین کتب وید کی فلسفیانہ تشریح سے متعلق ہیں۔ انہیں ہندومت کے متعدد رشیوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ اُپنشد سنسکرت کے تین لفظوں اُپ + نی + شَد کا مرکب ہے، جس کا لفظی ترجمہ 'قریب نیچے بیٹھنا' ہے۔ بالفاظ دیگر مرشد کے قدموں میں معرفت وحصول علم کے واسطے بیٹھنا۔ ہندو عقائد کے مطابق اپنشدوں کی تعلیمات کا منبع توحید، حق پرستی اور عرفان ذات ہے۔ یہ ظاہری عبادات، مذہبی رسومات، جنتروں منتروں کی بجاے خود آگہی، حقیقت کی تلاش اور تقویٰ پر زور دیتی ہے۔ اسی لیے ممتاز ہندو فلسفیوں اور شنکر آچاریوں نے اپنشدوں کی تعلیمات پر بڑا زور دیا ہے اور کئی ایک اپنشدوں کی تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ قدیم تحریروں کے مطابق اپنشدوں کی تعداد تو ایک سو آٹھ ہے لیکن ان میں صرف دس ہی زیادہ مشہور ہوئیں۔ ع ب نعمانی۔ [بحوالہ وکی پیڈیا]

[5] ہندومت کی قدیم الہامی کتب کے مجموعے کو وید کہتے ہیں جو ممکنہ طور پر پندرہویں اور پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران ضابطہ تحریر میں لائی گئیں۔ اوپر کی سطروں میں جن چار ویدوں کا ذکر آیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں: رگ وید، یجر وید، سام وید، اتھر وید۔ ع ب نعمانی

کا فارسی ترجمہ کرایا۔ اس خدمت پر ایک سو پچاس پنڈت اور سنیاسی رکھے گئے اُپنشد [وید] کے ترجمہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

این ترجمه اپنکهتای هر چهار بیدکه موسوم به سر اکبر است وتمام نورالانوار محمد داراشکوه در مدت شش ماه آخر دو شنبه بست وششم ماه رمضان سنه هجری یک هزار وشصت ویک وسبقت در شهر دهلی در منزل تکبود باتمام رسانید.

اس کتاب کا نام سرا کبر ہے۔ اس کے دیباچہ سے ایک بحث طلب مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ عالمگیر نے جب داراشکوہ کے مقابلہ کا قصد کیا تو اس کا سبب یہ ظاہر کیا کہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بے دین ہے۔ اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بے دینی پھیل جائے گی۔ جب کہ عام مورخوں کا خیال یہ ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا۔ نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ ہی عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا۔

بنارس میں محلّہ دارانگر، کٹرہ داراشکوہ، باغ داراشکوہ، یہ سب داراشکوہ ہی کے نام سے موسوم ہیں۔ داراشکوہ نے بنارس میں پنڈت کملا پتی ترپاٹھی[1] کے خاندان میں سنسکرت کی تعلیم پائی جس کے صلے میں پنڈت جی کے گھرانے کو صدر اعلیٰ کا شاہی خطاب، اور موضع ڈگمگ پور ضلع مرزاپور میں ایک جاگیر بھی ملی تھی۔

ابوالحسن حاکم بنارس:

محمد شریف حاکم بنارس کے انتقال کے بعد عالمگیر کی طرف سے ابوالحسن بنارس کے حاکم مقرر ہوے اور اسی زمانے میں عالمگیر نے بنارس کا نام محمد آباد رکھا۔ جیسا

[1] آپ ۳ ستمبر ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوے۔ والد کا نام پنڈت نارائن پتی ترپاٹھی تھا۔ آپ ایک سیکولر ذہن کے ممتاز لیڈر تھے۔ ہندو مسلم سبھی کو آپ سے کافی محبت تھی۔ آپ کانگریس کے سرگرم رکن ہونے کے ساتھ مجاہد آزادی بھی تھے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۴ء تک ایم، ایل، اے، اور ۴/۴/۱۹۷۱ء سے ۱۲/۶/۱۹۷۳ء تک صوبہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز ہوے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیان محکمہ ریلوے کے یونین منسٹر مقرر رہوے۔ بنارس میں کینٹ ریلوے اسٹیشن کی موجودہ عمارت آپ ہی کی کوششوں سے تعمیر ہوئی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

کہ عالمگیر کے تمام فرامین میں محمد آباد عرف بنارس لکھا ہوا ہے۔ ابوالحسن حاکم بنارس کے عہد میں عالمگیر کے بہت سے تاریخی آثار قائم ہوے۔

یہ دور انگریزی مصنفین اور ان کی تقلید میں کچھ انگریزی خواں طبقہ کی نظر میں بڑا تاریک ہے۔ حالاں کہ یہ ہندوستان کی تاریخ میں رواداری اور جمہوریت کا ایک روشن اور سنہرا باب ہے، جس کی تائید ان تاریخی کتابوں سے بھی ہوتی ہے جنہیں آج کے حق پسند ہندوؤں نے عالمگیر کے دور حکومت کے تعلق سے لکھی ہیں جو اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ عالمگیر ہی ایک ایسا بادشاہ تھا، جس نے ایک بہترین اور مثالی حکومت کی اور مذہبی رواداری کی مثالیں قائم کیں۔

ابتدا میں تو اورنگ زیب عالمگیر کے پیچھے بہت سے دشمن لگ گئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ اس کے سارے دشمنوں کا قلع قمع ہو گیا اور سارے ہندوستان میں ہر چہار جانب اس کی بادشاہت قائم ہو گئی جو اس کے سال انتقال ۱۱۱۸ھ م ۱۷۰۷ء یعنی ۵۰ سال تک قائم رہی۔

اورنگ زیب اپنے حسن انتظام اور سلیقہ میں اپنے دوسرے بھائیوں سے ممتاز اور بڑا دیندار و پرہیز گار تھا۔ دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ کبھی سلطنت کا ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا، بلکہ کبھی ٹوپی بنا کر اور کبھی قرآن شریف لکھ کر اس کی اجرت سے اپنی گزر بسر کیا کرتا تھا۔ رعایا کی دیکھ بھال اور ان کے آرام و آسائش کی اسے بڑی فکر تھی۔ اس نے سلطنت کی قوت اس قدر بڑھا دی تھی کہ اس کے بعد بھی برسوں تک جنبش نہ ہو سکی۔ لیکن افسوس کہ اس کے بودے اور کمزور جانشین اسے سنبھال نہ سکے اور کل پرزے ڈھیلے ہونے لگے۔

عہد عالمگیر کے کارنامے قیامت تک یادگار رہیں گے۔ خصوصاً بنارس کے ہندوؤں اور ان کی مذہبی روایات کی حفاظت سے متعلق عالمگیر نے جتنا کچھ کیا شاید ہی کسی مغل بادشاہ نے اس کا نمونہ پیش کیا ہو۔

عہد عالمگیر میں ہندوؤں کے مدرسے:

عالمگیر کے دور حکومت سے پہلے کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابتدائی مکاتب میں ہندو اور مسلمان یکجا تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان مکتبوں میں غیر مذہبی تعلیم ہوتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مسلم طلبہ اعلیٰ مدارس میں چلے جاتے تھے اور ہندو طلبہ اپنے مذہبی مدرسوں میں چلے جاتے تھے، جہاں پر شاستر کے علاوہ طب و نجوم وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہندوؤں کے مدارس عالمگیر کے عہد میں بھی قائم رہے جن کا اہم مرکز بنارس تھا۔ خوافی خاں لکھتا ہے:

> درایامی که محرر سوانح دربندرسورت بودبآنهانام زنار دار طبیب پیشه نقل می نمود که چون درقوم ماضا بطه است که برای تحصیل علم نجوم وطبابت وشاستر برهمان بی سرومایه ازدور ونزدیک به بنارس رفته،یکی از برهمنا ن آنجا رااستاد خود قرار می دهند ونزد او را درس می خوانند وصبح وشام از طرف استاد خود کنار آب گنگ رفته موافق دابی که مقرر هست مردمی راکه برای غسل می آیند به دستور و آئین مقرری خدمت می نمایند.

[تاریخ خوافی ج۲ص۲۱۹]

عالمگیر کے زمانے میں اس قسم کے مدرسوں کا وجود یہ حقیقت بھی واضح کرتا ہے کہ عالمگیر مدارس کے قیام و بقا کا مخالف نہ تھا اور نہ ہی اس نے کسی بھی مدرسے کو توڑا۔ مسلمان بچے اپنے مذہب پر اور ہندوؤں کے بچے اپنے مذہب پر رہتے تھے۔ لیکن مشہور عالم مولانا شبلی نعمانی رح[1] کا اس موقع پر عجیب وغریب بیان ملاحظہ ہو:

---

[1] آپ اردو کی مایہ ناز علمی وادبی شخصیات میں سے ہیں، خصوصاً اردو سوانح نگاروں کی صف میں ان کی شخصیت سب سے قدآور ہے۔ آپ اعظم گڈھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد متعدد علمی وادبی خدمات انجام دینے کے بعد آپ نے اعظم گڈھ میں مشہور ادارہ 'دارالمصنفین' کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۱۴ء میں آپ نے وفات پائی۔
ع ب نعمانی [بشکریہ مولانا عمیر الصدیق صاحب، دارالمصنفین]

"۱۰ رذی قعدہ ۱۰۸۹ھ یعنی تخت نشینی کے بائیسویں برس عالمگیر کو جب اطلاع ملی کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے علوم پڑھاتے ہیں تو ان کے انسداد کا حکم دیا۔ اس واقعہ کے مہینہ بھر بعد متھرا کے اطراف میں ہندوؤں نے شورش کی جس کو فرو کرنے کے لیے عبدالنبی خاں متھرا کا فوجدار رکھا گیا اور مارا گیا۔ اس زمانہ کے قریب ۱۰۹۰ھ میں بنارس کا بت خانہ کاشی ناتھ اور متھرا کا وہ بت خانہ جو ابوالفضل کی لوٹ سے ٹمر سنگھ نے بنوایا تھا، مسمار کر دیے گئے۔"

[اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۴]

ہمیں سخت حیرت ہے کہ مندر گرائے جانے کی یہ سند مولانا کو کہاں سے ہاتھ آ گئی؟ جب کہ عالمگیر ہی نے بنارس کے مندروں کو جاگیریں عطا کیں اور آج بھی عالمگیر کے ایسے فرامین موجود ہیں جن میں مندروں کے مسمار نہ کرنے کے احکام موجود ہیں۔ ان کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ یہاں زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ بنارس کے جس کاشی ناتھ نامی مندر کا مولانا نے تذکرہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بنارس میں اس نام کے مندر کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اسی طرح مولانا نے اپنے مقالہ میں ایک اور قیاس آرائی فرمائی ہے کہ:

"داراشکوہ کے حالات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں کو یہ جرأت ہوئی تھی کہ وہ غریب مسلمان بچوں کو اپنے پاٹھ شالاؤں میں دنیوی اور مذہبی تعلیم دیتے تھے۔" [مقالات شبلی ج ۷ ص ۱۰۲]

یہ بیان بھی کتنا حیرت انگیز ہے کہ صرف داراشکوہ کے حالات پر قیاس کر کے علی الاطلاق اس دور کے بنارس کے تمام مدرسوں میں ہندوؤں کی مذہبی تعلیم مسلمان بچوں کے لیے ضروری سمجھ لی جائے۔ حالانکہ اس بیان کی تائید میں مولانا نے کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا۔

داراشکوہ کے عقیدے کے متعلق بھی مولانا کو مغالطہ ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اسے

بالکل ہندو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہر حال مسلمان تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کے عقائد ڈگمگ تھے۔ جیسا کہ اس کی تصانیف سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کی بنا پر اسے بالکل ہی ہندو ہونے کا فیصلہ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ داراشکوہ نے ان مدارس کے تحفظ و بقا کے لیے جو کوششیں کیں وہ عالمگیر نے بھی کیں۔

داراشکوہ نے اپنشدوں [ویدوں] کے جو ترجمے کرائے ہیں ان کے دیباچے میں تحریر کرتا ہے کہ:

> چون دریں ایام بلدۂ بنارس که دار العلوم ایں قوم است تعلق بایں جوی داشت اپنکت ها که یعنی اسرار پوشیدنی باشد ومنتهای مطلب جمیع اولیاء الله است درسنه یک هزارو شصت و هفت هجری بی غرضانه ترجمه نموده وهر مشکلی وهر سخن بلندی توحید که می خواست وطالب آں بوده نمی یافت.

اس عبارت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ داراشکوہ نے بنارس جیسے شہر کو دارالعلوم کی حیثیت سے تسلیم کر کے اپنا تعلق ظاہر کیا ہے اور اپنشدوں کا بے غرضانہ ترجمہ کرایا۔ اس خدمت سے ہندوؤں پر ایک احسان ظاہر ہوتا ہے، جو اس کی مذہبی رواداری کی ایک بہترین مثال ہے۔

عہد عالمگیر میں بھاشا کی خدمات:

عالمگیر کے متعلق ایک خیال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے علوم کی نشر و اشاعت روک دی تھی اور ان کے علوم و زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھاشا[1] زبان پر جس قدر اس کے زمانے میں توجہ کی، پہلے کبھی نہیں کی تھی، گو عالمگیر سے پہلے بھی مسلمانوں میں ہندی نواز شعراء گزر چکے تھے، جن میں

---

[1] وہ ہندی بولی جو سنسکرت سے نکلی ہے۔ بھاکا۔ دیسی بولی۔ [فرہنگ آصفیہ] ع ب نعمانی

حضرت امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں، شیخ محمد تودف بلگرامی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ایران کا ایک مشہور شاعر 'ضمیر' تھا، وہ عالمگیر کے زمانے میں ایران سے آیا اور شاہی منصب داروں میں مقرر ہوا۔ اس نے بھاشا زبان میں انتہائی کمال حاصل کیا۔ اسی طرح عبدالجلیل بلگرامی [مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا] عالمگیر کے درباری اور ہندی کے بڑے ممتاز شاعر تھے۔

اسی زمانے میں سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کے علم ادب میں نہایت شہرت حاصل کی۔ سنسکرت کی تعلیم کے لیے بنارس کا سفر اختیار کیا اور یہاں رہ کر اس علم کی تکمیل کی۔ ہندی موسیقی میں اس درجہ کا کمال پیدا کیا کہ لوگ ان کو 'نایک' کہتے تھے۔ چنانچہ اس فن سے متعلق بھاشا میں دو کتابیں 'تاؤ چندر کا' اور 'بدھنایک سنگار' بھی تصنیف کیں۔ بھاشا میں بدھنایک تخلص کرتے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے :

جو چترانن چت چڑھے نہ بڑھے، بدھ بیدن گرنتھ نہ گائے
بھاری بھوری کری، بھرپن جپ، جوگن، جوگ اتھیہ گنائے
جوگ جوت جگی، نہ تھکی بدھنایک گھونگھٹ، چنچل تارے
جھینن، دوکول، چھے، جھلکی ابجھ، براجت، اچھ، رچائے

مطلب یہ ہے کہ:

تمہاری آنکھیں نقاب کے اندر جتنی خوشنما ہیں وہ فرشتوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتیں اور نہ آسمانی کتابوں میں ان کی تعریف پائی جاتی ہے، ہماری گویائی بھی حیرت میں ہے اور ایک زاہد مرتاض تسبیح کے دانے ہلانے سے بھی زیادہ اس کا مداح ہے۔ نقاب ان آنکھوں کی خوبی کو نہیں چھپا سکتی بلکہ باریک دوپٹہ اس کی خوبی کو اور بھی دوبالا کر دیتا ہے۔

[سروآزاد: میر غلام علی آزاد بلگرامی]

شہنشاہ اورنگ زیب پر مندر شکنی کا الزام:

عام طور پر انگریزی دور میں تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اورنگ زیب نے مندروں کو توڑ کر ان کی جگہ مسجدیں بنوائیں اور سب سے زیادہ ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ یوپی حکومت کے محکمۂ سیاحت نے باہر سے آنے والے سیاحوں کے لیے جو کتابچہ شائع کیا ہے، اس میں بھی یہی بات لکھی ہے۔ جب کہ یہ بات قطعی غلط اور بے بنیاد ہے، اور اس کا کوئی ثبوت قیامت تک نہیں مل سکتا۔ کیونکہ یہ بات اسلام کی تعلیم کے بھی خلاف ہے۔ اسلام نے کسی عبادت گاہ کو ویران کرنے کی نہ تعلیم دی اور نہ ایسی جگہوں پر مسجد بنانے کی اجازت دی۔ اگر بالفرض ایسا کر بھی لیا گیا تو شرعاً نہ تو وہ مسجد ہوگی اور نہ ہی ایسی مسجد میں نمازیں ادا کرنا جائز ہوگا۔

بھارت ورش کی تاریخ میں ایک طویل زمانے تک برہمن ازم اور بدھ ازم میں ٹکراؤ جاری رہا اور باہمی کشت وخون کے ساتھ ہزاروں مندر مسمار ہوگئے، لیکن آج تمام 'دانشوروں' کی زبانیں بند ہیں اور اہل صحافت بھی خاموش ہیں۔ جبکہ یہ واقعہ ہندو ازم کے نزدیک ایک سنگین جرم تھا۔ اس کے برخلاف ایک غلط اور بے بنیاد الزام لگا کر مسلم بادشاہوں کو مطعون کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جو تاریخی حقائق کے قطعی خلاف اور ہندوستان کے ان مسلم فرماں رواؤں کا دامن اس الزام سے قطعی پاک ہے جنھوں نے قومی ایکتا، امن وانصاف اور رعایا پروری کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں جو رہتی دنیا تک زندہ رہیں گی۔ اگر تعصب کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے تو یہ فیصلہ ان فرامین اور جاگیروں کو پڑھ کر آسانی سے کیا جاسکتا ہے جو مندروں کے لیے ان فرمانرواؤں نے جاری کیے ہیں۔ اس امن اور اتحاد کو غارت کرنے کی تمام تر ذمہ داری ان مصنفین اور تاریخ نویسوں پر ہوتی ہے، جنھوں نے تاریخ کو بالکل توڑ مروڑ کر غلط طریقے سے پیش کیا ہے۔ ورنہ اکبر کے ساتھ مان سنگھ اور ٹوڈرمل جیسے لوگ ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے رہتے

تھے۔اورنگ زیب کا سپہ سالار ہندو تھا۔سکھوں کی فوج میں پٹھان خاصی تعداد میں تھے۔مغل بادشاہوں کی محل سرامیں ہندو رانیاں زینت بنیں، اکبر نے فتح پور سیکری کے قلعہ میں جودھابائی کے نام سے مندر تعمیر کرایا، جوآج بھی موجود ہے۔شیواجی[1] کی فوج میں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی موجود تھی۔ راجا جے چند نے اپنی مدد کے لیے شہاب الدین کو بلایا[2]۔

---

[1] یہ ریاست مہاراشٹر کے ضلع پونے میں ۱۹رفروری ۱۶۳۰ء کو پیدا ہوے۔ پورا نام شیواجی بھوسلے تھا۔ ۶جون ۱۶۷۴ء کو تاج پوشی ہوئی اور مراٹھا سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ مراٹھا سلطنت برصغیر میں ایک سامراجی طاقت تھی جو ۱۶۷۴ء سے ۱۸۱۸ء تک موجود رہی۔ اپنے دور عروج میں یہ سلطنت بڑے حصہ پر حکمراں رہی۔ مراٹھا سلطنت کے عروج کو بھی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی ایک وجہ بتلائی جاتی ہے۔ ع ب نعمانی[بحوالہ وکی پیڈیا]

[2] مزید: شہنشاہ اورنگ زیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ حالانکہ اس کی تردید ٹھوس دلائل اور واقعات کی روشنی میں اوپر کے صفحات میں کردی گئی تاہم اس سلسلے میں مزید کچھ ضروری معلومات ملاحظہ فرمائیں:

نامور ہندو مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اپنی کتاب 'تاریخ ہند' میں شہنشاہ اورنگ زیب کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوے لکھتا ہے کہ:

> ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اورنگ زیب ایک کٹر مسلمان تھا، وہ اکبر اور جہانگیر کی طرح غیر اسلامی مراسم میں بذات خود کوئی حصہ نہیں لیتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی چونکہ اسلامی تعلیم کے مطابق دوسروں کے مذہب میں مداخلت بدترین گناہ ہے اس لیے وہ کسی بھی غیر مسلم کے عقیدے کے بارے میں تعرض نہیں کرتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں کو اس کے عہد حکومت میں پوری مذہبی اور شہری آزادی حاصل تھی، نیز ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔''

شہنشاہ اورنگ زیب کی وسیع النظری کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے دربار میں جہاں مسلم علماء اور شعراء کی قدر کی جاتی تھی وہاں ہندو شعراء اور فضلاء کو بھی دل کھول کر نوازا جاتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ ہندی زبان کے نامور شاعر چِنتامنی کو عالمگیر کے دربار میں کس قدر عظمت حاصل ہوئی تھی۔ اسے درباری شعراء میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ چِنتامنی کے علاوہ اس کا بھائی بھوشن کوی بھی درباری شعراء میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ ہندی زبان کے یہ دونوں شعراء امراء کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کو بہت بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ ساتھ ہی مغل دربار سے گرانقدر وظائف بھی جاری تھے۔

'ہسٹری آف ہندی لیٹریچر' میں مصنف شری کئی نے بھی اورنگ زیب کی وسیع النظری کی بہت تعریف کی ہے۔ چنانچہ وہ عالمگیر کے بارے میں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ:

[جاری......اگلے صفحہ پر]

''اورنگ زیب علوم وفنون کا بے حد دلدادہ تھا، اسی لیے ہندو شعراء بھی درباری عنایات سے محروم نہیں رہے اور بہت سے ہندو شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ سے وابستہ تھے۔''

ہندی زبان کے ہندو شعراء کے علاوہ شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں فارسی زبان کے ہندو شعراء کی بھی جی کھول کر قدر دانی کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر دامق کھتری کو اورنگ زیب کے دربار میں غیر معمولی رسوخ حاصل تھا۔ اسے امرائے عالمگیری میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی فارسی نظم ونثر کو اورنگ زیب بے حد پسند کرتا تھا۔

رائے بندرابن کو بھی عہد عالمگیری میں بڑا عروج حاصل ہوا جو دارا شکوہ کے دیوان رائے بہارامل کا بیٹا تھا۔ اورنگ زیب ہی کی نگرانی میں اس کی تربیت ہوئی تھی۔ رائے کا خطاب اسے اورنگ زیب ہی نے عطا کیا تھا۔ بندرابن چونکہ بہادر شاہ کی شہزادگی کے زمانے ہی سے اس کی ملازمت میں رہا تھا اس لیے اس کا نام 'بندرا ابن بہادر شاہی' پڑ گیا تھا۔ اس نے 'لب التواریخ' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں شہاب الدین غوری سے لے کر ۱۱۰۱ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ اس تاریخ میں عربی آمیز فارسی اس خوبی سے لکھی گئی ہے کہ بعض اوقات مصنف کے ایرانی ہونے کا شبہہ ہونے لگتا ہے۔ اورنگ زیب نے اس کتاب کی خوب قدر کی اور مصنف کو مالا مال کر دیا۔

اسی طرح اورنگ زیب نے ایک دوسرے ہندو اہل قلم ایشور داس کو بھی خوب نوازا۔ یہ قوم کا ناگر اور پٹن کا باشندہ تھا۔ تیس سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب سے تحصیل علم کرتا رہا، اس کے بعد شاہی ملازمین میں شامل ہو کر جودھ پور کا امین مقرر ہوا۔ اس نے میدان جنگ میں بھی نہایت اہم خدمات انجام دی تھیں اس لیے اورنگ زیب نے اس کی ان خدمات سے خوش ہو کر اسے پنج صدی افسر مقرر کر دیا تھا۔ 'فتوحات عالمگیری' اس کی ایک غیر فانی یادگار ہے جس میں کہ ۱۶۵۷ء سے ۱۶۹۵ء تک کے واقعات درج ہیں۔

بھیم سین کائستھ کو بھی دربار اورنگ زیب میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ اس کا شمار بھی عہد عالمگیر کے نامور مورخوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ شاہی ملازمت میں بندیلہ کے حاکم کے ساتھ منسلک تھا، دکن کی لڑائیوں میں چونکہ اس نے اہم کارنامے انجام دیے تھے اس لیے شہنشاہ اورنگ زیب نے اسے 'راؤ' کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر مقرر کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد بھیم سین کو قلعہ نالڈاک کا قلعہ دار بنا دیا گیا تھا۔ اس نے 'دلکشا' کے نام سے عہد عالمگیری کی تاریخ بھی لکھی ہے جو بہت اہم تسلیم کی جاتی ہے۔

سُجان رائے کھتری، جو پٹیالہ کا رہنے والا تھا، اسے بھی دربار عالمگیری میں بہت بڑا اعزاز حاصل تھا۔ اورنگ زیب اس کی تحریروں کو بہت پسند کرتا تھا۔ 'خلاصۃ التواریخ' کے نام سے اس نے ایک طویل تاریخ بھی لکھی ہے جو ابتدائے اسلام سے شروع ہو کر شہنشاہ اورنگ زیب کے حالات پر ختم ہو جاتی ہے۔ سُجان نے اس تاریخ کو اورنگ زیب کے نام سے معنون کیا تھا، جس کی قدر دانی کرتے ہوئے اورنگ زیب نے اسے بڑی جاگیر عطا کی تھی جو صدیوں تک اس کی اولاد کے قبضے میں رہی۔

اورنگ زیب نہ صرف یہ کہ ہندو شعراء وادباء سے ہی محبت وعقیدت رکھتا تھا، بلکہ ان کی تصنیفات کا بھی بڑا مداح تھا۔ یوں تو اس کے عہد میں بہت سارے ہندوؤں نے کئی کتابیں لکھیں، لیکن 'ست اچھر' اور 'رد الفکر' نامی یہ دو کتابیں جو ہندوؤں کے رسوم وعقائد سے تعلق رکھتی ہیں، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ 'ست اچھر' کا مصنف لعل

[جاری......اگلے صفحہ پر]

اس موقع پر یہ ذکر بھی عبرت سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے یہاں راکھی کی رسم بھی مغل بادشاہ ہمایوں ہی سے تعلق رکھتی ہے جب کہ ایک ہندو رانی کرناوتی نے ہمایوں کو اپنا بھائی اور ہمایوں نے اس کو اپنی بہن بنایا۔ اور ہمایوں کے یہ شاہانہ الفاظ آج تک یادگار ہیں کہ حکومت تو پھر مل سکتی ہے، لیکن بہن کی عصمت واپس نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے انسانوں کی ملی جلی آبادی میں جہاں مختلف مذاہب اور فرقے ہوں ایسی روشن ہدایات دی ہیں جن سے ساری لڑائیاں اور جھگڑے ختم ہوسکتے ہیں اور آپس میں اتحاد و اتفاق اور یگانگت پیدا ہوسکتی ہے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ داراشکوہ کو جب شاہجہاں نے بنارس میں گورنر مقرر کیا تھا، اس وقت بنارس کے جنگم باڑی مٹھ کی پانچ حویلیاں ضبط کی گئیں۔ یہ قضیہ قاضی مفتی نور اللہ حسینی رحؒ[1] [متوفی ۱۱۰۴ھ] کے پاس آیا۔ انہوں نے اس کا جو فیصلہ کیا وہ انتہائی قابل قدر ہے۔ داراشکوہ نے اس معاملے میں اپنا جو فرمان صادر کیا تھا، مفتی نور اللہؒ مذکور نے بھی اس کی تائید کی جو درج ذیل ہے:

بہاری ولد کا ہید سنگھ، ساکن قنوج ہے۔ لعل بہادر نے اس کتاب کے دیباچہ میں اورنگ زیب کو جن الفاظ اور عقیدت کے ساتھ یاد کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ہندو اہل قلم اس مغل بادشاہ کے کتنے مداح اور دلدادہ تھے۔

ان تاریخی حقائق اور واقعات سے یہ بات واضح ہے کہ اورنگ زیب نے کیسی فراخ دلی کے ساتھ نہ صرف ہندو اہل قلم حضرات کی سرپرستی کی، بلکہ ان کے علوم وفنون کو خاطر خواہ ترقی دے کر کیسی وسیع النظری کا ثبوت دیا۔

ایک اور ہندو مورخ سجان رائے عہد عالمگیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"شہنشاہ اورنگ زیب چونکہ خود بہت بڑا عالم وفاضل تھا، اس لئے اس نے علوم وفنون کو ترقی دینے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کے زمانے میں پورے ملک میں مدارس کا جال پھیلا ہوا تھا، ان مدارس میں تعلیم پانے والے طلبہ کو بلا امتیاز مذہب وملت مفت تعلیم دی جاتی تھی اور وظائف بھی دئے جاتے تھے۔ ملک میں جابجا ہندو مدرسے بھی قائم تھے۔"

ع ب نعمانی [مستفاد از ماہنامہ 'دین ودنیا'۔ فروری ۱۹۷۸ء]

[1] آپ کا تفصیلی تذکرہ حضرت مصنفؒ کی دوسری کتاب 'تذکرہ مشائخ بنارس' میں صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی

فرمان بادشاہ داراشکوہ:

"جملہ موجودہ وحال و مستقبل کے حکام پرگنہ حویلی چنار کو
مطلع کیا جاتا ہے کہ صاحبقران ثانی کی طرف سے ۱۰۰ بیگھ زمین پرگنہ
جنگم کو مدد معاش کے طور پر عطا کی گئی۔ ان کا قبضہ تسلیم کیا۔ اس زمانے کا
قبضہ ان کے حوالے کر دیا جائے اور اس میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔
اور ان سے کورٹ کے کوئی بھی مصارف نہ لیے جائیں، تاکہ وہ مشغول
عبادت رہ کر بادشاہ کی خداداد حکومت کے لیے دعا میں مصروف رہیں۔
۲۳ ر ربیع الثانی ۱۰۵۱ھ"

فیصلہ قاضی مفتی نوراللہ حسینیؒ:

"جنگم ساکن بنارس میرے پاس آئے اور ایک پروانہ دکھایا
جس میں قاضی عبدالوہاب قاضی الوقت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جنگم نے
شکایت کی کہ ان کی ۵ حویلیاں مشمولہ زمین مذکور کو شاہی تحصیل کے عملہ
نے ہماری جائداد کے اوپر ٹیکس لگا دیا ہے اور مبلغ ۵۰۰ روپیہ وصول
کر لیے ہیں، جس کی وجہ سے وہ انتہائی پریشان ہیں۔ یہ مقدمہ میرے
پاس آیا۔ لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ مذکورہ رقم اور پانچوں حویلیاں جنگم کو
واپس کر دی جائیں، اور ان کے اختیارات اور قبضہ کی چیزوں پر کسی طرح
کی مداخلت نہ کی جائے۔

۵ ر جمادی الاولیٰ ۱۰۸۵ھ م ۱۶۷۵ء"

ایسے ہی داراشکوہ کا ایک اور فرمان وشوناتھ مندر[1] بنارس میں اب بھی موجود ہے جو اس کی رعایا پروری اور مذہبی رواداری کی ایک اہم مثال ہے۔ یہ فرمان اس نے بادشاہ اورنگ زیب کے جلوس سلطنت سے ایک سال قبل یعنی ۱۰۶۷ھ میں وشوناتھ مندر کے مہنت بھیم رام لنگیا[2] کے نام سے جاری کیا تھا جو ایک یادگار ہے۔ فرمان کی عبارت مع ترجمہ درج ذیل ہے:

۱؎ اس مندر کا تفصیلی تعارف آگے صفحہ..... پر ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی

۲؎ شیو جی کے عبادت گزاروں کو 'لنگیا' کہا جاتا ہے۔ ع ب نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متصدیان مهمات حال واستقبال پرگنه بنارس بعنایت شاهانه امید واربوده بدانند که چون بعرض مقدس رسید که بموجب فرمان عالی شان مقرر شده که آنچه جماعة هنود بجهت پوجای مهادیو بشیشر وغیره واقعه بنارس می آرند،به بهیم رام وغیره لنگیان تعلق داشته باشد ،لهٰذا حکم جلیل القدر شرف صدوری باید که برطبق فرمان عالیشان عمل نموده لوازم پوجامذکور رابتصرف وتعلق لنگیان مذکوروورثه آنها راگزاشته بپوجا مزاحمتی نرسانند ،دریں باب قدغن دانند تحریراً فی تاریخ چهارم شهر صفر ختم اللہ بالخیر والظفر ۳۰ جلوس مبارک مطابق ۱۰٦۷ هجری

ترجمہ:

"موجودہ اور آنے والے زمانے کے پرگنہ بنارس کے تمام شاہی کار پرداز شاہانہ عنایت کے امید وار رہ کر جان لیں کہ جب بادشاہ مقدس کے پاس یہ خبر پہنچی کہ فرمان عالی شان کے بموجب جیسا کہ مقرر ہے کہ کچھ ہندوؤں کی جماعت مہادیو بشیشر وغیرہ واقع بنارس کے پاس پوجا کی اشیاء پجاری لے کر آتے ہیں، ان کا تعلق صرف بھیم رام وغیرہ لنگیوں سے ہے۔لہٰذا یہ جلیل القدر حکم صادر ہونے کا شرف پاتا ہے کہ سابق فرمان عالیشان کے مطابق عمل کرتے ہوے پوجا مذکور کے لوازم کا تعلق صرف مذکورہ لنگیوں ہی سے ہوگا اور ان کے تصرف واختیار میں رہے گا، اور ان کے بعد ان کے وارثوں کو بحال رہے گا۔ان کی پوجا میں کسی طرح کی مزاحمت نہ کریں اور اس بارے میں تاکید جانیں۔"

اس فرمان میں داراشکوہ نے جس پجاری بھیم رام کو نامزد کیا تھا اور ان کی اولاد کے لیے تا قیام قیامت یہ حکم صادر کر دیا کہ وہ پوجا کی اشیاء کی حقدار ہوں گی، ان کے علاوہ

کوئی دوسرا حقدار نہ ہوگا، یہ اسلامی عدل وانصاف اور رعایا پروری کی ایک انوکھی مثال ہے اور یہ فرمان آج تک ان کی اولاد میں محفوظ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس مندر کے توڑے جانے کا الزام داراشکوہ کے بھائی اورنگ زیب پر عائد کیا جاتا ہے، اسی مندر میں اسی کے فرمان کے مطابق آج بھی عمل درآمد ہو رہا ہے[1]

اسی سلسلے کا ایک اور ثبوت خود جامع مسجد گیان واپی کی پشت پر پچھّم جانب مندر کا ایک ڈھانچہ ہے جو مکمل نہیں ہے۔ اس کی تعمیر شروع ہوئی تھی لیکن مسجد کی زمین ہونے سے اس پر حکم امتناعی (Stay order) صادر ہو گیا تھا اس لیے مکمل نہ ہو سکی۔ کیوں کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اس زمین پر شاہجہاں نے ۱۰۴۸ھ م ۱۶۳۹ء میں ایک مدرسہ بنام ایوان شریعت قائم کیا تھا جو اس کا تاریخی نام ہے۔ لہٰذا اس زمین پر مندر بننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی رواداری کی ایک اہم مثال ہے کہ وہ ڈھانچہ بدستور اپنی جگہ رہ گیا، کوئی چیز نہ گرائی گئی اور نہ توڑی گئی[2]

لیکن اورنگ زیب کو سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے۔ حالانکہ اورنگ زیب ہی کی شخصیت مغل بادشاہوں میں ایسی ہے کہ اس نے ہندوؤں کے پرانے مندروں اور

---

[1] افسوس کہ اب ان مہنتوں اور پجاریوں کی تقرری کی یہ پرانی روایت باقی نہ رہی اور سارا انتظام ریاستی حکومت کے زیر اہتمام ہونے لگا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۸۳ء میں مندر مذکور میں زبردست چوری ہوئی، جس کی وجہ سے ریاستی سرکار نے اس میں مداخلت کرتے ہوئے اس کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے خلاف اس وقت کے مہنت لکشمن پرشاد تیواری نے اس سرکاری مداخلت کے ختم کرنے کی پوری جدوجہد کی۔ اس لڑائی میں حضرت والد ماجد مولانا مفتی عبدالسلام نعمانی مجددیؒ [متوفی ۱۹۸۷ء] سے بھی انہوں نے معاونت چاہی، لیکن ساری تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ آج بھی یہ مداخلت برقرار ہے۔ سرکار جسے چاہتی ہے، مہنت اور پجاری کا کام اسی سے جب تک چاہتی ہے لیتی ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ راجیندر تیواری۔ یکے از خانوادہ مہنت]

[2] اس موقع پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر اسی وقت فراست کا ثبوت دیتے ہوئے اس ناجائز مندر مذکور کو منہدم کر کے بالکل ہی نیست و نابود کر دیا جاتا تو شاید آج یہی ڈھانچہ جوان فرقہ پرستوں کے جھوٹے پروپیگنڈوں کو تقویت پہنچاتا ہے، اور جس کی وجہ سے حفاظت کے نام پر مسجد مذکور سرکاری تحویل میں لے لی گئی ہے، آج پوری آزادی کے ساتھ ہم اپنے اختیارات کا استعمال کرتے۔ ع ب نعمانی

ان کے پروہتوں کے حقوق کی حفاظت کے خیال سے کئی فرمان جاری کیے۔ چنانچہ ۱۵ر جمادی الاخریٰ ۱۰۶۹ھ یعنی اپنے جلوس کے دوسرے ہی سال بنارس کے ناظم ابوالحسن کے نام اس نے ایک فرمان جاری کیا جو آگے درج کیا جارہا ہے۔ یہ فرمان بھارت کلا بھون، بنارس ہندو یونیورسٹی کے اندر موجود ہے اور 'مآثر عالمگیری' میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ مجھے اس فرمان کا فوٹو جناب خلیل الرحمٰن صاحب[1] ساکن ندیسر وارانسی کے یہاں سے حاصل ہوا۔ فرمان ملاحظہ ہو:

بسم الله الرحمٰن الرحیم

منشور لامع النور اور نگ زیب محی الدین شاه بهادر غازی لائق العنایة والمرحمته ابوالحسن بالتفات شاهانه امید وار بوده بداند که چون بمقتضای مراحم ذاتی و مکارم جبلی همگی اعلیٰ همت والانهمت وتما می نیت حق تقویت مابررفاهیت جمهور انام وانتظام احوال طبقات خواص وعوام مصروف است واز روی شرع شریف وملت منیف مقرر چنیں است که دیر ها دیریں برانداخته نشوند بتکده هائے تازه بنا نیابد ودریں ایام معدلت انتظام بعرض اشرف اقدس ارفع اعلیٰ رسید که بعض مردم از راه تعنت وتعدی به هنود سکنه قصبه بنارس وبرخی امکنه دیگر که بنواحی آں واقع است وجماعه برهمناں شد نه آنمحال که سدافت بت خانه هائے قدیم آنجا بآنها تعلق دار دومزاحم ومتعرض می شوند ومی خواهند که اینا نرااز سدانت آں که ازمدت مدید بآنها تعلق است بازدار ندواین معنی باعث پریشانی وتگرقه حال ایں گروه می گردد، لهٰذا حکم والا صادرمی شود که

---

[1] آپ ایک ماہر حکیم تھے۔ افسوس کہ ۲۹/۶/۲۰۰۴ء کو انتقال کر گئے۔ آپ کے پوتے مسعود احمد صاحب مدرسہ چراغ علوم بنارس میں مدرس ہیں۔ ع ب نعمانی

بعداز ورودایں منشور لامع النور مقرر کند که من بعد احدی بوجود بیحساب تعرض وتشویش باحوال برهمنان ودیگر هنود متوطنه آنمحال نرسانه تاآنها بدستور ایام پیشیں بجاو مقام خودبوده وبجمعیت خاطر بدعای بقای دولت خداداد به مدت ازل بنیاد قیام نماید ودریں باب تاکید دانند.

بتاریخ ۱۵ شهر جمادی الثانیه ۱۰۶۹ھ نوشته شد.

ترجمہ:

فرمان اورنگ زیب محی الدین شاہ بہادر غازی عنایت اور مہربانی کے لائق ابوالحسن، شاہانہ توجہ کے امیدوار رہ کر معلوم کرلیں کہ چونکہ ذاتی مہربانیوں اور فطری بخششوں کے تقاضے کی بناپر ہماری بلند ہمت اور حق پسند نیت تمام رعایا کی بہبودی اور خواص وعوام کے تمام طبقوں کی بھلائی میں مصروف ہے۔ اور شرع شریف اور ملت اسلامیہ کی رو سے بھی یہی لازم ہے کہ قدیم مندروں کو ہرگز منہدم اور برباد نہ کیا جائے اور نئے بت خانے بھی تعمیر نہ ہوں۔ آج کل یہ بات ہمارے گوش گزار ہوئی ہے کہ بعض عمال [کارپرداز] ظلم اور زیادتی کی بناپر قصبہ بنارس اور اس کے اطراف وجوانب کے رہنے والے ہندوؤں اور برہمنوں کے ساتھ جو قدیم مندروں کے پروہت ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ ان کو ان کی پروہتی سے جو ان کا قدیمی حق ہیں الگ کردیں۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ یہ بیچارے پریشان ہوکر مصیبت میں مبتلا ہوجائیں۔ اس لیے تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی کوئی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص اس علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے اور ان کو کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہونے دے تاکہ یہ جماعت بدستور سابق اپنی اپنی جگہوں اور منصبوں پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خداداد [خدا کی دی ہوئی سلطنت] کے حق میں مصروف دعا رہے۔ اس بارے میں تاکید جانیں۔

بتاریخ ۱۵ ر جمادی الثانیہ ۱۰۶۹ھ کو لکھا گیا۔
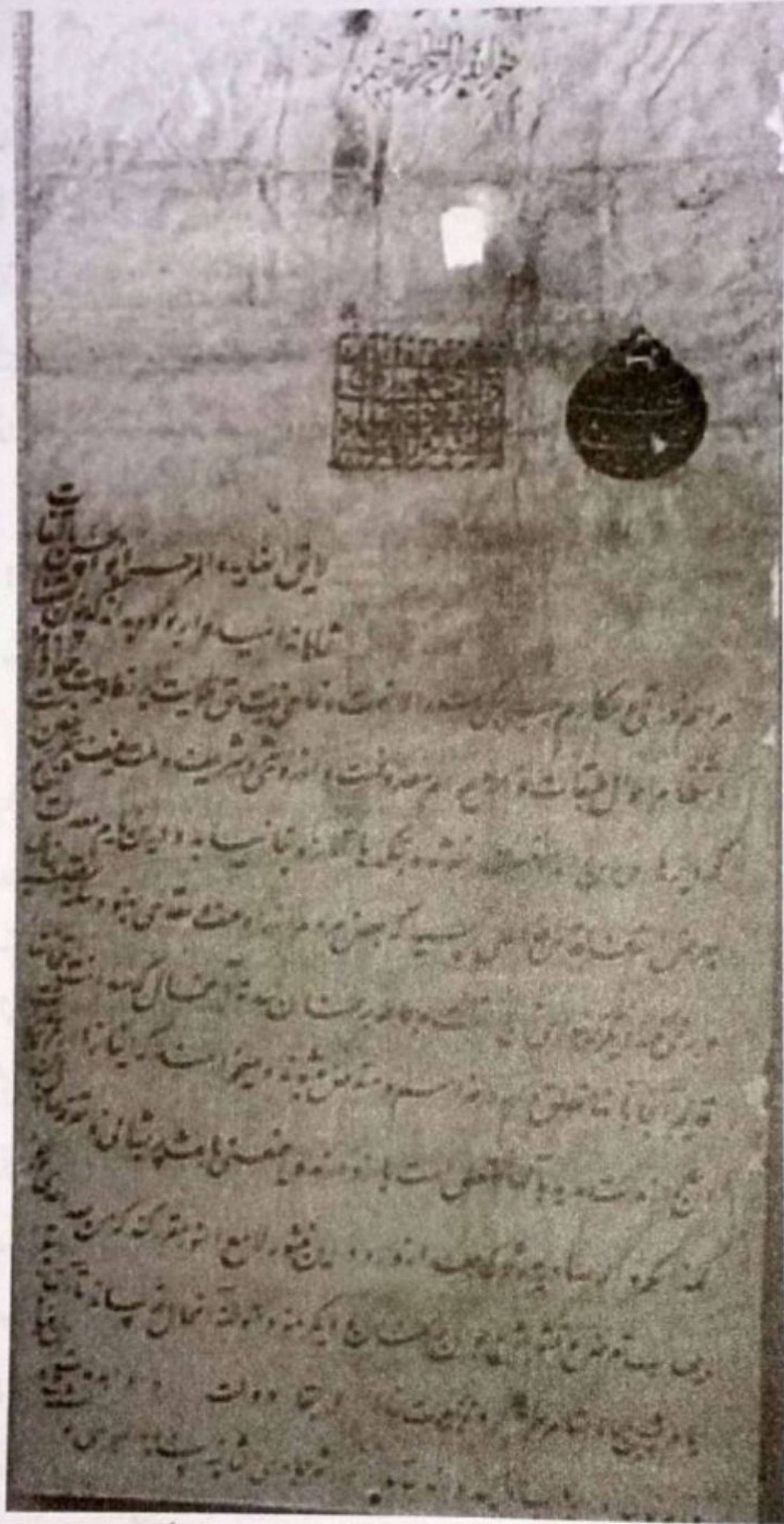
اورنگزیب کا وہ مشہور فرمان جس پر یہاں صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۶ بحث کی گئی ہے۔

اصل فرمان بھارت کلا بھون میں موجود ہے اور اس کا عکس وہاں عام نمائش کے لیے بھی رکھا گیا ہے۔

انگریزوں کے دور میں کرنل ڈی سی فلٹ نامی ایک انگریز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں بنارس آیا اور اسے اس فرمان کا فوٹو ملا تو اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ جس عالمگیر کی مندر شکنی کا اتنا شہرہ ہے، اس کا ایسا فرمان کس طرح ہوسکتا ہے؟ اس کے خیال میں وہ جعلی تھا۔ وہ اس وقت کے کوتوال بنارس خان بہادر محمد طیب سے ملا۔ کوتوال ایک مقدمہ کی تحقیقات کے سلسلے میں اس فرمان کو دیکھ چکے تھے جو منگل پانڈے ساکن محلّہ منگلا گوری کے قبضے میں تھا۔ ڈی سی فلٹ نے کوتوال کے ساتھ جا کر اصل فرمان کو دیکھا تو اس کو یقین آیا۔

اب یہ فرمان 'کلا بھون' متعلقہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے اندر موجود ہے۔ پہلے پہل اس کا عکسی فوٹو 'کامریڈ' اخبار کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب میں فرمان کی جو عبارت شائع کی گئی ہے وہ ایک صاحب کے پاس موجود فوٹو سے لی گئی ہے۔

دراصل اس فرمان کے جاری کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اورنگ زیب کے زمانے میں کچھ برہمنوں نے سرکاری زمین پر بغیر اجازت مندر بنا لیے تھے۔ ابوالحسن حاکم بنارس نے ان کو غیر قانونی ہونے کے باعث گرانے کا حکم دے دیا تھا، جیسا کہ آج بھی یہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص سرکاری زمین پر کوئی مندر یا مسجد تعمیر کرا لے تو وہ غیر قانونی ہوگی اور حکومت وقت اس کو گرا سکتی ہے۔ ٹھیک یہی صورت حال اس زمانے میں بھی تھی۔ ابوالحسن نے قانون شریعت کا پاس کرتے ہوئے ایسے ہی مندروں کو جو سرکاری زمین پر حکومت کی اجازت کے بغیر تعمیر ہو گئے تھے، گرانے کا حکم دے دیا۔ اورنگ زیب کو جیسے ہی یہ خبر ملی، اس نے بے حد خفگی کے ساتھ یہ فرمان جاری کر دیا اور اس میں صاف صاف یہ حکم دے دیا کہ شریعت کے قانون کے مطابق اگر نئے مندر نہیں بنائے جا سکتے تو پرانے مندروں کو توڑا بھی نہیں جا سکتا۔ اور اس فرمان میں ''بعض مردم'' کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ لوگ اس قسم کے تھے۔

میرے محترم دوست جناب ڈاکٹر ڈی۔جی بھٹناگر صاحب ریڈر شعبہ تاریخ بنارس ہندو یونیورسٹی نے اس فرمان پر ایک تبصرہ بھی سپرد قلم کیا ہے، جو انگریزی میں ہے

D.D. KOSAMBI COMMEMORATION VOLUME COMMITTEE,B.H.U. اور نے ۱۹۷۷ء میں اپنے 'میگزین' میں اس کو شائع کیا ہے۔اس تبصرہ کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

۱) اس فرمان میں لفظ "بعض مردم" سے مراد ہندوؤں سے ہے،صرف مسلمانوں سے نہیں ہے۔

۲) فرمان میں جہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ برہمنوں کی ایک جماعت مندر کے مہنتوں کو ان کے عہدوں سے برطرف کرنا چاہتی ہے،اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس ہنگامے کا سبب برہمن اور مندروں کے مہنت خود ہی تھے،کیوں کہ یہ عہدہ برہمنوں کے ایک خاص گروہ کے لیے خاصی جنگ کا سبب رہا ہے اور یہ تنازعہ بنارس میں اس وقت اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ معاملہ بادشاہ کی عدالت تک پیش کرنا ضروری ہو گیا تھا اور اورنگ زیب تک جب یہ جھگڑا پہنچا تو اس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کے لیے فوراً یہ فرمان جاری کر دیا۔

۳) یہ فرمان قدیم مندروں کو نہ توڑنے کی سختی کے ساتھ تنبیہہ کرتا ہے۔

۴) اگر عبدالحمید لاہوری مصنف 'شاہجہاں نامہ' کی بات پر یقین کر لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ شاہجہاں کے وقت میں ان مندروں کو پورا کرنے کی اجازت نہیں تھی،جو جہانگیر کے زمانے میں بننے شروع ہوئے تھے۔شاید شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کے قدیم مندروں سے مراد وہ مندر ہیں جو اکبر کے زمانے میں توڑ پھوڑ سے بچ گئے تھے۔اکبر کا زمانہ گزرتے ہی مذہبی جذبہ ختم ہوتا گیا،یہاں تک کہ جہانگیر کے زمانے کے بھی بنے ہوئے مندروں کو گرا دیا گیا۔

۵) جس وقت شاہجہاں گجرات میں تھا تو اس کو خبر ملی کہ کچھ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو ہندو بنا دیا ہے۔لہٰذا اس نے اس معاملے کی چھان بین کے لیے شیخ محمود گجراتی کا تقرر کیا جس نے ستر [۷۰] عورتوں کو دوبارہ مسلمان کیا۔ان میں جو عورتیں شادی کر چکی تھیں ان کے ہندو شوہروں پر

جرمانہ لگایا گیا۔ان شوہروں میں سے جس نے مسلمان ہونا قبول کرلیا اسے جرمانے سے نجات مل گئی۔

۶) عبدالحمید لاہوری نے' بادشاہ نامہ' میں لکھا ہے کہ کچھ ہندوؤں نے مسجدوں کو گھروں میں بدل دیا تھا۔شاہجہاں نے حکم دیا کہ چھان بین کے بعد مسجدوں کو ان کے مذہبی پیشواؤں کے حوالے کردیا جائے۔ایسی صورت میں ان مقبوضہ مسجدوں کو جو زبردستی مندر بنالیے گئے تھے، گرادیا گیا اوران کی جگہ دوبارہ مسجدیں بنادی گئیں۔

۷) وشوناتھ مندر کا گرایا جانا بھی اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔کیوں کہ بنارس کے مندروں کو سب سے زیادہ نقصان سکندر لودی[متوفی ۱۵۷۰ء] سے پہنچا۔مورخین کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ تاریخ کے ایک متوسط زمانے میں وشوناتھ مندر کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔اکبر کے زمانے میں راجا ٹوڈرمل[متوفی ۱۵۸۹ء] کے لڑکے گووردھن کی سرپرستی میں نارائن بھٹ نے ایک نیا مندر بنوایا۔

۸) شاہجہاں کی حکومت کے ساتویں سال بنارس اور اس کے آس پاس کے ۷۶ مندروں کو مسمار کیا گیا۔یہ عین ممکن ہے کہ وشوناتھ مندر بھی اسی زمانے میں مسمار کیا گیا ہواور اس کا کچھ حصہ محفوظ رہ گیا ہو۔مسجد کے پیچھے اس وقت موجودہ الگ دیوار ہندوفن تعمیر سے پوری طرح آراستہ ہے جو کسی طرح بھی ہندوستان کے قدیم زمانے کی نہیں ہے۔اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوؤں نے اکبر کے دور کے بنے ہوئے وشوناتھ مندر کو دوبارہ بنانے کی کوشش کی ہوگی جو شاہجہاں کے دور میں توڑ دیا گیا تھا اور اورنگ زیب سے یہ شکایت کی گئی ہوگی کہ ہندو نیا مندر بنارہے ہیں۔' مآثر عالمگیری' کا مصنف لکھتا ہے کہ ۱۵ر ربیع الآخر کو اورنگ زیب بادشاہ کو خبر کی گئی کہ سرکاری احکام کے مطابق بنارس کا وشوناتھ مندر توڑ دیا گیا ہے۔

۹) متوسط دور میں بہت سے ہندوؤں کو زبردستی یا ان کی مرضی سے مشرف بہ

اسلام کیا گیا اور انہیں دوبارہ پرانا مذہب اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد یہ طریقہ کار ختم ہوگیا۔ وِیر ونود کا بیان ہے کہ اکبر شہزادیوں کی شادیاں راجپوتوں کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

۱۰) اگر چہ راجپوت مسلمان لڑکیوں کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے ان لڑکیوں کو دوبارہ ہندو بنانا شروع کیا، جو دباؤ میں آکر مسلمان ہوگئی تھیں۔ جیسا کہ مصنف 'دبستان مذاہب' نے اس قسم کی تبدیلی مذہب کا ذکر اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کیا ہے۔

۱۱) ۸؍اپریل ۱۶۶۱ء کو اورنگ زیب کو معلوم ہوا کہ ٹھٹھا، ملتان اور خاص طور سے بنارس میں برہمن لوگ مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی کتابوں کی تعلیم دے رہے ہیں اور دور دور سے مسلم طالب علم اس علم کو سیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔ چنانچہ ریاستی گورنروں کو یہ حکم دے دیا گیا کہ کافروں کے اسکولوں اور مندروں کو تباہ کر دیں، انہوں نے مورتی پوجا اور اس قسم کی تعلیم کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ اسی دست وبرد میں وشوناتھ مندر بھی توڑ دیا گیا ہو۔

۱۲) مندروں کا گرایا جانا جہانگیر کے دور سے ہی شروع ہو چکا تھا، جو شاہجہاں کے دور میں بھی چلتا رہا۔ لیکن ایسے واقعات چھٹ پٹ ہوتے تھے، جس کے ذمہ دار خود علماء تھے۔ یہ حکومت کی پالیسی کے تحت نہیں کیا جاتا تھا۔ اس بات کے بھی ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ شاہجہاں کے زمانے کے آخری ایام میں حکومت کی پالیسی بے حد نرم ہوگئی تھی اور اس نرمی کے سبب اورنگزیب کی قیادت میں مخالفین کا ایک طبقہ ابھرا، اورنگ زیب جس بنیاد پر تخت سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا وہ بھی اسی نرم پالیسی ہی کا ردعمل تھی۔ اورنگ زیب کی غلطی یہ تھی کہ اس نے ردعمل کرنے والی طاقتوں کو اس وقت پوری چھوٹ دے رکھی تھی، جب کہ یہ ردعمل کی قوتیں انتشار کی حالت سے گزر رہی تھیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ اورنگ

زیب نے اگرچہ بہت سے مندروں کو تباہ کیا، لیکن یہ تباہ کاری جہانگیر اور شاہجہاں کی طرح اس کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وشوناتھ مندر سے تین فرلانگ دوری پر واقع جنگم باڑی مٹھ[1] کے وجود کی وضاحت کس طرح کی جاتی۔ اس کے قومی اقدام اور مذہبی سدھار معقول تھے، لیکن اس کی غلطی انہیں عملی جامہ پہنانے کے طریقۂ کار میں تھی۔

ہمارے فاضل دوست محترم ڈاکٹر بھٹناگر صاحب کا تبصرہ ختم ہو چکا۔ اس سلسلے میں مذکورہ بالا خط کشیدہ عبارت کے بارے میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ گمان اورنگ زیب کے بارے میں کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اس نے بہت سے مندروں کو تباہ کیا۔ جب کہ اس کا کوئی ثبوت قیامت تک کوئی مورخ نہیں دے سکتا۔ جس اورنگ زیب نے اس درجہ احتیاط سے کام لیا ہو کہ اس کے باپ شاہجہاں کے تعمیر کردہ مدرسہ 'ایوان شریعت' کے کھنڈر پر جو مندر زبردستی تعمیر کیا جا رہا تھا، بجائے منہدم کرنے کے یوں ہی چھوڑ دیا، اس سے یہ کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس نے مندروں کو تباہ کیا ہو؟

محترم ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ برہمن لوگ بنارس میں مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی کتابوں کی تعلیم دے رہے ہیں اور اسی کے ردعمل میں وشوناتھ مندر کے توڑے جانے کا خدشہ ظاہر کیا ہے یہ کسی حال میں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اورنگ زیب نے اسی گیان واپی کی پشت پر سنسکرت کی تعلیم کے لیے ایک ودیالیہ بھی تعمیر کرایا ہے، جو آج بھی اپنی سنگین اور عالیشان عمارت کے ساتھ قائم ہے۔

---

[1] گودولیہ سے مدنپورہ جاتے ہوئے کچھ ہی فاصلے پر بائیں جانب یہ مٹھ قائم ہے۔ اس کا انتظام و انصرام جنوبی ہند کی ایک کمیٹی کے ہاتھ میں ہے۔ اس مٹھ میں اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دور حکومت میں بہت ساری جائیدادیں اور جاگیریں وقف کی تھیں۔ اس مٹھ کی دوسری طرف بہت بڑا احاطہ تھا۔ یہ بھی مٹھ کی جائیداد تھی لیکن اب اس میں مارکیٹ بن گئی ہے۔ اس سے پہلے یہاں بوسیدہ دیواریں نظر آتی تھیں۔ کوئی دوکان بھی نہ تھی۔ بالکل سناٹا رہتا تھا۔ یہ مارکیٹ تقریباً ۱۹۶۰ء کے بعد تعمیر ہوئی ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ مدنپورہ کی انصاری برادری۔ از: شاد عباسی۔ ص ۳۶]

اورنگ زیب پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ مندروں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ پھر دکن میں ایلورا کے مندر کیسے باقی رہ گئے؟ جب کہ اورنگ زیب نے چھبیس سال وہاں گزارے۔ خود بنارس میں اورنگ زیب کے دور سے پہلے کے ہزاروں مندر موجود تھے اور اب تک موجود ہیں۔ اگر وشوناتھ جی کا مندر توڑا گیا ہوتا تو اس کے بھائی دارا شکوہ کا فرمان کیسے باقی رہتا؟ اور اس کے مہنتوں کی اولاد پوجا کی اشیاء پر کس طرح قابض رہتی؟ اور پھر وشوناتھ جی کے موجودہ مندر کے نوبت خانہ کا وجود کیوں کر ہوتا جو اورنگ زیب کے بیٹے شاہ عالم کے دور میں تعمیر ہوا۔ جب کہ شاہ عالم کی سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس وقت نواب علی ابراہیم خاں[1] حاکم شہر تھے اور اُنہی کی زیرِ نگرانی یہ تعمیر مکمل ہوئی۔ جیسا کہ نوبت خانہ پر لگے ہوئے اس کتبہ سے ظاہر ہے:

> ایں نوبت خانہ مهادیو بشیشور رابفرموده نواب عماد الدوله امیرالممالک گورنر جنرل وارن هسٹینگز بهادر جلاوت جنگ دام اقباله درسنه یک هزار دوصد هجری امین الدوله عزیز الممالک علی ابراهیم خان بهادر میر جنگ حاکم شهر به اهتمام مرزه نذر باقی بیگ خان تعمیر نمود که.....روزگار یاد گار شد ۱۸۴۲

موجودہ وشوناتھ جی کے مندر کی تعمیر شاہان مغلیہ کے ذوق کی عکاسی کر رہی ہے اور کیا عجب کہ جب نوبت خانہ اورنگ زیب کے بیٹے نے بنوایا تو اورنگ زیب ہی نے مندر بھی تعمیر کرایا ہو۔ البتہ باہری بارہ دری کی تعمیر بیجا بائی نے کرائی ہے جو جامع مسجد سے متصل ہے اور اس کے اندر 'گیان واپی' نام کی باؤلی۔ جیسا کہ دالان میں لگے ہوئے اس کتبہ سے ظاہر ہے:

---

[1] ان کا تعارف آئندہ صفحات میں آئے گا۔ ع ب نعمانی

دالان وفرش احاطه گیان واپی ودروازہ جنوبی از طرف سرکار میرسنت بیجا بائی صاحبه اهلیه مهاراجه عالی جاه دولت تیارشد بموجب حکم صاحبان عالی شان کمیٹی شهر بنارس صورت تعمیر پذیرفت.

اورنگ زیب نے مندروں کو نہ صرف توڑنے سے بچایا، بلکہ ان مندروں کے لیے جاگیریں اور وظائف بھی مقرر کیے اور بہت سے مندر خود بھی تعمیر کرائے۔

اس سلسلے میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ مسجد دھرہرہ پنچ گنگا گھاٹ کی دیوار سے لگی ہوئی سیتارام مندر کی دیوار ہے۔ وہاں ایک محضر نامہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوشائیں رام جیون جی نے اورنگ زیب کو لکھا تھا کہ سیتارام مندر کے ساتھ حکومت کے کار پرداز زیادتی کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ مزاحمت کر رہے ہیں۔ تو اس کے جواب میں اورنگ زیب نے ایک فرمان جاری کیا، جو اس خاندان میں محفوظ ہے۔ گوشائیں جی نے محضر نامہ میں لکھا ہے کہ:

چنانچه گوشائیں موصوف فرمان والا شان حضرت عالمگیر بادشاه درباب عدم مزاحمت مندر سیتا رام جی حاصل ساخته مندر موصوف رازا نهدام باز داشتند فرمان والا شان داشت.

ترجمہ:

چنانچہ گوشائیں موصوف نے حضرت عالمگیر بادشاہ کا فرمان حاصل کیا کہ مندر سیتارام جی کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی جائے اور مندر موصوف کو انہدام سے باز رکھا جائے، اور یہ فرمان والاشان موجود ہے۔

گوشائیں جی نے اس محضر نامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

ایں دعا گو درباب خصوصیت فرمان شاهی به یکے از

بزرگان خود که درحضور حضرت ظل سبحانی شاه عالم بادشاه غازی ملازم هستند، چنانچه فرمان والا شان بابت معافی هردو قلعه که پانصد هشتا دو نه دربدراع الٰهی وملحق بمندر سیتا رام جی است حاصل کرده فرستاد.

ترجمہ:

اس دعا گو نے فرمان شاہی کی خصوصیت کے بارے میں اپنے بزرگوں میں سے ایک بزرگ کو جو حضور ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ غازی کی خدمت میں ملازم ہیں، لکھا۔ چنانچہ انہوں نے پانچ سو نواسی [الٰہی گز سے] ہر دو قطعہ زمین کے بارے میں فرمان حاصل کر کے بھیجا۔ یہ دونوں قطعات زمین سیتا رام جی کے مندر کے متصل ہیں۔

اس محضر نامہ پر قاضی نقی علی خاں قاضی شریعت عدالت بنارس نے رجسٹری کی مہر ثبت کی ہے جس پر ۱۲۱۷ھ درج ہے۔

سیتا رام جی کے مذکورہ مندر کے علاوہ بنارس میں بہت سے ایسے مندر ہیں جہاں آج بھی مغل بادشاہوں ہمایوں، اکبر جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور شاہ عالم کے کثرت سے ایسے فرامین موجود ہیں، جن میں بے شمار جاگیریں مندروں کو عطا کی گئی ہیں، جن سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جن بادشاہوں کو مندر شکن اور بت شکن کہا جاتا ہے وہی دراصل ان مندروں کے پاسبان اور محافظ ہیں اور آج بھی انہی کی جاگیروں سے ان تمام مندروں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں اب تک اورنگ زیب کے جتنے فرامین کا سراغ لگ سکا ہے وہ جنگم باڑی مٹھ محلّہ جنگم باڑی متصل گودولیہ، کالی مٹھ سورج کنڈ، مندر گورکھ ناتھ میدا گن اور مندر اوگھڑ ناتھ کبیر چورا، مندر مادھو راج، مندر بابا بھرتری قلعہ چنار، مندر بالا جی چتر کوٹ قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب کی تیاری کے وقت تک جتنے فرامین دستیاب ہو سکے وہ درج کیے جا رہے ہیں اور جنگم باڑی کے بہت سے فرامین جو کلا بھون بنارس ہندو

یونیوسٹی تک پہنچ چکے ہیں، اب تک حاصل نہ ہوسکے۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں حاصل ہونے کے بعد وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہوں گے۔

فرمان بنام بھگونت گوشائیں:

محمد اورنگ زیب شاہ بہادر غازی

فرمان والا شان بمهر وطغرا حضرت ظل سبحانی از قرار بتاریخ ۱۷ شهر ربیع الثانیه ۱۰۹۱ھ آنکه دریں وقت میمنت اقران فرامین والاشان واجب الاذعان صادر شد که مهاراجه دهراج راجه رام سنگھ بعرض اشرف اقدس ارفع اعلیٰ ملتمس گردید که یکمنزل حویلی سنگیں درمحله مادهورای واقع بلده محمد آباد بنارس سمت جنوب بالیں گنگ معه زمین ملحق است وحویلی مذکور ازآباواجداد بنابر سکونت بهگونت گشائیں که مرشد خود اند بنانموده بخشید بعض مردمان مساکنه ومواطنه آنجا از گشائیں مذکور اخذ مزاحم ومتعرض می شوند لهٰذا حکم والا صادرمی شود که بعداز واقعه ایں منشور لامع النور مقرر کندکه متصد یان مهمات حال واستقبال برحالات گشائیں ممدد معاون بوده باشند که من بعد احدی بوجوه بیحساب تشویش حال اینان نشوند که گشائیں بجمعیت خاطر بدعاء بقاء دولت خدا دادا بمدت ازل بنیاد قیام نماید دریں باب تاکید دانند. تحریراً فی التاریخ صدر ومهر صدر وسنه صدر.

ترجمہ:

فرمان والاشان حضرت ظل سبحانی کی مہر اور طغرا کے ساتھ بتاریخ ۱۷ ماہ ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ یہ کہ اس مبارک وقت میں فرمان والاشان جس پر

یقین واجب ہے صادر ہوا کہ مہاراج دھراج راجارام سنگھ نے خدمت اقدس میں التماس کی کہ ایک منزلہ سنگین حویلی جو محلّہ مادھورائے واقع شہر محمد آباد بنارس میں جنوب کی طرف دریائے گنگا کے کنارے ایک زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔اور مذکورہ حویلی باپ دادوں سے بھگونت گوشائیں کے قیام کے لیے جو میرے مرشد ہیں تعمیر کرا کے بخش دیا ہے اور بعض لوگ جو وہاں کہ رہنے والے ہیں، گوشائیں مذکور سے اس کو لینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مزاحمت کر رہے ہیں۔لہٰذا حکم والا صادر ہوتا ہے کہ اس فرمان کے صادر ہونے کے بعد ہی یہ مقرر کیا گیا کہ زمانہ موجودہ اور آئندہ کے تمام شاہی کارپرداز گوشائیں مذکور کے حالات پر مددگار اور معاون رہیں تا کہ ان کے بعد کوئی شخص کسی طرح بھی ان کی تشویش اور پریشانی کا سبب نہ بنے تا کہ گوشائیں موصوف پورے اطمینان وسکون کے ساتھ ہماری اس خداداد حکومت کی ہمیشہ کی بقاء کے لیے دعا میں مصروف رہیں اور اس بارے میں تاکید جانیں۔مذکورہ تاریخ اور سنہ میں یہ فرمان لکھا گیا۔

اورنگ زیب کے دو فرمان مسٹر ظہیر فاروقی نے بھی اپنی کتاب: AURANGZEB AND HIS TIMES میں درج کیے ہیں جن میں پہلا فرمان ۱۰۹۱ھ کا ہے اور دوسرا ۱۰۹۸ھ کا۔

ان دونوں میں اورنگ زیب نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کی ہے کہ وہ بنارس کے مادھوراؤ مندر کے لیے گوشائیں کے معاملے میں دخل نہ دیں اور جو زمین مندر کی تعمیر کے لیے دی گئی ہے اس میں مداخلت نہ کریں۔اور ایک تیسرے فرمان میں جو ۱۰۶۹ھ کا ہے، یہ تحریر ہے کہ بنارس کا کوئی برہمن اپنے مذہب کے فرائض کی ادائیگی میں تنگ نہ کیا جائے اور نہ پرانا مندر مسمار کیا جائے۔اب کچھ مزید فرامین ملاحظہ ہوں:
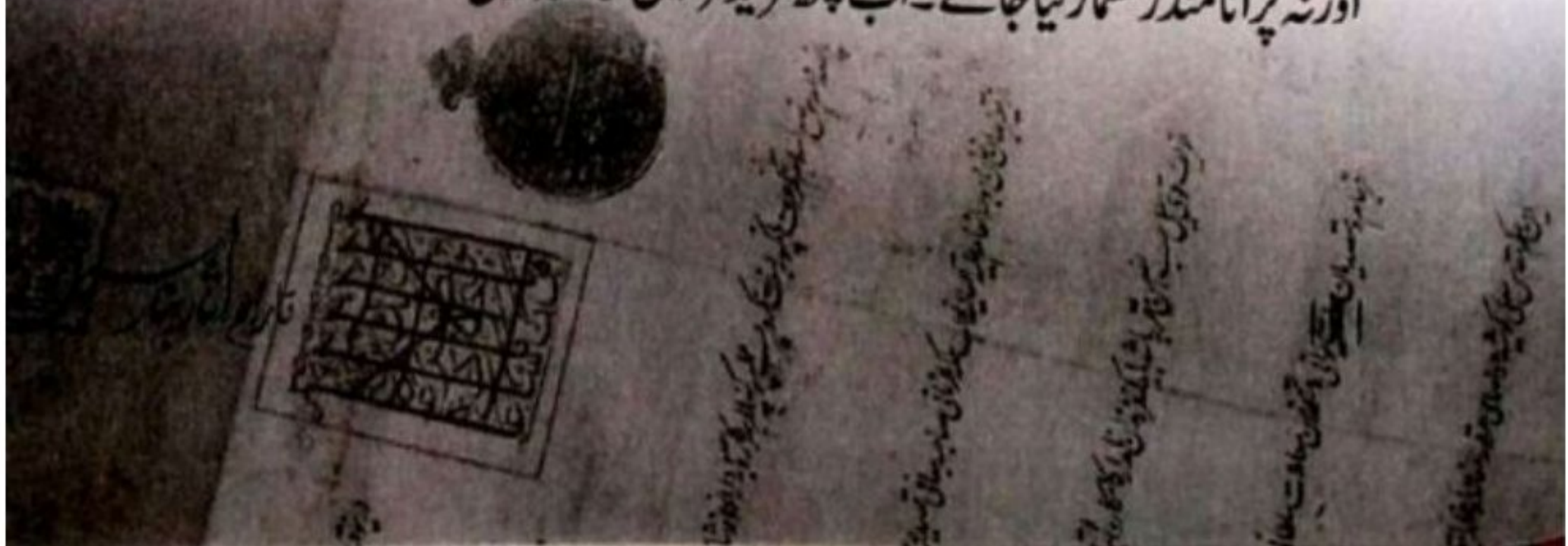
فرمان اورنگ زیب بنام گشائیں رام جیون جی:

امارت وسیادت مرتبت،حشمت وشوکت منزلت، فدوی خاص راسخ البرهان زبده امرای عظام، عمده قوانین، عالی مکان،لائق العنایت والاحسان بشمول جلائل عواطف، معریٰ ازبیان بوده درحفظ بعافیت باشددریں ولااز پیش گاه خلافت وجهانبانی یک قطعه زمین افتاده بیت المال موافق دو صددرع بدرع الٰهی واقعه بلده محمد آباد بنارس پیش دروازه حویلی راجه مان سنگھ که حویلی را راجه مذکور به گوسائیں نتیا نند منتوفی داده نظر باستحقاق آن زمین رابقای آرامگاه گشائیں رام جیون نبیره متوفی مذکور مرحمت فرمو دیم یادی که آن امارت مرتبت بکار پردازان بلده بنارس بتاکید می نگار ندکه آن زمین را از گشائیں مرقوم تصور ساخته دیگری راسهیم وشریک ندانند دریں باب تاکید مزید دانند.

فرمان شاه عالم برائے گشائیں رام جیون:

متصد یان مهمات حال واستقبال دارالضرب بلده بنارس بدانند مبلغ دو روپیه یومیه بلاصرف وقصور ازآ مدنی والضرب بلده مذکور باسم گسائیں رام جیون مقرر است تاحال لهذا نگارش گردد که بدیں رسم وجه مسطوره را هرروز بلاناغه بدستور سابق از تحویل سرکار برائے مشارالیه باشد.مرقوم یازد هم ربیع الاول ۱۱۸۲ھ

فرمان شاہ عالم بنام برہم مورت گوشائیں رام پرشاد:

۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۴ء

عزیز القدر دلدار خاں وبندھولال بعافیت باشندچوں موازی ہشت آنہ یومیہ پختہ از غرہ شہر ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ بنام برہم مورت گوشائیں رام پرشاد دروجہ مدد معاش مقرر نمودہ شدکہ یومیہ مذکورہ از تحویل خزانہ سرکار ہمیشہ وبلاناغہ ماہ بماہ بہ برہم مورت مشارالیہ می دادہ باشند کہ وجہ معیشت خود نمودہ بدعای دولت اشتغال دادند وہر سال سند مجدد بطلبیدند دریں باب تاکید تمام دانند. تحریر فی التاریخ غرہ ذی الحجہ ۲۲ جلوس والا

ترجمہ:

آٹھ آنہ یومیہ پختہ ماہ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ سے برہم مورت گوشائیں رام پرشاد کے نام سے مدد معاش کی مد میں مقرر کیا گیا کہ مذکورہ یومیہ خزانہ سرکاری کی تحویل سے ہمیشہ وبلاناغہ ہر ماہ برہم مورت کے لیے جن کی طرف اشارہ کیا گیا، دیا جاتا رہے گا کہ وہ اپنے خرچ میں لاکر سلطنت کی دعا میں مصروف رہیں اور ہر سال اس سند شاہی کی تجدید (Renew) کرالیا

کریں اوراس بارے میں مکمل تاکید جانیں۔
یہ فرمان آج بھی گوشائیں رام پرشاد کی اولاد کے پاس موجود ہے۔

فرمان شاہ عالم بنام سوامی نتیانند:

هوالغنی

متصدیان حال واستقبال محمد آباد مضاف به صوبه اله آباد بدانند که بموجب التماس سوامی نتیانند ورام سندر زناردار ظهو رپیوست که راقع بسبب کثرت عیال اوقات بعسرت می گزارندوهیچ وجه معیشت ندارند لهٰذا التماس کرد که محصول آن پانصد روپیه باسم نتیانند مومی الیه معاف نموده شدباید که یوماً فیوماًمحصول مزبور بمومی الیها معاف دانسته بوجه من الوجوه بعلت اخذ مزاحم ومتعرض نشوند که وجه آن راصرف مایحتاج نموده بدعای دولت ابدمدت مواظبت می نموده باشد،دریں باب تاکیدبدانند.

بتاریخ هشتم ماه صفر ۷ جلوس والا.

گورنر جنرل بہادر جلاوت جنگ

متصد یان مهمات حال واستقبال دارالضرب بلده بنارس چون مبلغ دو روپیه روزینه بلاحرف وقصور از آمدنی دارالضرب بلده مذکور باسم گوشائیں رام جیون بموجب پروانه جات نواب وزیر المما لک نواب صفدر جنگ بهادر ونواب شجاع الدوله بهادر مقرر است و همیشه یافته آمده اندمال بموجب حکم نواب عمادالدوله دام اقباله بحال وبر قرار داشته ونیز دریں والا از تاریخ دوازدهم ربیع الثانی سنه یکهزار دوصد بموجب اسناد

قدیم بدستور سابق بحال نمود شد لهٰذا نگارش می رود که وجه مسطوره راهر روز بلاناغه بدستور ازمحال مذکوربمشارالیه می داده باشند وهر سال سنه مجدد بطلبند ودریں باب تاکید و قدغن دانسته حسب المسطور بعمل آرند .مرقوم دوازده ربیع الثانی ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۲ ماه فروری ۱۷۸٦ء.

فرمان بنام گوشائیں جیون رام:

سند بمهر وقبض نواب وزیر الملک نواب شجاع الدوله بهادر مرقوم سابق در ۱۱۸۸ھ متصد یان مهمات حال و استقبال دارالضرب بلده بنارس بدانندمبلغ دوروپیه یومیه بلاصرف وقصور از آمدنی دارالضرب بلده مذکور باسم گوشائیں جیون رام مقرر نموده شد می باید مبلغ مسطور رااز محل مذکور هر روز بلاناغه می داده باشند وهر سال سند مجدد بطلبند دریں باب تاکید دانند.

پروانہ شاہ عالم بنام گوشائیں جیون جی:

بمهر مرزا کلب علی خان بهادر

شرح آن که مرزا صاحب مهربان مرزا حسن علی بیگ حفظه‌الله تعالیٰ موازی پنجاه بیگهه پخته آراضی درموضع دهور هره باسم گوشائیں جیون جی بطریق مدد معاش از ۱۱۹٤فصلی مقرر نموده باید که آراضی مذکور راچک بسته حواله نمایند که صرف معشیت خود نموده بدعای دولت مؤظف ومشغول باشند."

مرقوم هفتم ماه ربیع الاول ۱۱۹٤ فصلی

فرمان شاہ عالم برائے رام پرشاد:

۲۲ جلوس والا شان پروانہ بمهر رفعت وعالی مرتبت لاله صاحب مهربان لاله آتمارام جیو سلمه الله تعالیٰ مبلغ هشت آنه یومیه بوجه باسم رام پرشاد برادر رام جیون گوشائیں جیو برآمدن مال پرگنه حویلی جون پور مقرر است و همیشه یافته آمده اندمال نیز بموجب پروانه ازابتدا تاحال شهر شوال ۲۳ھ مطابق ۱۸۹۱ فصلی موافق معمول بحال برقرار داشته شد لهٰذامرقوم می شود که یومیه مرقوم رابلا ناغه به گوشائیں مشارالیه می داده باشند واز قبض الوصول گرفته باشند تا حال بموجب این پروانه درحساب پرگنه حویلی جون پور مجراو محسوب خواهش شده.

بتحریر فی التاریخ مذکور است.

فرمان شاہ عالم برائے رام پرشاد:

متصدیان مهمات حال واستقبال پرگنه حویلی سرکار جون پور ومضاف بصونه اله آباد بدانند مبلغ هشت آنه یومیه بلاحرف سیوا مال سرکار از پر گنه مذکور باسم گشائیں رام پرشاد بر اوگسارام جیون از همیشه مقرر است دریں والا نیز از ابتدای تاریخ ۱۱شوال ۱۱۸۹ فصلی موفق معمول بحال داشته شد باید که وجه مذکور از محال مسطور بمشار الیه می داده باشد که حرف معیشت خود نموده بدعای دولت مؤظف ومشغول باشد دریں باب تاکید شدید دانند.

مرقوم شهر ربیع الاول ۲٤ جلوس والا.

فرمان شاہ عالم برائے رام پرشاد:

متصدیان مہمات حال واستقبال پرگنہ حویلی سرکار جون پور مضاف بصوبہ الہ آباد بدانند. چون مبلغ یک روپیہ یومیہ رام پرشاد گشائیں برادر گشائیں رام جیون جی از پرگنہ مذکور بموجب اسناد حکام پیش مقرر شدہ است، منجملہ آن ہشت آنہ سیوای مال سرکار وہشت آنہ ازمال سرکار کہ... پرگنہ مجرامی شود وہموارہ گشائیں موصوف یافتہ آمدہ اند. دریں والا نظر باستحقاق گشائیں مشارالیہ نمودہ یومیہ مسطور موافق معمول باسم مشارالیہ بحال وبرقرار داشتہ باشد باید کہ وجہ مرقومہ از محال مسطور بمومی الیہ می دادہ باشد وبوجہ من الوجوہ مقروض نشودند کہ گسائیں مرقوم الصدر حرف مایحتاج خود نمودہ بہ یاد الٰہی ابدمدت و مؤظف مشغول باشند، وہر سال سنہ مجدد بطلبند دریں باب تاکید مزید دانند.

مرقوم بتاریخ سویم جمادی الآخر ۱۱۹۴ فصلی.

فرمان شاہ عالم برائے جیون رام:

متصدیان مہمات حال واستقبال دارالضرب بلدہ بنارس بدانند کہ چون مبلغ دوروپیہ بلاحرف وقصور از آمدنی دارالضرب بلدہ مذکور باسم گوشائیں جیون رام بموجب پروانجات نواب وزیر الملک نواب صفدر جنگ بہادر ونواب شجاع الدولہ بہادر مقرر است وہمیشہ یافتہ اند مال بموجب حکم نواب عمادالد ولہ دام اقبالہ بحال وبرقرار داشتہ، لہٰذا نگارش می رود کہ وجہ مسطورہ راہر روز بلاناغہ بدستور از محال مذکور

بمشار الیه داده باشند و هر سال سنه مجدد بطلبند، درین باب تاکید و قدغن داشته حسب مسطور بعمل آرند.
تحریر بتاریخ چهارم شهر ذی الحجه ۲۳ جلوس والا مطابق بست و یکم ماه نومبر ۱۷۸۱ء تسلیم شده.

بدرالدین خاں جو اورنگ زیب کے زمانے میں قلعہ چنار کے قلعدار مقرر تھے، انہوں نے بھی ایک پروانہ بنام بھرتری جاری کیا۔ یہ دونوں فرامین قلعہ چنار کے اندر مندر بھرتری ناتھ جی میں محفوظ ہیں۔ مذکورہ پروانہ کی نقل درج ذیل ہے:

پروانه بمهر شهادت وعالی مرتبت محمد بدرالدین خان قلعه دارپیش کار چنار متصدیان مهمات حال واستقبال چبوتره کوتوالی بلده چنار بدانند که موازی یک تنکه یومیه عالمگیری موافق معمول دروجه فقیران بهر تری مقرر نموده شدباید که دروجه کو راز قبض الوصول می گرفته باشند حال بموجب ایں پروانه حسب الارشادبعمل آرند. بتاریخ شانز دهم شعبان المعظم ۱۰۸۲ھ

اورنگ زیب کا ایک فرمان قلعہ چنار کے مندر میں بھرتری ناتھ جی کے نام سے ہے جو درج ذیل ہے:

فرمان اورنگ زیب بنام تلسی جی برائے خدمت بھرتری ناتھ جی:

متصدیان حال واستقبال سرکار ایں جانب بدانند که موازی یک تنکه مرادی کهنه دروجه یومیه تلسی جیورابوجه معاش مقرر نموده شدمی باید که موازی مذکور را من ابتدای پانزدهم شعبان المعظم ۱۰۸۲ھ روز بروز بمشارالیه می رسانیده باشند که صر مایحتاج خود نموده بدعاگوئی دوام دولت بندگان عزت خلافت

منزلت ظل سبحانی اشتغال نموده باشند درین باب قدغن دانسته از فرموده انحراف نکنند.

تحریر چهار دهم شعبان المعظم ۱۰۸۲ھ

'جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی' جلد پنجم حصہ چہارم اپریل ۱۹۵۸ء میں عالمگیر کے دس فرامین کا ذکر ہے۔ جس سے دو پروانے درج ذیل ہیں:

''ایک موقع پر بنارس کے جنگم باڑی مٹھ کی پانچ حویلیاں ضبط کر لی گئیں اور اس کے مالک سے پانچ سو روپے لے کر شاہی خزانے میں داخل کر دیے گئے۔ مٹھ کا سنیاسی عالمگیر کے پاس حاضر ہوا اور اس نے استغاثہ دائر کیا۔ بادشاہ نے یہ معاملہ قاضی القضاۃ کے پاس بھیجا۔ قاضی القضاۃ کا پروانہ لے کر مستغیث مقامی قاضی کے پاس آیا، جس نے یہ فیصلہ دیا کہ وہ رقم واپس کر دی جائے اور مٹھ کی مذکورہ عمارتوں پر سنیاسی کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے۔''

مہر شاہ عالمگیر:

به مهر رفعت اقبال پناه تمور واجلال دستگاه مرزا محمد امین بیگ فوجدار رفعت ایں پناه بنیاد بیگ امین.

نیابت ونجابت نباه مبارک حسین واقعه نمگار از قرار تاریخ ٥ جمادی الاولیٰ ۱۰۸٥ھ شرح آنکه چون ار جن مل وجماعت جنگماں ساکنان بلده محمد آباد عرف بنارس به حضور مقدس مشقی رفته پروانه حسب الحکم والا به مهر اقبال و افافت پناه شریعت وکمالات دستگاه اقضی القضاة قاضی عبدالوهاب آوردند بایں مضمون که متصدیان مهمات بلده بنارس محمد آباد انند که چون دریں ولا ارجن مل وجماعت جنگماں بدرگاه خلائق پناه آمد بعد ساعت اسناد های حواشی بساط خلافت وجهاں

داری بعرض اشرف اقدس رسانند که رافع پنج محل حویلی بریکی مغلوبته الحدود ملک خود درجنگم باڑی دارد وقابض ومتصرف است.

دریں ولا متصدیان بیت المال آنجا بگفته معاندان ضبط نموده کرایه آن منازل رابجبر رافع می گیرند چنانچه مبلغ پانصد (۵۰۰) از رافع گرفته اند واین معنی باعث سر گردانی وپریشانی رافع گردید.

حکم والا شرف صدور یافت که نزداین خادم شرع بغرسته لہٰذا از حسب الحکم الاعلیٰ نگارش می یابد که هرشه از وجه کرایه از رافع گرفته باشند واپس بدهند وحویلی های مذکور رابدستور سابق واگزارند وهیچ وجه متعرض ومزاحم حال رافع نشوند که بجای ومقام خود آباد بوده باشند نبا بران مابعد هر کدام که به مضمون پروانه مطلع شد مقرر نمودیم که متصدیان بیت المال مطابق پروانه مذکور عمل نموده مبلغ پانصد روپیه بابت کرایه حویلی های مذکور که درسرکار ضبط شد به ارجن مل مذکور دهند ومزاحم حویلی های مذکور من بعدهیچ وجه نشوند که بجای خود آباد بوده بدعای دوام دولت ابد هیوند اشتغال داشته باشند.

تحریر فی التاریخ صدر مهرنورالله مفتی مهرشاه عالمگیر

اسی مضمون کا دوسرا پروانہ تبرک حسین کو بھیجا گیا، جس پر تبرک حسین کی مہر لگی ہوئی ہے۔

عہد عالمگیر میں مندروں کا احترام:

اب تک جتنے فرامین نقل کیے جا چکے ہیں وہ سب اورنگ زیب عالمگیر ہی کے

وقت میں جاری ہوئے اور اس کے بعد شاہ عالم، پھر انگریزوں کے آخری دور حکومت تک برابر یہ وظائف اور روزینے جاری رہے اور ان پر مکمل عمل درآمد ہوتا رہا۔ البتہ جو جاگیریں اور زمینیں دی گئی ہیں ان کی آمدنی اب تک مندروں پر قائم ہے اور مندرجہ بالا فرامین کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا انتہائی آسان ہوگیا ہے کہ اورنگ زیب نے نہ صرف بنارس کے مندروں کو توڑنے سے بچایا بلکہ ان کو بے شمار جاگیریں عطا کیں اور اس سلسلے میں بڑے سخت احکام جاری کیے۔

اس سلسلے میں ایک غیر مسلم مضمون نگار راجندر تیواری ساکن باندہ نے ہندی اخبار 'جن ستا'[1] کی ۹ جنوری ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"

اورنگ زیب کا دوسرا روپ:

تاریخ میں اورنگ زیب کو ایک کٹر مسلمان اور ہندوؤں پر جزیہ لگانے والا اور مذہب کا دشمن بتایا گیا ہے۔ مگر چترکوٹ کا بالاجی مندر اورنگ زیب کی مذکورہ برائیوں سے مختلف ہے۔ اس مندر کے دستاویزوں میں عربی رسم الخط میں ایک دستاویز آج بھی موجود ہے، جس کے مطابق اس مندر کی تعمیر بھی اورنگ زیب ہی نے کرائی ہے اور اس کے رکھ رکھاؤ کے لیے ساڑھے تین سو بیگھہ زمین اور کئی گاؤں بھی دیے ہیں۔ دستاویز میں لکھا ہے کہ بادشاہ اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت کے ۳۵ ویں سال رمضان کے مبارک مہینے کے ۱۹ ویں دن یہ فرمان جاری کیا۔

"

یہ فرمان میں نے خود نہیں دیکھا، لیکن جیسا کہ راجندر تیواری نے لکھا

---

[1] یہ انڈین ایکسپریس گروپ کا ہندی روزنامہ ہے، جس کا اجراء ۱۹/۱۱/۱۹۸۳ء کو ہوا۔ اس وقت دہلی، کلکتہ، لکھنو اور چنڈی گڈھ سے بیک وقت کثیر تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

ہے، اس کی روشنی میں یہ فیصلہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ جس عالمگیر کے قلم سے یہ فرمان جاری ہوا اس کے متعلق یہ باور کرانا کتنا بڑا ظلم ہے کہ اس نے تمام ناظموں کو علی الاطلاق حکم دے دیا کہ سب مندر ڈھا دیے جائیں اور ہندوؤں کے تمام مدرسے بند کر دیے جائیں۔ یہ فرمان 'مرقع بنارس' میں نقل کیا گیا ہے جو اس طرح ہے:

> مورخہ نوز دھم رمضان ۱۱۰۳ھ ۳۵ جلوس والا موازی ھفت مواضعات دروجہ نانکار درپر گنہ سرکار کالنجر حال ضلع باندہ صوبہ الہ آباد باسم بالک داس مھنت مندر ھای چتر کوٹ درمصارف بوجہ بھوگ ٹھاکر بالا جی بہ تفصیل ذیل مقرر ومسلم باشد. ملازم و کروریان انحراف نہ نمودند."

[مرقع بنارس۔ص ۱۶۵]

ان فرمانوں کے علاوہ عالمگیر کے بہت سے فرمان اب بھی مندروں اور ہندوؤں کی جاگیروں کے بارے میں ایسے ہیں جن سے ان کی شفقت اور ہندوؤں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۶۰۷ء م ۱۰۱۶ھ میں جنگم گوشائیں کو بنارس میں ایک جائداد دی اور اس کے خاندان میں اب تک عالمگیر کا شاہی فرمان موجود ہے۔

اس فرمان کے علاوہ اس کے نام کے فرامین تغلق کے عہد سے لے کر شاہجہاں کے عہد تک موجود ہیں اور ان فرامین میں اس کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئی ہیں۔ بنارس میں رام مندر اور دھرہرہ گھاٹ پر بھی عالمگیر نے جاگیریں بخشی ہیں۔ وہاں بھی یہ فرامین موجود ہیں۔

ایک بار کسی مسلمان نے جنگم کے مکانات پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے عدالت میں استغاثہ کیا، قاضی نے جنگم کے حق میں فیصلہ کیا۔ اسد خاں جو عالمگیر کے امراء میں سے تھا، اس کے دربار سے بھی جنگم کو ڈگری ملی۔ یہ دونوں اصلی فیصلے آج بھی جنگم کے خاندان میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک فیصلہ کی نقل درج ذیل ہے:

"حویلی محمد آباد موسومہ بنارس صوبہ الہ آباد کے حکامان کو یہ معلوم ہو کہ
ارجن مل اور جنگم ساکن بنارس بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے اور شکایت
کی کہ نذر بیگ ساکن بنارس نے بنارس میں واقع ۵ حویلیوں پر زبردستی
قبضہ کرلیا ہے لہٰذا اگر یہ واقعہ صحیح ثابت ہو اور شکایت کنندہ کا فعل صحیح ثابت
ہو تو نذر بیگ کو مذکورہ حویلیوں میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے
تاکہ مستقبل میں پھر کوئی جنگم فریادرسی نہ کرے۔"
۱۱رشعبان ۱۳جلوس ۱۶۷۲ء

الہ آباد ہائی کورٹ میں جنگم مٹھ کے جتنے مقدمات چلے، ان میں شاہی فرامین پیش کیے گئے اور اپیل ۵۸/۱۹۳۴ میں پیش ہوئی۔ ان کے جتنے فیصلے انگریز ججوں نے کیے، سب مٹھ میں موجود ہیں جو کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔

ان فیصلوں میں جنگم کے ساتھ جس ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوؤں کے ساتھ کتنا اچھا برتاؤ ہوتا تھا۔ اسد خاں کے مذکورہ بالا فیصلے میں عمال کو تاکید ہے کہ آئندہ مستغیث کو کبھی اس قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا جائے۔

علاوہ ازیں بہت سے ایسے فرامین ہیں جو بنارس کے مندروں میں موجود ہیں جو 'ندوۃ العلماء' کے اجلاس منعقدہ ۱۴/اپریل ۱۹۰۶ء ٹاؤن ہال بنارس کی علمی نمائش گاہ میں لگائے گئے تھے۔ ان فرامین سے مسلم سلاطین کے تعصب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ یہ فرامین اکثر مدد معاش یا کارہائے خیر کے متعلق ہوتے تھے جن میں ہندو مسلمان برابر کے شریک ہیں۔

ہمایوں سے لے کر عالمگیر تک کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا جس نے ہندوؤں کو جاگیریں اور زمینیں نہ دی ہوں اور رواداری کا سلوک نہ کیا ہو۔ ان فرامین کا اکثر و بیشتر حصہ آج بھی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک واقعہ نگار اور پرچہ نویس موجود تھے، جن کا اہم

فریضہ یہ ہوتا تھا کہ سلطنت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں کہیں بھی کوئی شخص علم وفن کی خدمت میں مصروف ہوتا تھا، فوراً پرچہ نویس بادشاہ کو اطلاع دیتا تھا اور وہاں سے جاگیریں، گاؤں یا کوئی زمین عطا کردی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ بنگال سے لے کر کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ آج تار اور ٹیلی فون کے دور میں بھی یہ انتظامات تقریباً ناممکن ہیں۔

جہانگیر نے ضمنی طور پر اپنی کتاب 'تزک جہانگیری' میں ایک سال کے عطیات کا ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک سال میں تقریباً ایک لاکھ بیگھہ زمین اس قسم کے مصارف خیر میں عطا کی گئیں۔

لیکن یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ عالمگیر اس قسم کی فیاضیوں میں اپنے باپ شاہجہاں اور دادا جہانگیر، پردادا اکبر سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ عالمگیر کے اس تعلق سے جتنے فرامین ہیں اتنے کسی کے بھی نہیں ہیں۔

سر جادوناتھ سرکار[1] نے اپنی مغل تاریخ میں اورنگ زیب کے بہت سے ایسے فرامین کو درج کر دیا ہے جو مندروں کے لیے زمینوں اور جاگیروں کے سلسلے میں ہیں۔

اس سلسلے میں پروفیسر بشمبھر ناتھ پانڈے[2] سابق میئر الہ آباد، وموجودہ گورنر

---

[1] آپ کا تفصیلی تعارف پیچھے صفحہ۔۔ پر گزر چکا ہے۔ ع ب نعمانی

[2] آپ مشہور مجاہد آزادی، حقیقت پسند اور سیکولر مزاج گاندھیائی لیڈر تھے۔ ۲۳/۱۲/۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے آپ کانگریس سے وابستہ تھے اور ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۳ء تک یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر کے منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک ریاست اڑیسہ کے گورنر رہے۔ الہ آباد میں میئر کے منصب پر بھی رہے۔ میئر رہنے کے دوران آپ کے پاس کچھ معاملات ایسے آئے کہ آپ کو اورنگ زیب کے خلاف پھیلائی گئی بہت ساری غلط فہمیوں کا علم ہوا۔ جیسے جیسے آپ نے اس کی تہہ میں جانا شروع کیا تمام حقائق کا انکشاف ہوتا گیا۔ پھر وہیں سے آپ نے اورنگ زیب کے خلاف پھیلائی جارہی غلط فہمیوں کا قلع قمع کرنا شروع کیا اور اس موضوع پر متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں 'ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، جس کے مطالعہ سے آپ کی سیکولر سوچ اور اورنگ زیب کے تئیں صاف شفاف ذہنیت کی اچھی طرح عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی اور کتابیں بھی منظر عام پر آئیں، جن میں ایک کتاب 'اسلام اور انڈین کلچر' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یکم جون ۱۹۹۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

ریاست اڑیسہ کی ایک تقریر جوراجیہ سبھا کی کاروائی میں شائع ہوئی ہے، قابل ذکر ہے۔
اس میں انہوں نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ:

''۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء کے درمیان جب میں الہ آباد میونسپلٹی کا چیئر مین تھا تو میرے سامنے داخل خارج کا ایک معاملہ پیش ہوا۔ یہ معاملہ سمیشور راؤ مہادیو مندر کے نام وقف شدہ ایک جائداد کا تھا۔ مندر کے مہنت کی وفات کے بعد جائداد کے دو دعوے دار کھڑے ہو گئے۔ ایک نے کچھ دستاویز پیش کیے جو ان کے خاندان میں بہت دنوں سے چلے آرہے تھے۔ یہ دستاویز شہنشاہ اورنگ زیب کے فرمان تھے۔ اورنگ زیب نے اس مندر کو ایک جاگیر اور کچھ نقدی عطا کی تھی میں ان دستاویزات کو دیکھ کر الجھن میں پڑ گیا اور سمجھا کہ یہ جعلی ہیں، مجھے حیرت تھی کہ جو اورنگ زیب مندروں کو توڑنے کے لیے مشہور ہے، وہ اس مندر کو جاگیر کیسے بخشے گا؟ اور لکھے گا کہ اس جاگیر سے دیوتا کی پوجا اور بھوگ لگایا جائے؟ لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے میں نے بہتر سمجھا کہ ڈاکٹر سرتیج بہادر سنگھ سپرو سے مشورہ لوں، جو فارسی وعربی کے بڑے عالم تھے۔ میں نے یہ کاغذات ان کے سامنے رکھ کر مشورے کی درخواست کی۔ دستاویزات کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اورنگزیب کے یہ فرامین بالکل اصل ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے منشی سے بنارس کے جنگم باڑی شیوا مندر کے کیس کی فائل منگوائی جس کی کئی اپیلیں الہ آباد ہائی کورٹ میں گزشتہ پندرہ سال سے زیر سماعت تھیں۔ جنگم باڑی شیوا مندر کے پاس مندر کو جاگیر عطا کرنے کے سلسلے میں اورنگ زیب کے کئی دوسرے فرامین بھی تھے۔ اورنگ کی یہ نئی شبیہ میرے سامنے آئی تو میں بہت متعجب ہوا۔ ڈاکٹر سپرو صاحب کی ایماء پر میں نے کئی اہم منادر کے مہنتوں کو خطوط لکھے کہ اگر ان کے پاس ان کے مندروں کو جاگیر عطا کرنے کے سلسلے میں اورنگزیب کے کوئی فرامین ہوں تو مجھے ان کی نقل فراہم کرائی جائے۔ مجھ پر اس وقت حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب بڑے مندروں میں جیسے مہا کالیشور مندر [اجین] بالا جی

مندر[چتر کوٹ] امانند مندر[گوہاٹی] جین مندر[شر نجیا] اور دوسرے کئی منادر و گرودوارے جو شمالی ہند میں بکھرے ہوئے ہیں ان کی طرف سے اورنگ زیب کے فرامین کی نقول موصول ہوئیں۔ یہ فرامین ۱۰۶۵ ھ سے ۱۰۹۱ھ کے درمیان جاری کیے گئے تھے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہندوؤں اور ان کے مندروں کے تئیں جہاں اورنگ زیب کی سخاوت ظاہر ہوتی ہے، وہیں یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ مؤرخین نے اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ محض تعصب کی بنا پر تھا، اور یہ تصویر کا صرف ایک رخ تھا۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جہاں مندر جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی مناسب تحقیقات کی جائیں تو اور بھی ایسی مثالیں سامنے آئیں گی جو اس بات کا ثبوت ہوں گی کہ غیر مسلموں کے تئیں اورنگ زیب کا طرز عمل مخیّرانہ تھا۔"

آگے چل کر کہتے ہیں:

"اورنگ زیب کے فرامین کی تحقیقات کے دوران میرا سابقہ جناب گیان چند اور ڈاکٹر پی، ایل گپتا سے بھی پڑا جو پٹنہ میوزیم کے سابق منتظم تھے، اور جو اورنگ زیب پر قابل قدر تاریخی اہمیت کی حامل تحقیق کر رہے تھے، مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حق کے متلاشی کچھ ایسے محقق بھی ہیں جو اس بات کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اورنگ زیب کی اس بدنام اور متہم شبیہ کی صفائی کی جائے جسے متعصب مؤرخین نے ہندوستان کے مسلم دور حکومت کی علامت قرار دیا ہے۔"

ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد[متوفی ۱۹۶۳ء] نے اپنی کتاب 'ہندوستان کا مستقبل' میں لکھا ہے کہ:

"گردھر ولد جگ جیون موضع بسنی ضلع بنارس اور جدو مصر مہیش پور پرگنہ حویلی کو اورنگ زیب نے جاگیریں دیں۔"

منشی حکم چند اکسٹرا کمشنر بندوبست نے ۱۸۸۴ء میں ضلع ملتان کی تاریخ لکھی

ہے،اس میں لکھتے ہیں کہ:

"عالمگیر نے ملتان میں مصر کلیان کے نام تو تلا مائی مندر کے لیے ۱۰۰ روپے کا وظیفہ مقرر کیا۔"

متھرا کے چند میل کے فاصلے پر بلدیو دوار میں بھی اورنگ زیب کا فرمان ہے اور سیتا پور میں مصر کھ مندر کے مہنت کے پاس اورنگ زیب کا فرمان ہے جس میں بہت سے گاؤں دیے گئے ہیں۔

اجودھیا کے مشہور مندروں کے پجاریوں کے پاس بھی اورنگ زیب کے فرامین ہیں جن میں پجاریوں کے حقوق محفوظ کیے گئے ہیں۔ یہ فرامین لندن میوزیم کے اندر موجود ہیں۔

بودھ گیا کے مندر میں اورنگ زیب کے لاکھوں روپے کے عطیات کا فرمان موجود ہے۔ یہ ہے عالمگیر کے عہد حکومت کی ایک اجمالی جھلک۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

لیکن انگریزوں کے دور حکومت میں جو سبق پڑھایا گیا وہ اس کے برعکس ہے:

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندوکش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

اس سلسلے میں یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کا ہمیشہ سے یہ امتیاز رہا ہے کہ ان کے یہاں دین و مذہب کو سب سے پہلا درجہ حاصل ہونے کے باوجود دوسری قوموں کے ساتھ بہتر سلوک رہا ہے۔ چناں چہ انہوں نے ہندوستان کے بت پرستوں اور ایران کے آتش پرستوں کے ساتھ بھی اس قسم کی کوئی زیادتی نہیں کی۔ جب انہوں نے ہندوؤں کے مقدس شہر بنارس کو جس کی آبادی کا بڑا حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا، فتح کیا تو ان کے ساتھ بہت بہتر سلوک کیا اور ان کے مذہبی شعائر کا پورا لحاظ کیا۔

یہ اظہار خیال ایک انگریز مصنف کا ہے جو ہندوستان کے مشہور مؤرخ اور جید عالم حضرت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ردولوی [متوفی ۱۹۷۴ء] نے اپنی کتاب 'اسلام اور عربی تمدن' میں نقل کیا ہے۔ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں:

> "مصنف کو چوں کہ ہندوستان کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے، اس لیے انہوں نے صرف ایک مثال بنارس کی دی ہے۔ ورنہ ہندوستان کی تاریخ ان مسلمانوں کی رواداری سے بھری پڑی ہے۔"[1]

[1] اورنگ زیب کے فرامین اور اس تعلق سے مزید معلومات احقر کی کتاب 'گیانواپی مسجد تاریخ کے آئینے میں' کا مطالعہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی
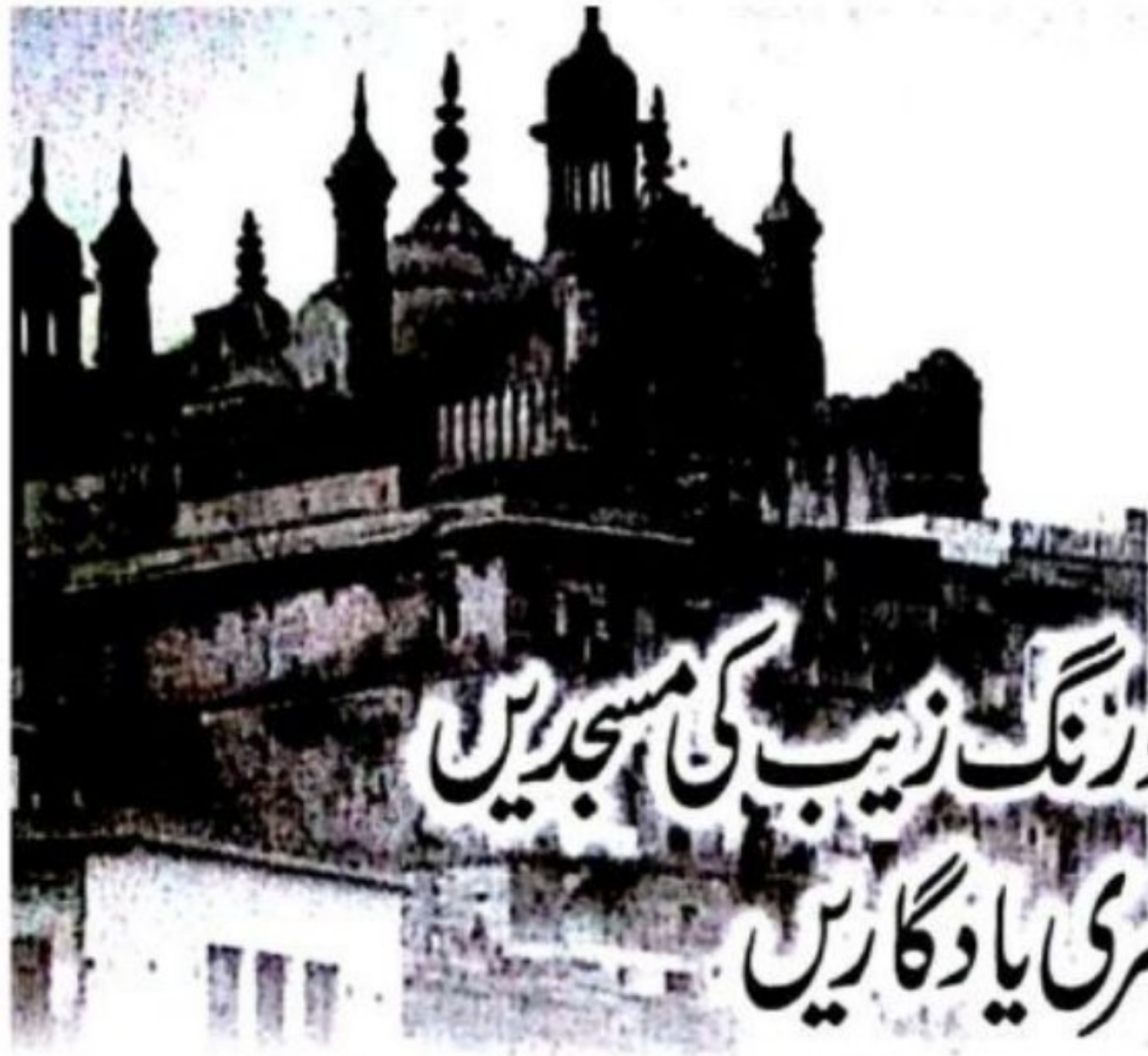
بنارس میں عہد اورنگ زیب کی مسجدیں اور دوسری یادگاریں

گزشتہ صفحات میں جامع مسجد گیان واپی کا تفصیلی ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس کی تعمیر اول اکبر بادشاہ [متوفی ۱۶۰۵ء] کے دور میں ہوئی اور اورنگ زیب [متوفی ۱۷۰۷ء نے اپنے پردادا اکبر کی بنیادوں پر اس کی دوسری تعمیر کرائی۔

اس کے علاوہ دو مسجدیں اور بھی قابل ذکر ہیں، جن میں ایک 'مسجد دھرہرہ' ہے، اور دوسری 'عالمگیری مسجد' ہے جو عوام میں 'فوارے کی مسجد' سے مشہور ہے۔ ان دونوں مسجدوں کے متعلق بھی اورنگ زیب کو بدنام کیا گیا ہے کہ یہ مندر توڑ کر بنائی گئی ہیں۔ جب کہ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ مذکورہ بالا دونوں مسجدوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ مسجد دھرہرہ:

یہ مسجد دریائے گنگا کے کنارے پنچ گنگا گھاٹ پر واقع ہے۔ جہاں مسجد واقع ہے اس محلّہ کا نام مادھورائے ہے جیسا کہ ان متعدد شاہی فرامین سے ظاہر ہوتا ہے جو اورنگ زیب کی طرف سے جاری ہوے ہیں۔ اس مسجد کی دیوار سے ملی ہوئی دیوار سیتا رام مندر کی ہے جو اکبر کے حکم سے راجا مان سنگھ نے تعمیر کرایا جو کہ عوام میں 'کنگن والی حویلی' سے مشہور ہے۔ یہاں بھی وہی جذبہ کارفرما ہے کہ مندر اور مسجد ساتھ ساتھ رہیں جو ہندو مسلم ایکتا کا ایک نمونہ ہے۔ مندر کے اندر اورنگ زیب کا ایک شاہی فرمان بھی

موجود ہے، جس میں لکھا ہوا ہے کہ:

''یک منزل حویلی در محلّہ مادھورائے واقع بلدہ محمد آباد بنارس
سمت جنوب تالب گنگ''

اس عبارت سے ایک تو یہ واضح ہوگیا کہ جہاں یہ مسجد واقع ہے اس محلّہ کا نام 'مادھورائے' ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شہر کا نام محمد آباد بھی ہے۔ جیسا کہ اس کے علاوہ اورنگ زیب اور اس کے بعد کے فرامین میں 'محمد آباد بنارس' درج ہے۔

اس مسجد کے دو اونچے مینار تھے، جن کو عام طور پر دھرہرہ کہا جاتا تھا، اور محلّہ کی مناسبت سے 'مادھورائے کا دھرہرہ' بھی کہا جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے 'مادھورائے کے دھرہرہ' سے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ مادھورائے اورنگ زیب کا وزیر تھا اور اس نے اس کو خوش کرنے کے لیے یہ مینار بنوایا۔ کسی کا خیال ہے کہ یہاں پہلے مادھورائے کا مندر تھا۔ حالاں کہ یہ سب باتیں غلط، بے بنیاد اور بالکل خلاف واقعہ ہیں۔

اب دھرہرہ کا صرف نام باقی رہ گیا ہے، کیوں کہ پہلا مینار ۸ ویں ذی الحجہ کی شب ۱۳۶۸ھ مطابق ۳۰/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ۱۱ بجے رات میں اچانک منہدم ہوگیا جس کے صدمے سے دوسرا مینار بھی مخدوش ہوگیا تھا، جسے ۱۹۵۸ء میں محکمۂ آثار قدیمہ نے اتار دیا۔ یہ دونوں مینار گنگا کی سطح سے دو سو فٹ اونچے تھے، جن میں مسجد کی چھت سے کنگرے تک ۱۲۱/زینے لگے ہوئے تھے۔

اس مسجد کی تعمیر سے پہلے یہاں کسی مندر کا وجود ہی نہ تھا۔ بلکہ سرکاری بیت المال کی زمین پر اس مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اس کی تعمیر کے وقت اورنگ زیب کے کچھ شاہی کارپردازوں نے سیتارام مندر کے ساتھ مزاحمت کی، جس کے نتیجہ میں مندر کے مہنت گوشائیں جی نے اورنگ زیب کے پاس اطلاع بھیجی تو فوراً وہاں سے فرمان جاری ہوا کہ مندر کے ساتھ کسی طرح کی مزاحمت نہ کی جائے۔ جیسا کہ مندر کے اندر موجود محضر

نامے میں لکھا ہے:

چنانچہ گوشائیں جی موصوف فرمان والاشان حضرت عالمگیر بادشاہ درباب عدم مزاحمت مندر سیتا رام جی حاصل ساختہ مندر موصوف را از انہدام باز داشتند،فرمان والا شان موجود است.

ترجمہ:

چنانچہ گوشائیں جی موصوف نے عالمگیر بادشاہ سے یہ فرمان حاصل کیا کہ سیتارام کے مندر کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی جائے اور مندر موصوف کو منہدم ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔فرمان والاشان موجود ہے۔

لہٰذا اس مسجد کے متعلق یہ بات غلط طریقے سے مشہور کی گئی ہے کہ پہلے یہاں مندر تھا۔کیوں کہ اسلامی قانون کے مطابق کسی دوسرے شخص کی ملکیت یا زمین پر خواہ وہ مسلم کی ہو یا غیر مسلم کی،مسجد تعمیر کرانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

اس مسجد کے متصل ایک برہمن خاندان کے افراد کے درمیان مقدمہ بازی کے سلسلے میں ایک فریق نے اورنگ زیب بادشاہ کا فرمان داخل کیا،جس میں حاکم بنارس کو ایک ٹکڑا زمین ناجائز طور پر حاصل کرنے پر ملامت کی گئی ہے۔اور اس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسجد کی زمین باقاعدہ خرید کر حاصل کی گئی ہے،جس کا بیع نامہ میرے دوست جناب منشی حکیم الدین صاحب[1] نے بھی دیکھا ہے۔

اس مسجد کے تعلق سے مصنف 'مرقع بنارس' لکھتے ہیں کہ:

"جس جگہ مسجد ہے وہ جگہ مادھوداس کا دھورہرہ کہی جاتی ہے اور مسجد بھی دھورہرہ مادھوداس کے نام سے مشہور ہے۔یا تو مادھوداس کوئی ٹھیکیدار تھا،یا پھر مسجد کسی مادھوداس پنڈت نے اس طرح بنوائی ہے، جس طرح امیر الامراء راجا بھگوان داس نے ایک مسجد لاہور میں بنوائی اور مہاراجا ٹکیت رائے نے دمگڈھ تھانہ ہنڈیا ضلع الہ آباد میں۔"

[ص۱۸۱]

[1] ساکن قطبن شہید [متوفی ۱۹۸۸ء] ع ب نعمانی

سخت حیرت ہے کہ مصنف نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ مادھورائے کی جگہ مادھو داس لکھا، دوسرے یہ کہ مادھوداس کے بارے میں خوامخواہ قیاس آرائی کی کہ کوئی ٹھیکے دار یا پنڈت تھا۔ جب کہ یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ محلّہ مادھورائے میں مسجد واقع ہونے کی بنا پر یہ محلّہ کی طرف اسی طرح منسوب ہوگئی ہے جس طرح 'گیان واپی' محلّہ کی طرف جامع مسجد منسوب ہوکر گیان واپی مسجد کہی جاتی ہے۔

مصنف مرقع بنارس نے مسجد کا سال تعمیر ۱۰۷۹ھ لکھا ہے، جو اورنگ زیب کے ۱۰۶۸ھ میں تخت نشین ہونے کے بعد گیارہواں سال ہے اور ثبوت کے لیے مسجد کی پشت والی دیوار پر یہ سال تعمیر کندہ ہونے کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس کی کافی تلاش کی، لیکن نظر نہ آیا۔ اس کتبہ کے متعلق مصنف مذکور نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ:

> "تعمیر کا سال پشت دیوار پر کندہ ہونا بھی ایک عجوبۂ روزگار پہیلی ہے۔ آج تک تمام عمارتوں میں سنہ تعمیر عمارت کے اندر ہوتا ہے۔ مگر ہوشیار سیاح نے الٹی گنگا بہا کر اس کو باہر قائم کردیا۔ اور وہاں سامنے کی دیواروں پر نہیں بالکل مسجد کی پشت والی دیوار پر۔"

[ص ۱۸۴]

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتبہ کو دیکھا تھا، جس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مصنف کا یہ بیان صحیح ہے تو اس کی رو سے اس مسجد کا سال تعمیر ۱۰۷۹ھ ہے، جو اورنگ زیب کے جلوس سلطنت کا گیارہواں سال ہے۔ واللہ اعلم

اس مسجد کے اندر منبر کے اوپر کی دیوار میں جو کتبہ لگا ہوا ہے وہ شاہ عالم[1] کے

---

[1] یہ اورنگ زیب عالمگیر [متوفی ۱۷۰۷ء] کی نسل میں پانچویں پشت میں تھا۔ نام تو اس کا عالی گوہر تھا، لیکن جب ۱۷۵۹ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا تو شاہ عالم خطاب سے مشہور ہوا۔ یہ ایسے وقت میں تخت سلطنت پر بیٹھا جب کہ مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو رہا تھا، حکومت برائے نام رہ گئی تھی، سرزمین ہند میں انگریزوں کی آمد آمد تھی۔ اس کی ذات سے انگریزوں کو اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل میں خاص مدد ملی۔ بادشاہ کے در پردہ مرہٹوں کی حکومت چلتی رہی۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ مخالفین نے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ پھر اسی بیچارگی کے عالم میں یہ ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں انتقال کرگیا۔ [ہندوستان میں اسلامی حکومت۔ ص ۶۷] ع ب نعمانی

زمانے کا ہے، جب کہ نواب علی ابراہیم خاں[1] نے بنارس میں اپنی گورنری کے زمانے میں اس کی مرمت کرائی تھی۔ اس میں ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء درج ہے۔ لیکن بعض دوسرے ذرائع سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر اورنگ زیب ہی نے اپنے جلوس کے گیارہویں سال ۱۰۷۹ھ میں کرائی، اور پھر ۱۲۴۰ھ میں محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے اس کے صحن اور پشتہ وغیرہ کی تعمیر ہوئی۔ محکمہ مذکور نے ایک دوسرا کتبہ بھی لگا دیا ہے۔ دونوں کتبے درج ذیل ہیں:

(۱)

هوالاحد

در سلطنت شاه عالم بادشاه بامداد امیر الممالک عمادالدوله گورنر جنرل مسٹر هیشٹین بهادر جلاوت جنگ سنه یک هزار ویکصد و نود و هشت هجری نصیرالدوله علی ابراهیم خاں حاکم بنارس تعمیر ومرمت نمود.

(۲)

بموجب حکم صاحبان کمیٹی حسب الارشاد نواب گورنر جنرل بهادر دراجلاس کونسل برای تعمیر وترمیم عمارات ودرستگی وآراستگی طرق وشوارع بلده بنارس معین ومقرر الدباهتمام مسٹر هیشٹین بنسبت صاحب مسجد هذا که از زیرتابا لا شکسته وخراب شده بود، درعرصه دوسال ابتدای ۱۲٤۰ه لغایت ۱۲٤۲ه درصحن مسجد فرش مصفاسنگ وچه پشتهای رفیع سنگ طرف دریای گنگ وزینه های وسیع ومینارهای رفیع وتیاری صدر دروازه بهترین اندازه ترمیم وتعمیر یافت.[2]

---

[1] ان کا مستقل تذکرہ آگے آئے گا۔ ع ب نعمانی

[2] ان کتبوں میں پہلا کتبہ مسجد کے اندر مرکزی محراب کے دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب نصب ہے۔ ع ب نعمانی

اس مسجد کی شان وشوکت اس کے دونوں میناروں کے دم سے قائم تھی، لیکن افسوس کہ اب یہ دونوں مینار نہیں رہے۔ اس کتاب میں ان دونوں میناروں سمیت مسجد کا فوٹو لگادیا گیا ہے۔

تعمیر مسجد کا پس منظر:

کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کا پس منظر ایک اہم تاریخی واقعہ ہے جو درج ذیل ہے:

پنڈت لالہ رام کاشی کے پنڈتوں کے ایک مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی شکنتلا پر اورنگ زیب کی طرف سے مقرر کردہ کوتوال شہر ابراہیم خاں فریفتہ ہوگیا۔ ایک دن اس نے پنڈت جی کے پاس آدمی بھیج کر ان کو اور ان کی لڑکی کو اپنے گھر لانے کا حکم دیا لیکن شکنتلا کسی طرح جانے پر راضی نہ تھی اس لیے ایک ماہ کی مدت مانگی۔ کوتوال نے منظور کرلیا۔ پھر شکنتلا بھیس بدل کر مغل شہزادوں جیسا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوکر دہلی کے لیے روانہ ہوگئی۔ جمعہ کے دن جب اورنگ زیب جامع مسجد سے نماز جمعہ ادا کرکے باہر نکلے تو دیکھا کہ سیڑھیوں پر ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے فریادی دو رویہ صف بستہ کھڑے تھے۔ اس میں شکنتلا بھی فریادی کی حیثیت سے شامل ہوگئی۔ بادشاہ کی نظر جب اس پر پڑی تو پہچان لیا کہ یہ کوئی لڑکی ہے جو کسی مصلحت کی بنا پر مردانہ لباس میں ہے۔ بادشاہ نے اس کو دیوان خاص میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ حاضر ہوئی تو بادشاہ نے ایک دوشالہ دیتے ہوے اسے حکم دیا کہ سر کی پگڑی اتار کر اس کو اوڑھ لو۔ شکنتلا نے پھوٹ مار کر رونا شروع کیا اور اپنی فریاد پیش کی اور بتایا کہ میں ایک برہمن لڑکی ہوں اور بنارس سے آئی ہوں۔ بادشاہ نے بڑی دلجوئی کرتے ہوئے اس کو قلعہ معلیٰ کے دروازے تک پہنچایا اور یہ حکم صادر کیا کہ تم اپنے والد سے کہنا کہ ڈولہ سجا کر کوتوال کے دروازے تک مجھے پہنچا دیا جائے، پھر میں جو کرونگا تمہیں معلوم ہوجائے گا۔

شکنتلا کو اس جواب سے پہلے تو کچھ وحشت ہوئی، لیکن یقین تھا کہ بادشاہ ناانصافی نہیں کرے گا اس لیے وہ اپنے والد سے اس حکم پر عمل کراتے ہوئے ڈولہ پر سوار ہو کر کوتوالی کے قریب لائی گئی اور عین اس وقت جب کوتوال شہر یہ منظر دیکھ کر فرط مسرت سے بیتاب تھا کہ دل کی ایک آرزو پوری ہوئی، وہاں فقیروں کی ایک ٹولی بھیک مانگنے کے لیے پہنچی۔ انہیں کوتوال بھیک دینے کے لیے جھکا تو ایک فقیر نے اپنا لباس اتار کر پھینک دیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب تھا۔ کوتوال کا دہشت کے مارے خون سوکھ گیا اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بادشاہ نے فوراً شاہی عملہ کو حکم دیا کہ کوتوال کو گرفتار کر کے اس کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے!

ادھر بادشاہ کے حکم کی بجا آوری ہوئی، ادھر شکنتلا کا ڈولا اس کے گھر کی طرف پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ واپس ہو گیا۔

شکنتلا کے گھر پہنچتے ہی اورنگ زیب بھی اس کے گھر پر بہ نفس نفیس پہنچا اور پانی طلب کرتے ہوئے کہا کہ جس دن سے شکنتلا نے میرے حضور میں فریاد پیش کی تھی، اسی دن میں نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک اس برہمن لڑکی کے ساتھ انصاف نہ کر لوں گا حلق کے نیچے پانی کا ایک قطرہ نہ اتاروں گا۔ پنڈت جی نے اپنی زمین کے ایک چبوترہ پر بادشاہ کو بٹھایا۔ بادشاہ نے پانی پیا، نماز ادا کی، پھر کھانا تناول فرمایا۔ جب رخصت ہونے لگے تو پنڈت جی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

''جہاں پناہ! جس بھومی کو آپ نے اپنے سجدوں سے مقدس بنا دیا ہے، اب ہم اس کو کسی دوسرے کام میں استعمال نہ کریں گے۔''

اس کے بعد شہنشاہ نے اس زمین پر جو بیت المال میں داخل ہو چکی تھی، یہ مسجد تعمیر کرائی۔

اس مسجد کے امام اور خطیب اورنگ زیب ہی کے دور سے سرکاری وظیفہ یاب ہوتے آئے ہیں۔ میرے سامنے ۱۱۲۴ھ م ۱۷۱۳ء کا ایک شاہی فرمان لایا گیا، جس پر
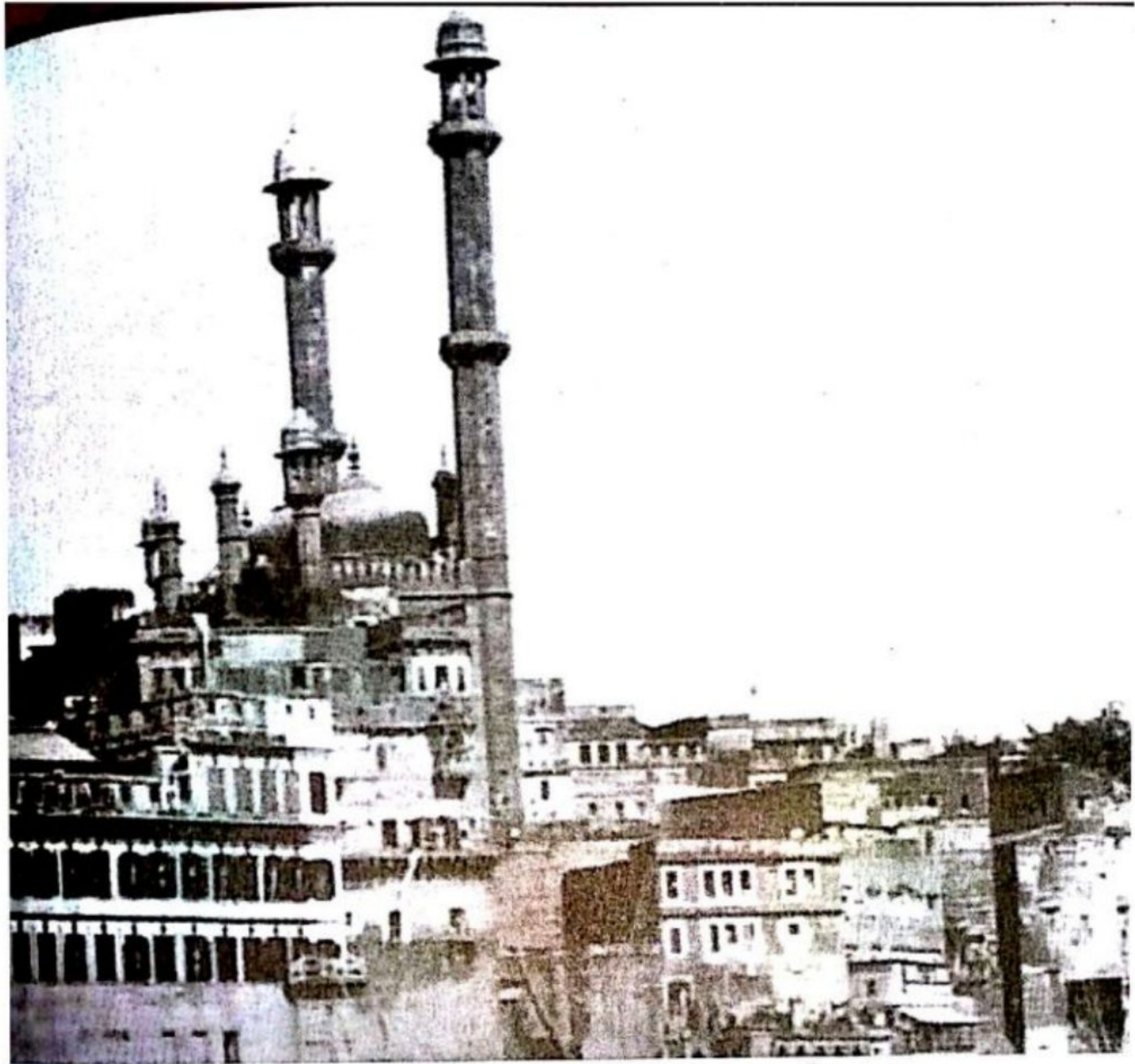
سلطان فرخ سیر[1] کی مہر ثبت ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دور میں محمد حسین امام مقرر ہوئے۔ ان کے بعد شیخ حبیب اللہ، پھر محبّ اللہ، پھر سید نذر محمد، پھر علی اکبر مقرر ہوئے۔ ان کے بعد کے ائمہ کا علم تو نہ ہوسکا، البتہ آج سے ایک صدی قبل بنارس کے ایک مشہور بزرگ حضرت مولانا نار ضا علی صاحب قطب بنارسؒ[2] [متوفی ۱۳۱۲ھ] بھی یہاں کے امام تھے، جن کی اس منصب پر تقرری کا سال تو نہیں معلوم، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اپنی عمر کے آخر تک وہ اس منصب پر تھے۔ اب خاکسار مصنف کی تحریک اور کوشش

---

[1] یہ اورنگ زیب عالم گیر کی نسل میں چوتھی پشت میں تھا۔ ۱۷۱۳ء میں تخت پر بیٹھا، لیکن جلد ہی اس کی حکومت میں دو بھائیوں سید حسن علی اور سید عبداللہ کی آپسی لڑائی کے نتیجے میں اس کا تخت ایسا الٹا کہ پہلے تو اسے قید خانے میں ڈالا گیا، پھر بعد میں اندھا کر کے اسے ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں قتل کر دیا گیا۔ [مستفاد از 'ہندوستان میں اسلامی حکومت' ص ۳۷۵] ع ب نعمانی

[2] آپ کا مستقل تذکرہ حضرت مصنفؒ کی دوسری کتاب 'تذکرہ مشائخ بنارس' ص ۱۰۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی
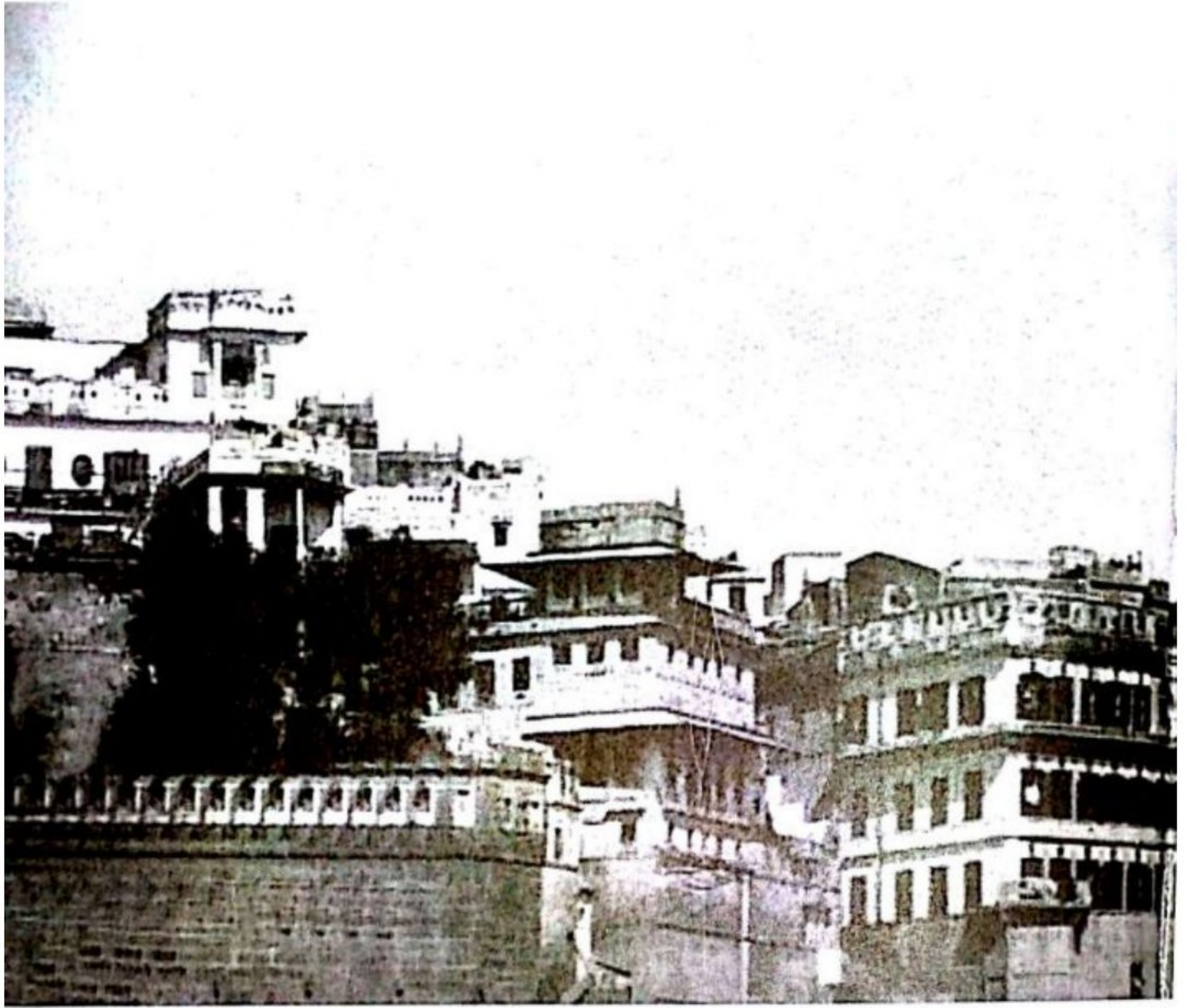
سے ۱۱محرم الحرام ۱۴۰۶ھ کو پھر جمعہ قائم کیا گیا ہے جس کی امامت کے لیے فی الحال مولوی جمیل احمد صاحب مقرر کیے گئے ہیں[1] اس مسجد میں پنج وقتہ نماز نہیں ہوتی[2] صرف عصر اور مغرب کی نماز حافظ عبدالحفیظ صاحب ساکن سلیم پورہ بنارس کی اقتدا میں ہوتی ہے[3] مسجد کے موجودہ متولی جناب صادق علی صاحب ساکن محلہ سلیم پورہ ہیں[4]

---

[1] یہ بنارس کے محلہ چندو پورہ کے رہنے والے تھے، کچھ ہی دنوں کے بعد منصب امامت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اب اس وقت حضرت مولانا محمد احمد مظہری ساکن پیلی کوٹھی بنارس ۱۹۸۹ء سے نماز جمعہ کی امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ع ب نعمانی

[2] اب ماشاء اللہ یہاں نماز پنجگانہ سمیت نماز عیدین بھی بڑے اہتمام سے ہوتی ہے۔ ع ب نعمانی

[3] آپ بنارس کی مشہور شخصیت استاذ الحفاظ حضرت حافظ جمن صاحبؒ [متوفی ۱۳۲۷ھ] کے پوتے ہیں، جو عوام میں حافظ بھولو کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۳دسمبر ۱۹۹۳ء کو وفات پائی۔ ع ب نعمانی

[4] اس مسجد کی تولیت کے تعلق سے محترم جناب صادق علی صاحب کا کہنا ہے کہ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ نے ان کے اجداد میں جناب شیخ نور اللہ کو متولی بنایا تھا، چنانچہ اس وقت سے اب تک تولیت کا شرف اس خاندان کو حاصل ہے۔

[خصوصی نوٹ]

جامع مسجد دھرہرا:

حال کے چند المناک واقعات کی ایک مختصر روداد

اس مسجد کا نگرنگم میں نمبر K.22/28 اور وقف بورڈ میں وقف نمبر ۲۲۱ ہے جسے محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۳۲ء میں اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی تولیت وانتظام وانصرام کے بارے میں مورخہ ۲ جولائی ۱۹۳۲ء کو شہامت علی، ساکن سلیم پورہ شہر بنارس اور اس وقت کی برطانوی حکومت کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی کچھ شرطیں یوں تھیں:

شہامت علی اس MONOMENT کے OWNER CUSTODIAN اور وقف بورڈ سے

- متولی ہوں گے۔
- صفائی ستھرائی کی ذمہ داری متولی کی ہوگی۔
- مرمت کی ذمہ داری A.S.I. (محکمہ آثار قدیمہ) کی ہوگی۔
- مسلمانوں کو سبھی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

مینار یا چھت پر جانے والوں سے متولی فی کس چھ پائی [1/2 آنہ] وصولی کرے گا، اور یہ موصولہ رقم اس کی ذاتی آمدنی ہوگی۔ نیز یہ کہ آنے والے سیاحوں کو مسجد کا پورا پورا ادب واحترام کرنا لازم ہوگا۔

مذکورہ معاہدہ کے مطابق ایک زمانے تک سارا کام انجام پاتا رہا۔ متولی اگرچہ شہامت علی صاحب مقرر ہوئے تھے، لیکن عملاً ان کے چھوٹے بھائی جناب مولوی شاکر علی صاحب ہی پیش پیش رہتے اور متولی کے سارے فرائض اصل متولی مذکور کی اجازت سے انجام دیتے۔ لیکن جب مورخہ ۲۴/۱۱/۱۹۵۶ء کو شہامت علی صاحب کا انتقال ہوگیا تو مولوی شاکر علی صاحب مستقل متولی کی حیثیت سے تولیت کے سارے فرائض انجام دینے لگے۔ پھر مورخہ ۲۱/۱۰/۱۹۷۱ء کو ان کا بھی انتقال ہوگیا تو ان کی جگہ پر موجودہ متولی جناب صادق علی صاحب کی تقرری ہوئی۔ موصوف اس وقت سے اب تک بخوبی اپنے فرائض منصبی کو انجام دے رہے ہیں۔

موصوف کا دور تولیت نہایت صبر آزما اور پرآشوب ثابت ہوا۔ ان حالات کے پیدا کرنے کے ذمہ دار جہاں اس ملک کے متعصب، شرپسند وفرقہ پرست عناصر ہیں تو محکمہ آثار قدیمہ اور شہری انتظامیہ کے کارندے بھی کچھ کم قصوروار نہیں۔ ذیل میں ماضی قریب کے کچھ قابل ذکر

افسوناک واقعات کی روشنی میں مسجد دھرہرہ کے موجودہ حالات درج کیے جارہے ہیں، تاکہ عوام کو معلوم ہوجائے کہ ایک جمہوری ملک میں سارے ٹھوس دلائل کے باوجود ایک خاص فرقہ کے ساتھ کس طرح سوتیلا پن کرکے اس کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے:

اس سلسلے میں سب سے پہلے شاہی جامع مسجد گیان واپی اور ایودھیا کی بابری مسجد کی طرح کچھ شرپسند عناصر کی جانب سے اس عالمگیری مسجد دھرہرا کے بارے میں بھی وہی غلط اور بے بنیاد پروپگنڈا شروع کردیا گیا کہ یہ مسجد بھی اورنگزیب نے ناجائز زمین پر ناجائز طریقہ سے تعمیر کرائی ہے۔ ان شرپسندوں کا دعویٰ ہے کہ یہ عالمگیری مسجد دراصل بندو مادھو کا مندر تھا جسے اورنگ زیب نے منہدم کراکے اس پر مسجد تعمیر کرادی۔ ان لوگوں کی نفرت انگیزی کا عالم یہ ہے کہ اس جامع مسجد کو مسجد کہنے کی بجائے 'مادھوراؤ کا دھرہرہ' کہنا اور لکھنا شروع کردیا۔ اس ناپاک سازش میں محکمہ آثار قدیمہ بھی ملوث ہے۔ چنانچہ محکمہ مذکور کی جانب سے مسجد کے دالان میں ایک قدیم بوڈ جس پر جامع مسجد دھرہرہ تحریر تھا، اسے ہٹا کر 'مادھورائے کا دھرہرہ' تحریر کرادیا گیا جس کی بروقت مخالفت اور احتجاج سے بحمد اللہ کامیابی ہوئی اور سابقہ تحریر دوبارہ لکھی گئی۔

اپنے غلط پروپگنڈوں اور جھوٹے دعووں کی بنیاد پر ۱۹۹۵ء میں انہوں نے مسجد میں بھگوا جھنڈا لہرانے کی ناپاک کوشش کی جسے مسجد کی انتظامیہ اور شہری حکام کی بروقت مداخلت سے ناکام بنا دیا گیا اور مسجد کے دروازے پر مسلح گارڈ تعینات کردیے گئے جب کہ اس سے پہلے کبھی بھی مسجد کی حفاظت کے لیے پولیس کی تعیناتی کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے جس کی سب سے خاص وجہ اس علاقہ کے امن پسند عوام ہیں۔

ابھی اوپر مذکور ہوا کہ مسجد ہٰذا کی مرمت اور رکھ رکھاؤ A.S.I. کے ذمہ ہے۔ چنانچہ مسجد کے صدر دروازہ کے اوپر کی برجی ٹوٹ گئی تھی۔ محکمہ مذکور کے زیر نگرانی مورخہ ۲۰۰۲/۸/۳۰ء کو اس کی مرمت کا کام شروع ہوا۔ مرمتی کام کی ابھی ابتداء ہی ہوئی تھی کہ اچانک اس علاقہ کے رہنے والے ایک شرپسند منوج مشرا نامی شخص نے شور مچا کر بھیڑ جمع کرلی کہ مسجد میں تعمیر کا نیا کام ہورہا ہے۔ جب کہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوتوالی انچارج بھاری فورس کے ساتھ چلے آئے اور حقیقت کا پتہ لگائے بغیر اپنی طاقت کے بل پر اس کام پر روک لگادی۔ حتیٰ کہ ۲۰۰۲/۹/۳ء کو پولیس فورس کی زیر نگرانی اس زیر مرمت برجی کو ناجائز تعمیر کہہ کر توڑ دیا گیا۔

۲۰۰۲ء میں محکمہ آثار قدیمہ کے چند اہل کاروں اور جن سنگھی ذہنیت کے افسران کے ساتھ مل کر اسی منوج مشرا نامی شرپسند کی درخواست پر اس وقت کی N.D.A. حکومت کے مرکزی وزیر

سیاحت جگ موہن نے محکمہ آثار قدیمہ پر یہ حکم صادر کردیا کہ وہ اس مسجد کے متولی صادق علی اور دیگر مسلمانوں کو اس مسجد سے بے دخل کردے۔اسی محکمہ کے رام دیال نامی ایک افسر نے یہاں کے نمازیوں کے بارے میں مذکورہ وزیر جگ موہن کو شکایت ارسال کی کہ اس مسجد میں ناپسندیدہ عناصر آتے ہیں۔اس کا اثر یہ ہوا کہ مؤرخہ ۲/۹/۲۰۰۲ء کو متولی جناب صادق علی صاحب کی غیر موجودگی میں ان کے چھوٹے بھائی جناب راشد علی صاحب سے رام دیال مذکور جو کہ سارناتھ میں .C.A کے منصب پر تھے،مسجد کے زینے اور حجرے کی کنجیاں ضبط کرلیں۔اس کی رپورٹ اسی روز شہری انتظامیہ کے افسران کے ساتھ چیف ہوم سکریٹری کو بھی دے دی گئی۔ان لوگوں کی فوری کاروائی کے نتیجے میں کچھ کنجیاں تو واپس ہوئیں،لیکن اصل مسجد جہاں نماز ادا کی جاتی ہے،اور چھت پر جانے کی کنجیاں یہ کہہ کر روک لی گئیں کہ ابھی کچھ مرمت کا کام ہونا ہے،بعد میں لوٹادی جائیں گی۔لیکن افسوس کہ اس وقت سے کئی سال بعد تک نہ تو معمولی سا بھی مرمت کا کام ہوا،نہ ہی چابیاں واپس کی گئیں۔

.A.S.I پٹنہ کے سپرنٹنڈنٹ سے خود متولی جناب صادق علی صاحب نے ذاتی طور پر ملاقات کرکے کنجیوں کے واپس کرانے اور مرمت کے کاموں کو شروع کرانے کی گزارش کی،لیکن موصوف کی متعصبانہ ذہنیت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باوجود وعدہ کے ایک طویل عرصہ تک انہوں نے نہ صرف یہ کہ اجازت نہ دی،بلکہ اپنی بعض دوسری ضرورت سے کئی مرتبہ بنارس کے دورے پر آئے،لیکن مسجد آکر معائنہ کرنے اور اپنے کیے ہوے وعدے کو نبھانے کی ذرا بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

اس کے لیے خود اس ناچیز کی شمولیت کے ساتھ بنارس کے چند معزز شہریوں کا مورخہ ۴/۹/۲۰۰۲ء کو ایک وفد اس وقت کے ضلع مجسٹریٹ انیل سنت کے پاس گیا۔کچھ دیگر سیاسی رہنماؤں سے بھی سفارش کرائی گئی۔لیکن افسوس کہ کوئی کامیابی نہ ملی۔

باوجودیکہ مسجد کے صحن میں مسجد کی حفاظت کی غرض سے ہمہ وقت پولیس تعینات رہتی ہے،پھر بھی مورخہ ۷/۱۱/۲۰۰۲ء کو انہی شرپسندوں نے مسجد کے باہری زینے کو گروا (زعفرانی) رنگ سے رنگنے کے بعد اس پر دیوی دیوتاؤں کا پھول مالا بھی چڑھا رکھا تھا،جس میں بروقت مداخلت اور ڈی،ایم سے ملاقات کرکے ان شرپسندوں کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا گیا۔یہی نہیں،بلکہ ان شرپسند عناصر کے حوصلے بلند کرنے کا کام اس ملک کے کچھ متعصب سیاسی رہنماؤں نے بھی کیا۔ چنانچہ ۲۰۰۳ء میں ۹۰ صفحات پر مشتمل 'بندو مادھو' نامی ایک کتاب شائع کی گئی جس کے مشمولات میں یوں تو بہت کچھ من گھڑت اور فضول باتیں تھیں،مگر سب سے زیادہ قابل اعتراض چیز اس کتاب کا صفحہ اول تھا،جس پر مسجد دھرہرہ کے صدر دروازے کی تصویر لے کر اس کے مرکزی محراب نما دروازے پر

کمپیوٹر کی مدد سے ایک مورتی فٹ کر کے شائع کر دی گئی۔ کتاب کے اندرونی صفحات میں اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ بھیرو سنگھ شیخاوت [م ۲۰۱۰ء] یو،پی، اسمبلی کے اسپیکر کیسری ناتھ ترپاٹھی اور ممبر پارلیمینٹ شنکر پرشاد جیسوال سمیت متعدد سیاسی وغیر سیاسی شخصیات کے پیغامات اور تائید و تحسین کے کلمات شامل ہیں۔ اس کتاب میں تمام ایسے مضامین اور رپورٹوں کو شامل کیا گیا ہے جو یک طرفہ ہونے کے ساتھ نہایت اشتعال انگیز اور جھوٹی اطلاعات پر مبنی ہیں۔ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ضلع انتظامیہ اور .A.S.I کے ذمہ داران سے متعدد شکایات کی گئیں اور اسے ضبط کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی مذموم حرکت انجام دینے والوں کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا گیا لیکن افسوس کہ آج تک ایسی کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔

ضلع انتظامیہ کی جانب داری اور بے انصافی کے سلسلے کی کڑی وہ واقعہ بھی ہے جو جنوری ۲۰۰۴ء میں پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسجد کے مین گیٹ اور اس کے بازو میں نگر نگم کی جانب سے مرکری بلب (HILOGEN BULB) آویزاں کیے گئے تھے، جن کے خراب ہوجانے کے باعث نگر نگم کے حکم سے انہیں تبدیل کر دیا گیا۔ اس معاملہ میں متولی مسجد کا کوئی رول نہ تھا، لیکن اسی مذکورہ شر پسند منوج مشرا نے جھوٹے الزامات پر مبنی ایک تحریری شکایت سٹی مجسٹریٹ سے کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سٹی مجسٹریٹ مذکور نے بغیر صحیح صورت حال اور حقیقت کا پتہ لگائے سیدھے متولی صادق علی اور ان کے بھائی کو دو لاکھ روپے مچلکہ بھرنے کا حکم صادر کر دیا۔ ساتھ ہی محکمہ آثار قدیمہ نے اسے ایک روز بعد اتروا بھی دیا۔ جب اس کی مخالفت کی گئی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ نقض امن کے اندیشے سے ایسا کیا گیا ہے جب کہ ان کی طرف سے اس طرح کی کاروائی کسی طرح بھی صحیح نہیں تھی۔ اس طرح کا فرمان جاری کرنے کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ مسلمان اپنی مساجد کی خود دیکھ بھال نہ کر کے انہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور پھر ان کی مرضی کا انتظار کریں۔

سال نو کے موقع پر مبارک باد دینے کے لیے تہنیتی کارڈ کا سلسلہ ایک عرصہ سے ہندوستان میں رائج ہے۔ شر پسندوں کو ایک نئی شرارت یہ سوجھی کہ ۲۰۰۴ء کا تہنیتی کارڈ ایسا چھپوا کر تقسیم کرایا جس کے سرورق پر مسجد دھر ہرہ کی اسکیچ کے ذریعہ ایک ایسی تصویر بنی تھی جس کے مین گیٹ پر قومی جھنڈا لہراتا ہوا دکھایا گیا تھا، ساتھ ہی دروازے کی جگہ کچھ اور قابل اعتراض تصویریں بھی چھپی تھیں۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی دل آزاری اور ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے علاوہ ان شر پسندوں کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ چنانچہ اس کی ضلع حکام سے بروقت شکایت کر کے اس کارڈ کو ضبط کرنے اور اس کام میں ملوث تمام ہی افراد کے خلاف تادیبی کاروائی کا مطالبہ کیا گیا۔

محکمہ آثار قدیمہ اس مسجد کی حفاظت کس طرح کرتا ہے، اور اس معاملہ میں وہ کتنا دیانتدار

ہے؟اس کا اندازہ ماہ اگست ۲۰۰۴ء کے اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک روز حسب معمول لوگ نمازظہر ادا کرنے کے لیے جب مسجد میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مسجد کے اندر سے قرآن شریف کے چند نسخے اور تیس پاروں کی پیٹیوں سے کئی پارے غائب ہیں۔ یہ دیکھ کر نمازیوں میں بے چینی اور کرب کی لہر دوڑ گئی، چنانچہ فوری طور پر اس کی اطلاع متولی صادق علی صاحب کو دی گئی۔ وہ جب مسجد آئے تو مسجد کے صدر دروازے پر کوتوالی انسپکٹر 'تومر' موجود تھے، چنانچہ ان کی معیت میں جب قرآنی نسخوں اور پاروں کی تلاش ہوئی تو یہ نسخے اور پارے محکمہ آثار قدیمہ کے وہاں پر تعینات ملازمین کے کمرے میں موجود ان چوکیوں کے نیچے پائے گئے جن پر وہ سوتے ہیں۔ کمرے میں یہ ملازمین تو غائب تھے، لیکن کوتوالی انسپکٹر نے ان نسخوں اور پاروں کو وہاں سے نکال کر متولی کے حوالے کر دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ محکمہ آثار قدیمہ کے ان ملازمین نے کوتوالی میں مسجد کے متولی اور امام صاحب کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے کہ ان لوگوں نے مسجد میں کچھ کتابیں خرید کر رکھی ہیں۔

اس واقعہ کے بعد متولی مسجد نے اس وقت کے ڈی، ایم، دھرم سنگھ اور ایس، ایس، پی، ایس، این، ساوت کو مطلع کرتے ہوئے ان ملازمین کے خلاف تادیبی کاروائی کا مطالبہ کیا، لیکن افسوس کہ ان کے خلاف اب تک کوئی خاطر خواہ کاروائی نہ ہوئی۔

شہر کے شر پسند عناصر آئے دن نت نئی شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔ جنوری ۲۰۰۷ء میں ایک نیا واقعہ یہ پیش آیا کہ ملک کی مشہور فرقہ پرست تنظیم 'شیوسینا' کی ضلعی یونٹ کے سرگرم رکن 'گلشن کپور' نے اپنے ہمراہیوں کو لے کر مسجد دھرہرہ میں قومی جھنڈا لہرانے کا پروگرام بنایا، جس کی فوری اطلاع ضلع انتظامیہ کو دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع انتظامیہ کی فوری کاروائی سے یہ شر پسند گرفتار تو کر لیے گئے، لیکن سال ۲۰۰۸ء سے اب تک مسلسل یوم آزادی کے موقع پر یہ شر پسند اسی پروگرام کے تحت مسجد کی طرف بڑھتے رہے، گرفتار ہوتے رہے اور پھر ڈرامائی انداز میں نجی مچلکے پر رہا ہوتے رہے۔

ماہ جولائی ۲۰۰۹ء کو پنچ گنگا گھاٹ پر جہاں یہ مسجد واقع ہے، محکمہ سیاحت اتر پردیش کی جانب سے ایک نئی شرارت یہ ہوئی کہ وہاں مسجد کے متعلق ایک سنگی بوڈ نصب کرایا گیا جس پر اس مسجد کے تعلق سے ہندی زبان میں وہی باتیں تحریر ہیں جن کا شر پسند عناصر کی جانب سے جھوٹا پروپگنڈا ہوتا رہتا ہے کہ سترہویں صدی میں گھاٹ کے کنارے بندو مادھو کے مندر کو اورنگ زیب نے منہدم کرا کے اس کی جگہ دھرہرہ مسجد تعمیر کرادی۔ اس بات کی ضلع انتظامیہ سے احقر راقم الحروف و متولی مسجد، ایس، ایم، یٰسین جوائنٹ سکریٹری انجمن انتظامیہ مساجد، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی، مہتمم دارالعلوم دیوبند اور امام مسجد جناب مولانا محمد احمد صاحب کے ساتھ مزید چند ذمہ داران شہر نے

وفد کی شکل میں اس تختی کو ہٹانے کا سختی سے مطالبہ کیا،لیکن افسوس کہ سوائے حیلہ حوالی ، ٹال مٹول اور جھوٹی تسلی کے آج تک ضلع انتظامیہ کی طرف سے کوئی کاروائی نہ ہوئی۔مزید قابل افسوس بات تو اس وقت ہوئی جب کہ آج سے چار سال قبل ڈی،ایم، جناب رویندر صاحب سے احقر نے اس بوڈ کو وہاں سے ہٹوانے کی گزارش کی تو انہوں نے نہایت بزجستگی کے ساتھ اس متنازعہ عبارت کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ اس پر جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے،ہم اسے نہیں ہٹا سکتے۔

ابھی یہ مسئلہ حل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مورخہ ۲۹/۷/۲۰۰۹ء کو اس ملک کا بدنام زمانہ فرقہ پرست پروین توگڑیا بہت ہی منصوبہ بند طریقہ سے مسجد میں چلا آیا اور جماعت خانہ میں جوتے پہنے ہوئے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ داخل ہو کر مسجد کی سخت بے حرمتی کی۔اس کے علاوہ مسجد کے موذن اور متولی کے بھائی کو مارا پیٹا بھی۔اس کی وجہ سے پورے دن شہر کا ماحول خراب اور شہر کے مسلمان مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے اس دل آزار واقعہ سے انتہائی کرب و بے چینی میں مبتلا ہوے،جس کی وجہ سے قریب تھا کہ فرقہ وارانہ فساد رونما ہو جائے،لیکن اس ناکارہ اور شہر کے دیگر امن پسندوں کے ذریعہ پولیس انتظامیہ پر زور دیا گیا کہ اگر امن وامان مطلوب ہے تو چابی ہمارے حوالے کرنی ہوگی۔ بحمد اللہ یہ تدبیر سودمند ثابت ہوئی اور فوراً چابی واپس کرنے کا ان لوگوں نے وعدہ کرلیا۔بروقت مداخلت سے جلد ہی حالات معمول پر آ گئے۔

خداوند کریم بہت ہی کارساز اور مسبب الاسباب ہے۔وہ بندوں کا کام کب اور کیسے بنادے وہی جانتا ہے۔وہ شر سے بھی خیر کا پہلو نکال کر اپنی قدرت کا مظاہرہ کرتا ہے۔مسجد کی وہ چابیاں جن کا ابھی اوپر ذکر ہوا،جن کی حصولیابی کے لیے اتنے طویل عرصہ سے کافی جدوجہد کی گئی اور ساری تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔توگڑیا کے اس واقعہ کے بعد بھی ایسا ہی ہوا کہ شہری انتظامیہ امن وامان کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگئی تو ان سے مسجد انتظامیہ کی جانب سے چابی واپس کرنے کا مطالبہ کیا گیا جو منظور ہوا،اور چند ہی دنوں میں چابی مسجد انتظامیہ کو واپس کردی گئی جو بحمد اللہ اب بھی متولی کے پاس موجود ہے۔

یہ شر پسند عناصر ایک طرف تو اپنے دیش بھکت ہونے کا نعرہ لگاتے نہیں تھکتے ،دوسری طرف یہی لوگ دیش کے قانون کو کس طرح نظرانداز کرتے ہیں،اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگست ۲۰۰۹ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ آثار قدیمہ کے زیر انتظام قدیم مسجدوں میں نماز کی اجازت نہیں ہے،البتہ جن عمارتوں میں پہلے سے نماز ہوتی آرہی ہے وہ عمارتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔لیکن بنارس کے یہ شر پسند آج بھی اسی بات کے کوشاں ہیں کہ کسی طرح

اس مسجد میں نماز پر روک لگائی جائے اور مسجد ہمارے حوالے کی جائے۔

مورخہ ۳۰ ر ۷ ر ۲۰۱۰ء کو مسجد کے اندرونی حصے میں رنگائی کا کام ہو رہا تھا۔ منوج مشرا نامی اسی مذکورہ شر پسند نے اس کے خلاف بھی پولیس میں شکایت کی جس کے نتیجے میں پولیس نے مداخلت کر کے کام میں روک لگا دی۔ تعجب کا مقام ہے کہ فرقہ پرستوں کے ذریعہ مذکورہ بالا تمام شر انگیزیاں اس وقت ہو رہی ہیں جب کہ مسجد کی حفاظت کے نام پر پانچ پانچ ملازمین تعینات ہیں جن کے اوپر سالانہ دسیوں لاکھ سے زائد روپیوں کے بے جا اخراجات ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اتنے لوگوں کی تعیناتی کی ضرورت ہی نہیں، اور وہ بھی ایسے لوگوں کی کہ ان کے ذریعہ مسجد کی حفاظت کیا معنٰی ؟ یہ خود مسجد کی بے حرمتی اور اس کے بارے میں بدنیتی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم دو مسلم اہل کاروں کا تقرر ہو، تا کہ ان کی تقرری اور تعیناتی کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

ع ب نعمانی

۲۔ مسجد عالمگیری موسوم بہ مسجد فوارہ:

یہ مسجد ہر تیرتھ تالاب کے پاس واقع ہے اور کافی شاندار اور وسیع ہے۔ پوری مسجد سنگین ہے۔ ۱۰۷۷ھ میں تعمیر ہوئی جو اورنگ زیب کے جلوس کا نواں سال ہے۔ مسجد کے اندر محراب پر فول وجهك شطر المسجد الحرام لکھا ہوا ہے، جس سے ۱۰۷۷ھ سال تعمیر نکلتا ہے۔ اسی مسجد سے متصل مفتی نور اللہ حسینیؒ [متوفی ۱۱۰۴ھ] کا قیام تھا جن کو اورنگ زیب [متوفی ۱۷۰۷ء] نے عہدۂ قضا پر مقرر کیا تھا۔ ان کا مکان اور خانقاہ موجود ہے۔ مفتی صاحب ہی کے مشورے سے یہ خانقاہ تعمیر ہوئی۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ خانقاہ اپنے وقت کی عدالت تھی اور یہاں مقدموں کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ اس خانقاہ کی تعمیر ۱۰۹۶ھ م ۱۶۸۴ء میں ہوئی۔ اس کا مادہ تاریخ 'دولت خانہ' ہے، جس سے سال تعمیر برآمد ہوتا ہے۔ خانقاہ کی دیوار پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

زحکم شاہ سلطان شریعت	دلیل زہد، برہان طریقت
شہاب آسمان سرفرازی	محمد شاہ عالمگیر غازی
پئے اصنام و بت خانہ شکستہ	ظہور مسجد دلخواہ گشتہ
باستصواب نور اللہ مفتی	غلام در گہ پیران چشتی
بنائے خانقاہے ہست پیدا	ز 'دولت خانہ' تاریخش ہویدا ۱۰۹۶ھ

ترجمہ:

۱] شریعت کے بادشاہ کے حکم سے جو زہد کی دلیل اور طریقت کے لیے برہان ہیں۔
۲] محمد شاہ (اورنگ زیب) عالمگیر غازی جو آسمان سرفرازی کے روشن ستارے ہیں۔
۳] بتوں اور ویران بت خانوں کے پیچھے ایک دل پسند مسجد کا ظہور ہوا۔
۴] مفتی نور اللہ کے مشورے سے جو پیران چشت کی درگاہ کے غلام ہیں۔
۵] ایک خانقاہ کی عمارت وجود میں آئی اور 'دولت خانہ' سے اس کی تاریخ ظاہر ہے۔

اس کتبے میں 'پئے اصنام و بت خانہ شکستہ' کا مفہوم صاف طور پر ظاہر ہے کہ شکستہ بت خانہ کے پیچھے یہ مسجد تعمیر ہوئی، جو پہلے ہی شکستہ اور منہدم تھا۔ اور وہ حصہ آج

بھی موجود ہے جہاں شیوراتری کے موقع پر یاتری درشن کرنے کے لیے جاتے ہیں[1]
اس مسجد کی تعمیر کے بعد کسی غیر مسلم کشمیری شاعر نے اورنگ زیب کو اپنا یہ شعر بھی سنایا تھا:

ببیں کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اے شیخ میرے اس بت خانہ کی کرامت تو دیکھ کہ جب

---

[1] یہ مسجد محلہ دارانگر میں واقع برتکال مندر کے سامنے سے بڑے ڈاکخانے کی طرف جانے والے راستے میں بائیں طرف اندر گلی میں واقع ہے۔ افسوس کہ اس مسجد کے بارے میں بھی شرپسندوں کی جانب سے وہی افواہیں پھیلائی گئیں جو عالمگیر کی بنوائی ہوئی دیگر مساجد کے بارے میں پھیلائی گئیں۔

اوپر متن میں شیوراتری کے موقع پر ہندوؤں کے درشن کی جو بات آئی ہے اس کی تاریخ یہ ہے کہ اس مسجد میں ابتداءِ تعمیر سے ہی ایک فوارہ تھا، جس کی وجہ سے یہ 'فوارے کی مسجد' سے مشہور ہوئی۔ حالانکہ سرکاری کاغذات میں آج بھی اس کا نام 'عالمگیری مسجد' تحریر ہے۔ اس فوارے سے متعلق علاقے کے کچھ فرقہ پرستوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یہ فوارہ نہیں بلکہ شیولنگ ہے، جس نے اس قدر طول پکڑا کہ ہندو مسلم جھگڑے کا باعث بن گیا۔ چنانچہ اس وقت کے حکمرانوں نے نہ معلوم کس بنیاد پر سال میں صرف شیوراتری کے موقع پر اہل ہنود کو اس کی پوجا پاٹ کی اجازت دے دی جو آج تک جاری ہے۔ ادھر ۱۸/اپریل ۲۰۰۶ء کو آندھی اور تند ہواؤں کے جھونکوں سے مسجد سے متصل ایک پیڑ کی ڈالی فوارے پر گر پڑی جس کی وجہ سے فوارہ ٹوٹ گیا جسے اہل ہنود شیولنگ قرار دے کر وہاں نیا شیولنگ لگانے کی بات کر رہے تھے، جبکہ مسلمان فوارہ کہہ کر نیا فوارہ لگانے پر مصر تھے۔ آخرکار فریقین کے مابین یہ تکرار بڑھتی چلی گئی جو فرقہ وارانہ انتشار کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ابھی افہام و تفہیم کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ان فرقہ پرستوں نے رات کی تاریکی اور علاقہ میں مسلم آبادی کے نہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مسجد کے حوض میں فوارے کی جگہ ایک نیا شیولنگ لا کر نصب کر دیا جس کے نتیجے میں مسلم عوام کے اندر اشتعال اور ہیجانی کیفیت پیدا ہونا یقینی تھا۔ اس نازک اور خطرناک صورت حال کے پیش نظر اس حقیر اور شہر کے کچھ امن پسند لوگوں کی بروقت مداخلت اور ضلع انتظامیہ کی اس شیولنگ کو جلد ہی ہٹانے کی یقین دہانی کی وجہ سے اس روز تو ہندو مسلم فساد ہونے سے بچ گیا، لیکن افسوس کہ ضلع انتظامیہ کی جانبدارانہ پالیسی اور یہاں کی مسلم عوام کی کچھ کمزوریوں کے نتیجے میں مذکورہ شیولنگ آج تک نہ ہٹایا جا سکا اور وہاں اس کی حسب سابق پوجا ہوتی ہے۔

اس وقت اس مسجد کا انتظام و انصرام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ لوگ حضرت مولانا مفتی نور اللہ مذکور کی دختری نسل سے ہیں جو مسلکاً شیعہ ہیں، حالانکہ حضرت مفتی صاحب حنفی سنی مسلک کے جید عالم تھے۔ ان کی نسل دختری کے ان موجودہ لوگوں نے کب اور کیوں شیعیت قبول کی، باوجود تحقیق کے معلوم نہ ہو سکا۔ افسوس کہ یہ مسجد نماز پنجگانہ سے محروم ہے، البتہ صرف نماز جمعہ کی ادائیگی ہوتی ہے اس وقت اس مسجد میں جناب مسرت حسین صاحب [صدر انٹرنیشنل ہیومن فورم] اور ان کے برادر جناب نصرت حسین صاحب مع اہل و عیال رہتے ہیں۔ ع ب نعمانی
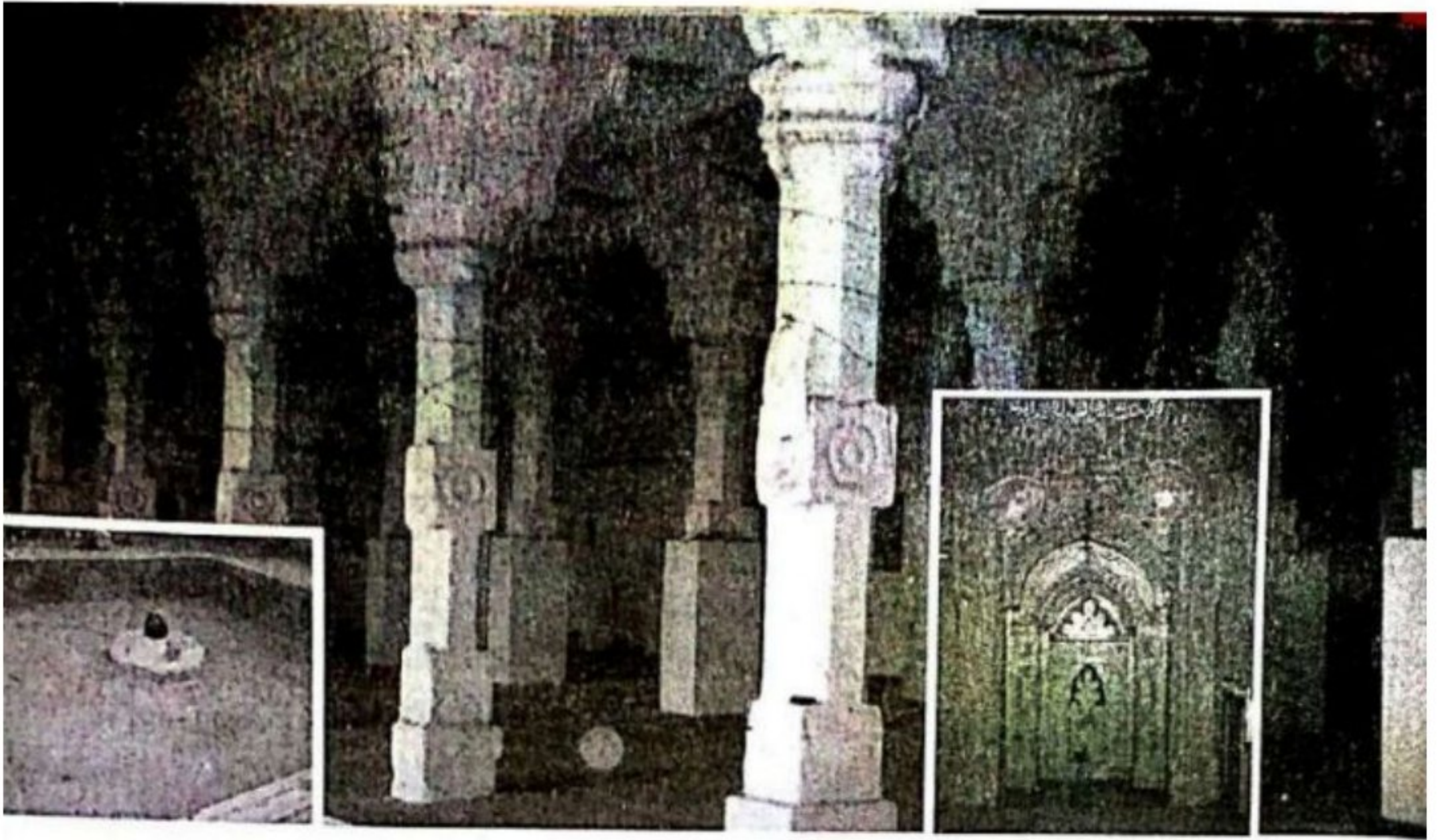
مسجد عالمگیری موسوم بہ مسجد فوارہ کا اندرونی منظر :
چوکھٹے میں محراب اور وہ قدیم حوض وفوارہ جہاں ۲۰۰۶ میں زبردستی شیولنگ نصب کیا گیا۔

ویران ہوجاتا ہے تو خدا کا گھر ہوجاتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ 'خراب شود' کا مطلب یہی ہے کہ جب بت خانہ خود ویران ہوجائے۔ ویران ہونے اور ویران کرنے کا فرق ظاہر ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے وقت بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کہ شکستہ بت خانہ کے ساتھ ساتھ مسجد کی بنیاد رکھی گئی، تا کہ یگانگت اور اتحاد برقرار رہے۔ مذکورہ کتبے سے کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ مسجد مندر توڑ کر بنائی گئی ہو۔

یہ مسجد ایک بڑے احاطے کے اندر ہے اور اس کا دروازہ ۱۲۷۲ھ میں تعمیر ہوا، جس پر کتبہ لگا ہوا ہے۔ 'مرقع بنارس' کے مصنف نبی احمد سندیلوی نے لکھا ہے کہ:

> "کہا جاتا ہے کہ اس جگہ کیرت مہیش دیو کا مندر تھا، جس کو توڑ کر مسجد بنائی گئی اور چونکہ حوض اور فوارہ متبرک مقام پر ہیں، اس لیے شیوراتری کے موقع پر ہندو اس کی پرستش کرتے ہیں۔ مسلمان باشاہوں کی ذہنیت سمجھنا مشکل ہے، اگر مندر برباد کیا گیا تو اس حوض اور فوارہ کو قائم رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مصنف چونکہ انگریزی دور کے ہیں، اس لیے وہ بھی اسی ذہنیت کا شکار ہیں جو انگریزوں نے پیدا کی تھی۔ جب کہ صرف افواہوں کو سند کے طور پر پیش کرنا فن تاریخ کے ساتھ ایک بڑی ناانصافی ہے[1]

---

[1] اس مسجد کے تعلق سے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اسلام کے عظیم مجاہد حضرت سید احمد شہید بریلوی [شہید ۱۲۴۶ھ] اپنے ایک تبلیغی دورے میں بنارس تشریف لائے تو اس مسجد میں بھی تشریف لائے تھے۔ یہ دورہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں ہوا تھا۔ رائے بریلی سے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے الہ آباد تشریف لائے، وہاں کچھ روز قیام کرنے کے بعد جب بنارس تشریف لائے تو اپنے مصاحبین اور رفقاء سے فرمایا کہ ''اس شہر میں تاریکی بہت معلوم ہوتی ہے'' لوگوں نے پوچھا کہ کس چیز کی تاریکی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''کفر وشرک کی تاریکی''۔ پھر جب شہر میں داخل ہوئے تو اس مسجد میں بھی تشریف لائے جو اس وقت بھی مدتوں سے ویران پڑی تھی، بہت سارے کوڑے اور گوبر وہاں جمع تھے۔ آپ نے انہیں صاف کرایا۔ مسجد دھلوائی اور اس میں قیام فرمایا۔ دوران قیام اس محلے کے کچھ مسلمانوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت بھی کی۔ دوران قیام دو دلچسپ مگر نصیحت آموز واقعہ بھی پیش آیا:

(۱) جب مسجد میں آپ ذکر وعبادت اور اصلاح وتبلیغ کا کام کر رہے تھے تو شہر میں ایک بڑا نامی گوشائیں رہتا تھا، جس کے بہت سارے چیلے تھے، گویا تمام ہندوؤں کا وہ گرو تھا۔ حضرت کی تشریف آوری سے اس کے دھیان گیان میں خلل واقع ہوا جس کا تذکرہ اس نے اپنے چیلوں سے اس طرح کیا کہ: ''اس شہر میں کئی دنوں سے ایک سید اترے ہوئے ہیں، ان کی نسبت کے پرتو سے ہمارا کاروبار درہم برہم ہوگیا ہے۔'' ادھر حضرت نے بھی اپنے لوگوں سے فرمایا کہ: ''اس شہر میں ہمارے آنے کے سبب گوسائیوں کے سحر اور استدراج کے کاروبار معطل اور بے کار ہوگئے ہیں''۔

(۲) اسی شہر میں ایک پیر صاحب تھے۔ انہوں نے سید صاحب کے آنے اور ان کی طرف لوگوں کو کثرت سے رجوع کرتے دیکھا تو انہیں غلط فہمی ہوئی کہ شاید یہ کچھ دنیاوی اغراض کے تحت آئے ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خادم کے ذریعہ کچھ تحفہ بھیجا اور کہلوایا کہ:

> ''یہاں آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ذرا بھی مفید نہ ہوگا، کیونکہ یہ لوگ ہمارے مرید ہیں اور یہاں کا دستور آپ کو معلوم نہیں، اگر آپ کچھ فتوحات حاصل کرنے آئے ہیں تو ہم سے آکر ملاقات کریں، ہم نے جو طریقہ بتلایا اسے اختیار کریں تب مقصد پورا ہوگا''

حضرتؒ کی اجازت سے ان کے ایک ہمراہی مولوی وحید الدین صاحب اس پیر کے گھر گئے اور گفتگو کچھ اس انداز سے کی کہ وہ پیر صاحب بہت متاثر ہوئے، حتیٰ کہ خود ہی چل کر مسجد مذکور میں آئے، تھوڑی گفتگو کے بعد پیر صاحب یوں گویا ہوئے:

> ''حضرت سلامت ہماری توجہ معاش یہ ہے کہ تمام مریدوں کے یہاں ششماہی مقرر ہے، کوئی ایک روپیہ، کوئی دو روپیہ، کوئی کم دیتا ہے کوئی زیادہ۔ اور یہ لوگ پیشہ ور ہیں، ان سے پنج وقتی نماز کہاں ہوسکتی ہے؟ اسی معافی میں یہ لوگ ہمیں ہر چھٹے مہینہ مقدور کے موافق کچھ زر نقد نذر کرتے ہیں مگر رمضان کے روزوں کی ہم ان کو بہت

[جاری.....اگلے صفحہ پر]

۳۔ مدرسہ حافظ امان اللہ حسینی:

حضرت مفتی نور اللہ حسینیؒ [متوفی ۱۱۰۴ھ] کے بیٹے حافظ امان اللہ حسینیؒ [متوفی ۱۱۳۳ھ] نے یہاں عربی کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو ایک جید عالم اور ملا محبّ اللہ بہاریؒ [متوفی ۱۱۱۹ھ] کے ہمعصر تھے۔ ملا محبّ اللہ بہاری نے اپنی کتاب 'مسلم الثبوت' میں حافظ امان اللہ کا تذکرہ جا بجا کیا ہے۔ افسوس کہ اب مدرسہ مذکور کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

حافظ امان اللہ بنارسی کی شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ عالمگیر نے ان کو لکھنؤ کا صدر الصدور مقرر کیا تھا۔ جس زمانے میں یہ مدرسہ قائم ہوا تھا اسی زمانے میں ہندوستان کے مشہور عالم اور درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ [متوفی ۱۱۶۱ھ]

———[بقیہ فٹ نوٹ]———

تاکید کرتے ہیں، اس میں جو کوئی عذر کرتا ہے کہ 'ہم حقہ پیتے ہیں، یا کوئی نشہ کھاتے ہیں، ہم سے روزہ نہیں رکھا جاتا تو ہم ان سے اس ششماہی کے علاوہ کچھ اور نقدی یا دو چار دھوتیں وغیرہ مقرر کر کے ان کو معاف کر دیتے ہیں، یہی ہم لوگوں کے گزران کی صورت ہے، اگر آپ کو کچھ فتوحات منظور ہوں تو اس کی یہی راہ ہے جو ہم نے بیان کی، اب آگے آپ کو اختیار ہے۔''

سید صاحب نے یہ تمام داستان سن کر فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں، فی الحقیقت اس وقت کے پیروں کا یہی دستور ہے، اور اسی آمدنی پر ان کی گزران ہے، مگر یہ طور قرآن وحدیث کے مخالف ہے، آپ بھی بغور اس کو دریافت کریں، اور ہم مسلمانوں کا طریق تو خدا، رسول کے فرمان کے موافق ہونا چاہئے، جو قرآن وحدیث کے موافق ہوں تو ہم اس کو عمل میں لائیں اور آپ بھی۔ اور جو کچھ خدا اور رسول کا طریق آپ کو معلوم ہو وہ آپ ہم کو تعلیم فرمادیں ہم سیکھیں اور جو کچھ ہم کو آتا ہے وہ ہم آپ کو بتلا دیں وہ آپ مان لیں۔ ہمارا مقصد تو یہی ہے اور روزی اور رزق تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ پیر صاحب نے کہا کہ بیشک یہی حق ہے جو آپ نے فرمایا، پھر وہاں سے اٹھے اور اجازت لے کر رخصت ہونے لگے اور کہا کہ پھر کسی وقت آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوں گا۔

جب رخصت ہوئے تو پہلے اپنے گھر گئے اور رات ہی رات مع اپنے اہل وعیال کے اس شہر سے کہیں اور چلے گئے۔ پھر ایسا غائب ہوئے کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ اس کی اطلاع اپنے کسی مرید کو بھی نہیں دی۔ بعد میں جب ان کے مریدوں کو اس قصے کی اطلاع ہوئی تو وہ سب ان سے بے اعتقاد ہو گئے اور سید صاحب سے بیعت کر لی اور کہا کہ 'ہم تو آج تک اسی کو دین اسلام اور خدا کی راہ جانتے تھے، جس پر وہ ہم کو چلاتے تھے، اب معلوم ہوا کہ ہم لوگ غلطی پر تھے، دین حق اور خدا کا طریق وہی ہے جو آپ تعلیم فرماتے ہیں، اب ہم نے ان سب اگلی باتوں سے توبہ کی۔ [سیرت سید احمد شہید۔ ۱/۱۸۶] ع ب نعمانی

نے بنارس آکر حافظ صاحب سے فن امور عامہ کا درس لیا۔ اس وقت بنارس کا یہ مدرسہ ہندوستان کا ایک مرکزی مدرسہ تھا۔ اغلب ہے کہ درس نظامیہ جو ملا نظام الدین کے نام سے منسوب ہے، بنارس ہی میں اس کی بنیاد رکھی گئی ہو۔

حضرت مفتی نور اللہؒ اور حافظ امان اللہ حسینیؒ کے تفصیلی حالات میری دوسری کتاب 'مشائخ بنارس' میں دیکھیں، یہاں پر ضمناً اتنا تذکرہ ناگزیر تھا۔

۴۔ مسجد قدم رسول تلیا نالہ:

اسی سنہ میں یعنی جلوس اورنگ زیب کے نویں سال ۱۰۷۷ھ م ۱۶۶۷ء میں محمد شریف حاکم بنارس کے وقت میں اس مسجد کی تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد محلّہ تلیا نالہ[1] میں واقع ہے، جو عرصہ دراز گزرنے کے بعد منہدم ہوگئی تھی پھر ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۸ء میں اس کی از سر نو مرمت ہوئی۔ مسجد کے اندر دیوار کے چاروں طرف اسی عہد کا یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

زہے بلند بنا مسجد شرف افزا — کہ حق پرست محمد شریف کردہ بنا
بنہ بسجدہ سرایں جا کہ آفتاب منیر — چو سربسجدہ بفرسود شد جہاں آرا
زرہ رواں توچہ راہ بہشت می پرسی — رہ ست بے خبرایں راست تا بہشت خدا
چہ سرمہ بست دریں کدام پائے — وچہ سرکہ بہرسجدہ شد سربرآستاں علا
بلندقدرے زہے افتادہ کہ بخاک ہمیں — کہ آفتاب نہد سرزپشت بام شما
شرفلزیو خاکی کہ شد بنا مسجد — سرش بعرش علامی رسدزتحت ثریٰ
نہ ہر کسے بگزردنہ سربخاک نہ چوں آب — کہ شد زلطف خدا خلق را حیات افزا
نہ بس کہ برہمہ داردبروزگار سراف — سخن بجبہہ مسجد نوشتہ شد بطلا
پئے دعا برآرید از آستینہا دست — امیدہست مرا ہم دعا زلطف شما
بسجدہ گاہ خدا را بجو کہ می یابی — کہ ہست سجدہ گہ مومنان مکان خدا

دلم چہ خواہش تاریخ کردیمنی گفت
'زہے بنائے مبارک مکان جو دخدا'
۱۰۷۷ھ

مسجد قدم رسول : اندرونی دیوار پر نقش اشعار

نقش قدم مبارک منسوب بہ حضرت رسول اللہ ﷺ

۵۔قدم رسول:

اس مسجد کے حجرہ میں ایک پتھر پر نشان موجود ہے جسے قدم رسول کا نشان بتایا جاتا ہے۔اس کا صحیح علم خدا کو ہے۔حجرہ کے دروازے پر محمد شریف ہی کے دور حکومت کا یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

دریاب جہاں قدر دولت اینجاست
نقش قدم ختم نبوت اینجاست

۶۔گلزار محل:

عالمگیر ہی کے عہد حکومت میں ۱۰۷۸ھ میں شاہ عبداللہ ایک خاندانی بزرگ اور درویش کامل نے محلہ تیلیا نالہ[1] میں گلزار محل کے نام سے ایک بستان سرائے تعمیر کرایا جو

---

[1] اس محلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں تیلی لوگوں کی ملیں تھیں، جن کا ایک بہت بڑا نالہ تھا جو ادھر تقریباً ۳۰ سال قبل تک نظر آتا تھا لیکن اب زمین دوز کر دیا گیا ہے۔ع ب نعمانی

اپنے وقت میں ایک اعلیٰ درجہ کا باغ تھا۔

وہاں ایک پتھر پر کندہ 'عراق بہشت' سے سال تعمیر ۱۰۷۸ھ نکلتا ہے جو کہ بالکل مٹ گیا ہے۔ موقع پر صرف ایک سنگین دروازہ باقی ہے[1]

۷۔ شائستہ منزل:

اسی سن میں عالمگیر کے ماموں امیر الامراء نواب شائستہ خاں[2] نے [جو پہلے دکن میں، پھر بنارس میں متعین ہوئے] راج گھاٹ میں ایک سنگین اور پختہ سرائے تعمیر کرائی جو شائستہ منزل کے نام سے موسوم تھی۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے سرائے تو بالکل ہی منہدم ہوگئی، البتہ جنوبی دروازوں اور دیواروں کا نشان باقی ہے۔ اس کے اندر ایک حمام بھی تھا جو ۱۸۷۷ء م ۱۲۹۴ھ میں توڑ دیا گیا اور اسی جگہ سے کاشی اسٹیشن جانے والی سڑک نکالی گئی۔

۸۔ عاشق اور معشوق کا مقبرہ:

بنارس کی سرزمین پر ایک ایسا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جو بنارس کی تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ عالمگیرؒ کے عہد حکومت میں ایک بنارسی نے جو عالمگیر ہی کے دور کے ایک جید عالم اور شاعر تھے، اس واقعہ کو اپنی کتاب 'مثنوی عشق' میں نظم کیا ہے۔ اور بستان السیاحۃ میں الحاج زین العابدین شیروانی نے بھی آج سے ۲۵۰ سال قبل اس واقعہ کو

---

[1] افسوس کہ اب وہ دروازہ بھی باقی نہ رہا۔ ع ب نعمانی

[2] آپ کا اصل نام مرزا ابو طالب تھا، شمس الدولہ آصف خاں کے بیٹے تھے، جس روز پیدا ہوئے شائستہ خاں کا خطاب ملا۔ جوان ہوکر کئی اہم معرکوں میں شریک ہوئے۔ عہد عالمگیری میں ہفت ہزاری [عہد مغلیہ میں ایک اعلیٰ منصب] کے عہدے سے سرفراز ہوکر صوبہ بنگال، دکن و اکبر آباد میں صوبہ دار ہوئے۔ پھر اسی اکبر آباد میں ۱۶ شوال ۱۱۰۵ھ کو ۹۳ سال کی عمر میں انتقال کیا اور جمنا ندی کے کنارے اپنے باغ میں دفن ہوئے۔ [وقائع عالمگیری، از نبی احمد سندیلوی۔ ص ۹۰] ع ب نعمانی

قدرے تبدیلی کے ساتھ درج کیا ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ بنارس میں عبدالصمد نامی ایک شخص بڑے عابدوزاہد ہونے کے علاوہ عالی خاندان اور شاعر بھی تھے۔ ان کو اپنے بیٹے محمد یوسف سے بڑی محبت تھی۔ اتفاق سے ان کو ایران کا سفر درپیش آیا اور حالات کچھ اس طرح کے پیدا ہو گئے کہ محمد یوسف کو وہ سفر میں نہ لے جا سکے۔ محمد یوسف آزادانہ سیر وتفریح کا مشغلہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ جہاں جی چاہتا چلے جاتے۔ اس زمانے میں ہر سال ساون کے مہینے میں ہر اتوار کو محلّہ سالار پورہ میں میلہ لگتا تھا۔ یوسف بھی ایک مرتبہ اس میلے میں گئے۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگے تو ایک مکان کی کھڑکی پر نظر پڑی جہاں ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے اور عشق کے تیر نے ایسا کاری ضرب لگایا کہ بڑی دیر تک وہیں کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں لوگوں کا ہجوم ہوا۔ لڑکی بھی وہاں سے ہٹ چکی تھی۔ یوسف کے ہوش وحواس بجا نہ تھے۔ چاروناچار مکان تو واپس آ گئے لیکن رات دن اسی لڑکی کا تصور چکر کاٹ رہا تھا۔ گویا ان کو بے پناہ عشق پیدا ہو گیا تھا۔ لڑکی کے والدین اور رشتہ داروں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ننگ وغیرت کی بنا پر مجبوراً محمد یوسف کے قتل کا ارادہ کیا، لیکن کچھ سوچ کر اس ارادۂ بد سے باز آئے۔ آخر میں یہ تجویز ہوئی کہ لڑکی گنگا کے اس پار کسی قرابت دار کے یہاں پہنچا دی جائے تا کہ ادھر محمد یوسف کی آمد ورفت بند ہو جائے۔ لڑکی ایک دایہ کے ہمراہ محافہ [پالکی] میں بٹھا کر دریا کے کنارے لائی گئی اور جوں ہی کشتی پر سوار ہوئی یوسف بھی وہیں آ پہنچے۔ ان کا عشق ان کو یہاں بھی لے آیا۔ آخر کرایہ دے کر یہ بھی کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی جب نصف دریا تک پہنچی تو دایہ نے یہ حکمت عملی کی کہ خفیہ طور پر لڑکی کی جوتی دریا میں ڈال دی اور شور مچانے لگی۔ پھر یوسف کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تمہیں صاحبزادی سے سچا عشق ہے تو جاؤ جوتی نکال لاؤ، ورنہ وہ ننگے پاؤں کیسے چلے گی؟ یوسف دایہ کا حکم سنتے ہی بے خطر دریا میں کود پڑے اور دریائے عشق میں اس طرح ڈوبے کہ کبھی باہر نہ آئے۔

اب لڑکی نے یوسف کے اس طرح ڈوبنے اور عشق ومحبت کی اس کیفیت کو دیکھا تو اس کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی یوسف کے ڈوبنے کا تصور، کبھی والدین اور اپنے عزیزوں کی رکاوٹیں۔ یہ سوچ سوچ کر وہ کانپ اٹھتی۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یوسف اب دنیا میں نہیں ہے، لیکن لڑکی سوچ رہی تھی کہ یوسف کے ساتھ میں بھی کیوں نہیں کود پڑتی؟

کچھ دن گزر گئے تو کشتی ہی کے ذریعہ لڑکی واپس آ رہی تھی۔ نصف دریا تک جب کشتی پہنچی تو لڑکی نے دایہ سے پوچھا کہ وہ نوجوان کہاں غرق ہوا تھا؟ دایہ نے قیاساً کچھ پتہ بتادیا۔ اتنے میں لڑکی بےتحاشہ دریا میں کود پڑی اور اس طرح اس نے یوسف پر جان قربان کر دینے کی مثال قائم کر دی۔

لڑکی کے والدین اور رشتہ داروں نے یہ خبر سنی تو بڑا واویلا مچایا، لیکن اب کیا ہوسکتا تھا؟ غوطہ خوروں کو دونوں کی لاش نکالنے پر مامور کیا گیا۔ تلاش بسیار کے بعد جب دونوں کی لاش نکالی گئی تو اس وقت یہ صورت تھی کہ یوسف کے ہاتھ پر لڑکی کا سر اور لڑکی کے ہاتھ پر یوسف کا سر تھا اور 'یک جان دو قالب' کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

محلّہ اورنگ آباد میں معمور گنج جانے والی سڑک کے پاس واقع ایک مسجد میں ان دونوں کا مقبرہ ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ مدفن عوام میں عاشق معشوق کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔

یوسف کے والد جب ایران سے واپس آئے تو متاسف ہوے۔ اور یہ چند اشعار لکھ کر مقبرہ کی چھت کے چاروں طرف کندہ کرادیے:

فرزند عزیز نور دیدہ — ناکردہ چراغ زندگانی تف
ایں عزیز در غم او — برمن گزرد بصد تاسف
یارب بحق حبیب پاکت — کان در حق اوکنی تلف
تاریخ وفات اوفرد گفت — "درخلد مدام بادیوسف"[1] ۱۰۸۶ھ

[1] قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عہد عالمگیرؒ کا ہے۔ ع ب نعمانی

عشق کا ایک اور عجیب وغریب واقعہ:

وہی ایرانی مصنف الحاج زین العابدین شیرازی بغرض سیاحت جب بنارس آئے تھے تو انہوں نے عشق ہی کا ایک اور واقعہ سنا جسے انہوں نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں نظم کیا ہے، اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''معزز ہندوؤں کے اکابر اور مسلمانوں کی بڑی شخصیتوں نے اس فقیر سے بیان کیا کہ اورنگ زیب ابن شاہجہاں کے زمانے میں خراسان کا ایک تاجر بے پناہ تجارتی مال ومتاع لے کر ہندوستان آ کر شہر بنارس میں وارد ہوا اور ایک ہندو لڑکی سے دل لگایا۔ اس کے پیچھے اتنا پڑا کہ ۴۰ دن رات تک معشوقہ کے کوچہ کی سیر کرتا رہا اور اس مدت میں نہ اس نے کچھ کہا نہ سنا۔ معشوقہ کا باپ یہ حال دیکھ کر اندیشہ میں پڑ گیا اور عاشق کے دفیعہ کی چارہ جوئی کرنے لگا اور ایک بوڑھی دایہ کو بلا کر اس نے کہا:

خانہ دل ما را از کرم عمارت کن
پیش ازاں کہ ایں خانہ زدنہد بہ ویرانی

یعنی قبل اس کے کہ میرا یہ گھر ویران ہو جائے اپنے کرم سے میرے دل کے گھر کو تعمیر کرو۔

دایہ نے کہا دل کو خوش رکھو اور رنجیدہ خاطر مت ہو، میں اس درد کی چارہ جوئی کروں گی اور تمہیں اس اندیشہ سے فارغ کر دوں گی۔ اس نے ترکیب یہ نکالی کہ جوں ہی عاشق ادھر سے گزرا، اس کو آواز دی اور کہا کہ تم کو موت مبارک ہو، تمہاری متاع حیات چھن گئی ہے اور صاحبزادی صاحبہ مر چکی ہیں۔ اس نے یہ خبر سنی اور دل سے ایک آہ سرد بھری۔

معشوقہ ہر روز صبح کو اپنے مذہبی رسوم کے مطابق اکڑتی ہوئی گنگا کے کنارے جاتی۔ دایہ کے اس کہنے کے دوسرے دن کی صبح کو حسب معمول جب وہ گئی تو اسے اپنا نامراد عاشق نظر نہ آیا۔ اپنے قریبی لوگوں اور رشتہ داروں سے پوچھا کہ اس شخص کو کیا ہو گیا اور اس کے اوپر کیا گزری؟ لوگوں نے بتایا کہ اس دردسر کو تم سے دور کر دیا گیا ہے اور اب وہ تم سے قریب نہ ہو سکے گا تا کہ تمہاری ننگ وغیرت کا غبار دل میں نہ لگ جائے

اور بدنامی سے تمہارا دل مکدر نہ ہو۔

معشوقہ نے یہ خبر سنی تو اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی، اس کا اندازہ وہی کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے دکھاوے کے لیے لوگوں سے کہا کہ تم لوگوں نے خوب کیا۔ حالانکہ وہ سراپا پیکر عشق بنی ہوئی تھی۔ اس کی محبت اور اس کا عشق ایک ہیجان پیدا کر رہا تھا اور عشق کی بھٹی اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ چند ہی دنوں میں اس کا چہرہ بھٹی کی طرح سیاہ ہو گیا اور اس تصور میں اس کی یہ حالت ہوئی کہ عاشق کے غم میں خود بھی مر گئی۔ ماں باپ نے جب یہ نتیجہ دیکھا تو آہیں لیں، نالے بھرے۔ گریہ وزاری اور چیخ وپکار کی آوازیں گھر میں گونج رہی تھیں، پھر اپنی مذہبی رسم کے موافق مردہ کی جگہ عود، صندل جلائے گئے، پھر معشوقہ جلادی گئی۔ اچانک اس جگہ سے آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا اور دو تین گھنٹے میں مکان میں پھیل گیا۔ ہم لوگ حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، جب شعلے بند نہ ہوئے تو لوگ اورنگ زیب کی خدمت میں عرضداشت لے گئے۔ اورنگ زیب نے چند عقلمند اور ماہر لوگوں کو بھیجا، ان سے بھی یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔ بالآخر دو مہینے تک برابر شعلہ اٹھتا رہا اور اس تماشہ کو دیکھنے کے لیے ہر وقت عوام کا ہجوم رہتا تھا۔

ایرانی عاشق دیوانہ وار جنگلوں میں پھر رہا تھا اور اپنی معشوقہ کی جدائی کا ماتم کر رہا تھا۔ اس کو جب یہ سن گن لگی تو اس جگہ پہنچ گیا، جہاں اس کی معشوقہ کی لاش سے شعلے برآمد ہو رہے تھے اس کا یہاں آنا تھا کہ شعلہ کی لپٹ میں چلا گیا۔ لوگوں نے ہر چند کوشش کی کہ اس کی لپٹ سے اسے بچالیں لیکن کوئی قابو نہ چل سکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عاشق بھی شعلہ کی لپٹ میں جل کر مر گیا۔"

[بستان السیاحۃ، مطبوعہ شیراز، چاپ دوم۔۱۲۴۰ھ]

نعمت خاں علی جو اورنگ زیب کا ناظم اور اس کے دربار کا دانش مند شاعر تھا، اس نے بھی اس حکایت عشق کو منظوم کیا ہے۔
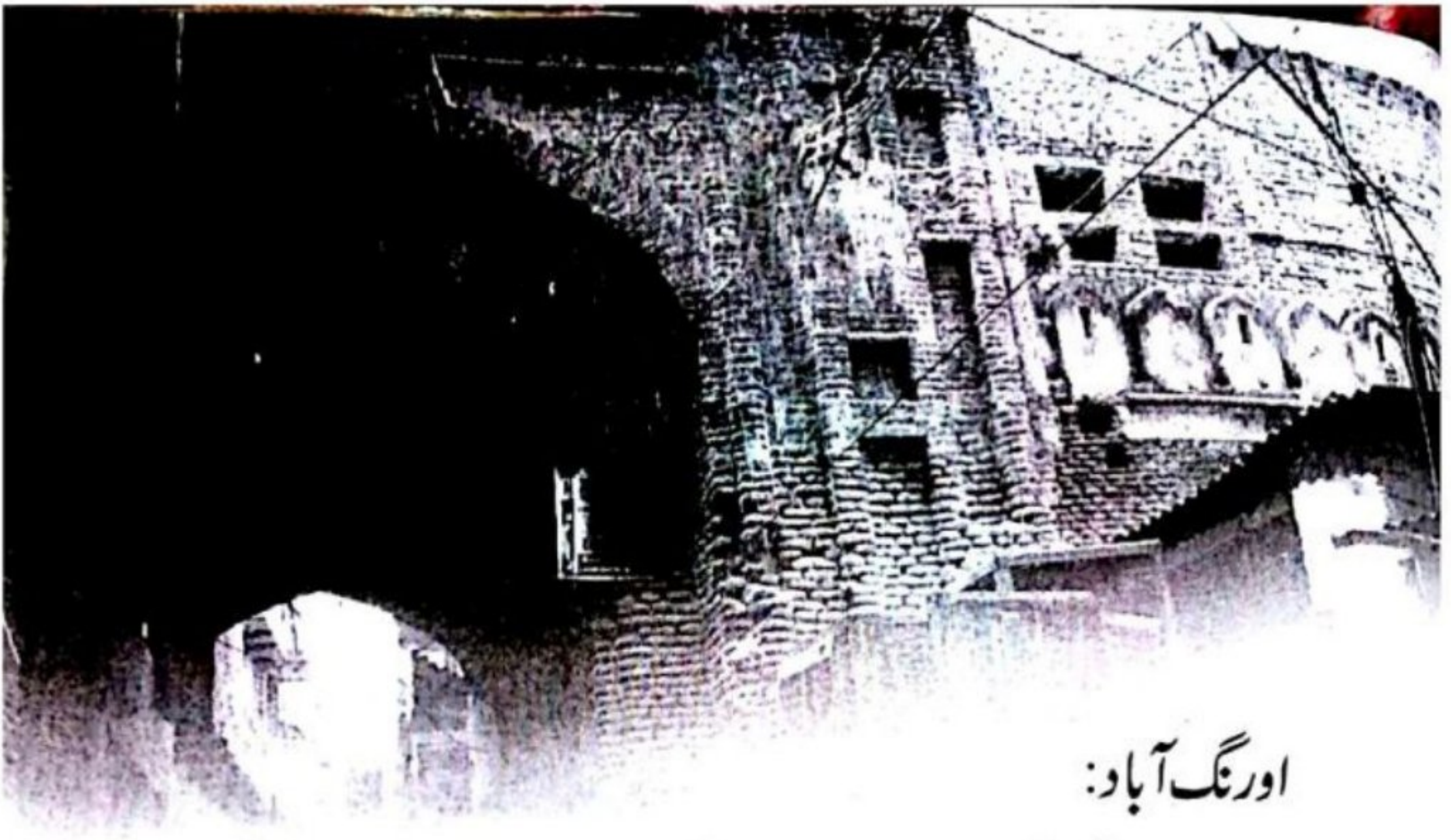
اورنگ آباد:

یہ محلہ اورنگ زیب ہی کے نام سے مشہور ہے اور اس میں مسافروں کے لیے ایک عالیشان سرائے بھی اسی عہد میں تعمیر ہوئی جو اب تک موجود ہے۔

اورنگ زیب کا انتقال:

تقریباً ۵۰ سال کی سلطنت کے بعد ۹۰ سال کی عمر میں اس بلند اقبال بادشاہ نے ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں انتقال کیا۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد ہی اس کے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ قتل وخون کی بھی نوبت آئی بالآخر شاہزادہ معظم بہادر شاہ کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔

بہادر شاہ اول:

شہزادوں کے آپسی جھگڑوں، پھر سکھوں اور راجپوتوں کی لڑائیوں سے عالمگیر کی سلطنت کو جو دھچکے لگے تھے، بہادر شاہ [معظم] نے بڑی حد تک ان کو سنبھالا، لیکن پانچ ہی برس کے بعد ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں انتقال کر گیا۔ تاہم اتنے دنوں میں ہی ملک کی اتنی حالت سنبھل گئی تھی کہ اگر اب بھی مغل شاہزادے اپنی سمجھ اور عقل سے کام لیتے تو صدیوں تک ان کی دھاک قائم رہ سکتی تھی۔

جہاندار اور فرخ سیر:

بہادر شاہ [معظم] کے انتقال کے بعد تخت و سلطنت کو لے کر اس کے بیٹوں کے درمیان پھر جھگڑے شروع ہوے۔ آخر کار بھائیوں کو ختم کر کے جہاندار شاہ ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ لیکن چند ہی دنوں میں دوسرے شہزادے عظیم الشان کے لڑکے فرخ سیر نے چڑھائی کی۔

۱۱۲۴ھ م ۱۷۱۲ء میں جہاندار اور فرخ سیر کے درمیان جنگ کی ابتدا ہوئی۔ فرخ سیر بنگال سے روانہ ہوا اور ۱۱۲۵ھ م ۲۸/اکتوبر ۱۷۱۳ء کو سید راجہ اور دوسرے روز مغل سرائے میں قیام کیا۔

اسی زمانے میں چھتری زمین داروں کو دبا کر بھومہار برہمنوں نے پرگنہ پنڈرا پر قبضہ کر لیا تھا اور رائے کر پارام وہاں کا خود مختار ہو گیا تھا۔ فرخ سیر نے اس سے ایک لاکھ کی پیشکش لے کر اس کو زمینداری کی سند دے دی اور خود چنار ہوتے ہوے الہ آباد اور فتح پور کی جانب چلا گیا۔

نواب معمور علی خاں ناظم اعلیٰ بنارس:

سلطان محمد فرخ سیر (مقتول ۱۱۳۱ھ م ۱۷۱۹ء) کے زمانہ حکومت ۱۱۲۴ھ م ۱۷۱۳ء میں نواب معمور خاں بنارس کے ناظم اعلیٰ تھے۔

معمور گنج:

یہ علاقہ انہی کے نام پر ہے اور اسی محلّہ میں ان کا مقبرہ بھی ہے[1]۔ نواب معمور خاں کا مکان حوض کٹورہ میں تھا اور یہیں ان کی عدالت بھی۔ حوض کٹورہ کی ایک عجیب وجہِ تسمیہ ہے:

---

[1] اسی محلے میں سڑک کے کنارے ایک مسجد بھی اُنہی کے نام سے موسوم ہے۔ صدر دروازے پر ایک کتبہ تحریر ہے جس پر سن تعمیر جدید ۱۹۴۰ء تحریر ہے۔ ع ب نعمانی

حوض کٹورہ:

نواب صاحب نے اپنے عالیشان مکان میں سنگ مرمر کا ایک حوض بنوایا تھا۔ایک روز عدالت برخاست ہونے کے بعد اپنے حاضرین و متوسلین کو حکم دیا کہ کل صبح اندھیرے میں ایک ایک کٹورہ دودھ سے بھر کر ہمارے حوض میں ڈال دیا جائے۔صبح کو جب نواب صاحب نے حوض ملاحظہ فرمایا تو بجائے دودھ کے پانی سے بھرا ہوا تھا۔چنانچہ سب کو حاضر کر کے دریافت کیا تو تمام لوگ شرمندہ ہوے اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہم میں سے ہر ایک آدمی اس دھوکے میں رہا کہ جب سبھی لوگ دودھ ڈال دیں گے تو ہمارا ایک کٹورہ پانی ظاہر نہ ہوگا۔مگر اتفاق سے ہر ایک نے یہی سوچا۔نواب صاحب نے اس صداقت بیانی پر سب کو معاف کر دیا۔اسی واقعہ سے منسوب کر کے اس محلّہ کا نام حوض کٹورہ پڑ گیا۔

اب حوض کٹورہ کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے۔نہ نواب صاحب رہے اور نہ یہ حوض باقی رہا۔

معمور گنج میں رتھ یاترا سے آنے والی سڑک کے دکھن جانب جس باغ میں نواب صاحب کا مزار ہے وہیں ان کے عزیزوں کی بھی قبریں ہیں۔باغ کے پچھّم طرف نیپالی باغ اور پورب طرف بنگالی باغ ہے۔اس باغ کے پھاٹک کے پچھّم طرف مسجد معمور شاہ ہے جو آباد ہے۔

مسجد پاکڑ تلہ محمد شہید:

سلطان محمد فرخ سیر ہی کے عہد میں ۱۱۲۶ھ میں یہ مسجد تعمیر ہوئی، محراب کے اوپر یہ کتبہ لگا ہوا ہے[1]:

باد باقی مسجد عالی بقا ساختہ مقبول از صدق وصفا
درزمان سلطنت فرخ سیر بادشاہ دیں پناہ با ذکا

---

[1] جدید تعمیر کے وقت یہ کتبہ وہاں سے منتقل کر کے صحن کی مغربی جانب اوپری حصہ میں نصب کر دیا گیا ہے۔ع ب نعمانی

سال تاریخش ندا از غیب داد
گفت ہاتف سجدہ ہر مردے خدا
۱۱۲۶ھ

۱۲۶۷ھ میں محمد حیات[۱] متولی ساکن محمد شہید نے اس مسجد کا دروازہ اور دالان وغیرہ تعمیر کرائی اور یہ کتبہ دروازے پر نصب کیا:

ایں باب شد بنا پے تاریخ دل شگفت
'در را اساس کردہ محمد حیات' گفت
۱۲۶۷ھ

۱۹۸۱ء میں اہل محلہ نے اس مسجد کو منہدم کر کے اس کی از سر نو تعمیر کر دی ہے جس سے اس کی عمارت تو نئی ہو گئی لیکن اس کی تاریخیت اور قدامت ختم ہو گئی۔

۱۱۳۱ھ م ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کی حکومت ختم ہو گئی اور یکے بعد دیگرے اس کے دو بھائی ابوالبرکات شمس الدین اور رفیع الدولہ بادشاہ کی حیثیت سے تخت پر بٹھائے گئے، لیکن پانچ ہی مہینے میں دونوں کا انتقال ہو گیا۔

محمد شاہ:

ان دونوں بھائیوں کے انتقال کے بعد محمد شاہ[۲] تخت پر بیٹھا، لیکن زیادہ دنوں تک وہ بھی نہ چل سکا۔ دکن کے سیدوں نے گرفتار کر کے ایک قلعہ میں اس کو بند کر دیا

---

[۱] آپ کا نام تو محمد حیات تھا، لیکن عوام میں حیاتن کے نام سے مشہور تھے۔ اسی طرح ان کے ایک بھائی نور محمد تھے، وہ نورن سے مشہور ہوے۔ ان دونوں بھائیوں کے خاندان کے لوگ بحمد اللہ آج بھی کثیر تعداد موجود ہیں جن میں نور محمد صاحب [نورن] کی پانچویں پشت میں جناب الحاج حافظ انیس الرحمن صاحب ساکن محمد شہید بنارس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اور یہ معلومات اُنھی سے فراہم ہوئیں۔ ع ب نعمانی

[۲] یہ عالمگیر کا پر پوتا اور مغلیہ سلطنت کا چودھواں بادشاہ تھا، اصل نام روشن اختر تھا، محمد شاہ کے لقب کے ساتھ جب وہ تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس کی عمر محض سترہ سال تھی۔ ع ب نعمانی

جہاں وہ پہلی محرم ۱۱۶۱ھ م ۱۱ / اکتوبر ۱۷۴۸ء کو انتقال کر گیا۔

۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کی حکومت ختم ہونے کے بعد بنارس، جون پور، غازی پور، چنار وغیرہ اس کے ایک مصاحب خاص مرتضیٰ خاں کو مل گئے جو بطور زمینداری تھے۔

پھر محمد شاہ نے اپنے دور میں نواب سعادت علی خاں نیشاپوری[1] [متوفی ۱۷۳۹ء] کو بنارس، اودھ اور جون پور کا صوبہ دار مقرر کیا اور نواب مرتضیٰ علی خاں سے یہ تمام علاقے سات کروڑ روپئے میں ۱۱۳۹ھ م ۱۷۲۷ء میں لے لیا کیونکہ ان کو اپنے علاقہ کے قرب وجوار سے بدنظمی کا شدید اندیشہ تھا۔

نواب سعادت علی خاں نے بھی بنارس میں بڑے علمی کارناموں کو انجام دیا، اور اسی مقصد سے علمی مرکز جون پور بھی گیا لیکن اس بنا پر کہ وہاں کے علماء اس سے ملنے نہیں آئے، خفا ہو کر چلا آیا اور یہاں تک حکم دے دیا کہ وہاں کی جاگیریں ضبط کر لی جائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً بیس مدرسے بند ہو گئے۔ بعد میں نواب سعادت علی خاں نے ان سب علاقوں کو آٹھ لاکھ روپئے میں اپنے دوست اور محکوم میر سید رستم علی کو دے دیا۔

میر سید رستم علی ناظم بنارس:

اپنے زمانے میں محمد شاہ نے میر سید رستم علی کو بنارس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا۔ یہاں کا میر گھاٹ انہی کے نام سے موسوم ہے اور وہیں ان کا قلعہ بھی تھا جو ۱۷۳۵ء میں تعمیر ہوا۔

مرزا محمد تقی خاں:

اسی عہد میں مرزا محمد تقی خاں ایران سے بنارس آئے۔ ان کے بھائی مرزا محمد شفیع کو نادر شاہ درانی [متوفی ۱۷۴۷ء] نے قتل کر دیا تھا۔ بلحاظ حفظ مراتب شاہی حاکم وقت میر سید رستم علی کی طرف سے ان کی عمدہ کفالت ہوئی۔ مرزا محمد تقی خاں کا مکان

---

[1] ان کا مختصر تعارف آگے کے صفحات میں آئے گا۔ ع ب نعمانی

والمنڈی اور گوبند پورہ کلاں میں تھا۔ان کا انتقال ۲۷رشوال ۱۱۷۵ھ میں ہوا اور فاطمان میں شیخ علی حزیں [متوفی ۱۷۶۶ء] کے مزار سے متصل دفن ہوے۔مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بتاریخ بست وھفتم شوال سنه یکھزار وصد و هفتادوپنج
هجری آقا محمد تقی محمد حسین برحمت پیو ست.

اس سے متصل ایک مزار اور بھی ہے، جو ان ہی کے خاندان کے کسی فرد کی ہے، لیکن نام درج نہیں ہے صرف اتنا لکھا ہے:

یا محمد　　یا علی

خدایا بریں تربت نامدار　　بمنت کہ باراں بباد و بہار
۱۸رذی الحجہ ۱۱۰۹ھ

شیخ علی حزیںؔ:

نادر شاہ درانی[۱] کے حملوں سے ایران پر یہ خراب اثر پڑا کہ بہت سے لوگ وہاں سے بھاگ کر ہندوستان چلے آئے۔مرزا تقی خاں کے بعد مشہور شاعر شیخ علی حزیںؔ بھی ہندوستان چلے آئے۔ایران سے چل کر ملتان اور لاہور میں قیام کرتے ہوے دہلی آئے، پھر وہاں سے جب بنارس آئے تو انہیں یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ یہیں کے ہو رہے۔

ع　پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ایران کا یہ زندہ دل شاعر بنارس ہی کا ہو کر رہا اور یہیں اس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا۔بنارس کے علاوہ اس نے اور کسی شہر میں رہنا پسند نہیں کیا۔چنانچہ

---

[۱] یہ ۲۲راکتوبر ۱۶۸۸ء کو خراسان میں درہ غاز کے مقام پر ایک خانہ بدوش گھرانے میں پیدا ہوا۔جب جوان ہوا تو مختلف سرداروں سے وابستہ ہو کر کئی جنگوں میں بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔بالآخر ۱۷۳۶ء میں ایران کا بادشاہ مقرر ہو گیا۔دوران بادشاہت جہاں اس نے مختلف علاقوں پر حملہ کیا، مارچ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان میں بھی بحیثیت فاتح داخل ہوا اور دو ماہ تک دہلی میں قیام پزیر رہا۔اس دوران دہلی میں خوب خون خرابہ اور قتل عام ہوا۔بالآخر اس نے ہندوستان تو چھوڑ دیا لیکن دو سو سال کی جمع کی ہوئی مغلیہ سلطنت کی دولت اور شاہجہاں بادشاہ کا مشہور اور نہایت قیمتی 'تخت طاؤس' اور 'کوہ نور' ہیرا اپنے ساتھ ایران لیتا گیا۔۱۹ جون ۱۷۴۷ء کو یہ قتل کر دیا گیا۔ع ب نعمانی [بحوالہ 'ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ' از: ثروت صولت]

حزیں کے کسی دوست نے جب انہیں ایران بلایا تو انہوں نے جواب میں یہ شعر لکھ دیا:

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا　　ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

حزیں اپنی رنگین مزاجی میں منفرد تھے، چنانچہ بنارس کی صبح کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

پری رُخان بنارس ہزار رنگا رنگ　　پے پرستش مہدیو چوں کنند آہنگ
بگنگ غسل کنند و بسنگ پا مالند　　زہے شرافت سنگ و زہے لطافت گنگ

حزیں ایک جید عالم بھی تھے۔ گو مذہب کے اعتبار سے شیعہ تھے، لیکن بنارس کے تمام لوگ ان کے حسن سلوک سے بڑے خوش تھے۔ ان کی ولادت اصفہان میں مورخہ ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۶۹۲ء کو ہوئی۔ والد کا نام ابوطالب جیلانی ہے۔ دادیہالی مورث اعلیٰ شیخ الاجل تاج الدین ابراہیم معروف بہ زاہد جیلانی ہیں۔ شیخ کے اجداد شہر استارا سے لاہجان وارد ہوئے جو گیلان کا عمدہ ترین شہر ہے۔

حزیں نے سیر و سیاحت اور کثرت مطالعہ سے اپنے علم و فضل میں اضافہ کیا۔ ایران میں افغانی حملوں کی بدولت جو بد نظمی پیدا ہوئی تو ان کا کتب خانہ بھی لٹ گیا۔ نادر شاہ جب دہلی پہنچا تو اس زمانے میں حزیں دہلی آچکے تھے۔ چنانچہ ایک قصیدہ اہل ہند کی ہجو میں لکھ مارا جس کی بنا پر شعراء دہلی کو حزیں سے مخالفت اور رقابت پیدا ہوگئی۔ اب دہلی میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور بنگال کا قصد کیا۔ راستے میں بنارس، عظیم آباد [پٹنہ] ٹھہرے، لیکن پٹنہ ہی سے وہ بنگال کا ارادہ فسخ کر کے بنارس آئے اور مستقل قیام کیا۔ اس زمانے کے باکمال لوگوں سے علوم و فنون حاصل کیے۔ فن شعر سے فطری مناسبت تھی۔ بچپن ہی میں اس کا شوق ہو گیا تھا۔ حالانکہ والد چاہتے تھے کہ یہ شوق چھوٹ جائے تاکہ طلب علم میں حرج نہ ہو، لیکن چونکہ یہ شوق فطری تھا اس لیے چھوٹ نہ سکا اور اس فن کے استاد کامل ہوگئے۔

حزیں ایک اچھے خوش نویس بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے چار دیوان تصنیف کیے اور چاروں اپنے ہاتھ سے خوش خط لکھ کر کتابی شکل میں تیار کیا۔ ان میں سب سے اعلیٰ نسخہ

خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں موجود ہے جس میں حزیں کی ایک رنگین مطلی تصویر بھی ہے۔

دوسرا نسخہ مہاراجا ریاست بنارس کے قلعہ رام نگر کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ دونوں نسخے میری نظر سے متعدد بار گزر چکے ہیں، لیکن افسوس کہ سن کتابت کہیں درج نہیں ہے۔ دیوان کی لوح پر حزیں نے یہ شعر لکھ کر اپنا دستخط کر دیا ہے:

زد نقش سخن سکہ جاوید بنامم　　　از صفحہ دلہا نشود محو کلامم

حزیں کی شاعری کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں، ہندوستان و پاکستان کا ممتاز تعلیم یافتہ طبقہ اس سے واقف ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب بلا وجہ طویل ہو جائے گی۔ مقصود صرف یہ ہے کہ بنارس کو حزیں سے کیا فائدہ پہنچا، یہ واضح کیا جائے۔

دال منڈی: شیخ علی حزیں کا قیام دال منڈی میں تھا جو اب شہر کا سب سے بڑا مرکزی حصہ ہو چکا ہے۔ دالمنڈی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس زمانے میں دال منڈی اور گوبند پورہ کلاں میں عام طریقے سے دال دلنے اور آٹا پیسنے کا کام ہوتا تھا۔ حزیں کو چکیوں کے چلنے کی آواز ناگوار معلوم ہوتی اور اس سے اس کے معمولات میں خلل واقع ہوتا تھا۔ چنانچہ اس پیشہ کے کرنے والوں کو جا کر منع کر دیا اور اس کے عوض میں اپنی جیب خاص سے سب کی تنخواہیں مقرر کر دیں۔

ایک بار بنارس میں قحط پڑا، حزیں نے اپنی جیب خاص سے حاکم بنارس کو بڑی مدد پہنچائی اور رعایا کے لیے غلہ کا محصول معاف کرایا۔

حزیں کی ایک بڑی دلچسپ وضع یہ تھی کہ کسی ملازم سے گفتگو نہیں کرتے تھے اور اشارہ و کنایہ سے کام نکالتے تھے۔ یہ وضع یہاں تک نبھائی کہ ایک رات کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھے، اچانک شمع کا گل گر پڑا، جس سے تمام فرش وقالین، مسند وسنجاب وغیرہ جل گئے۔ حزیں تنہا کتاب لے کر مکان سے باہر نکل پڑے نہ کسی کو آواز دی نہ کسی کو جگایا۔ بعض متوسلین نے عرض کیا کہ اتنا نقصان ہوا، آپ نے کسی کو اطلاع نہ دی۔ حزیں نے جواب دیا کہ ہمکلام ہونا عادت کے خلاف تھا۔ صرف اتنی بات کے لیے وضع کو ترک کرنا اور سوتوں کو جگانا گوارا نہ ہوا۔
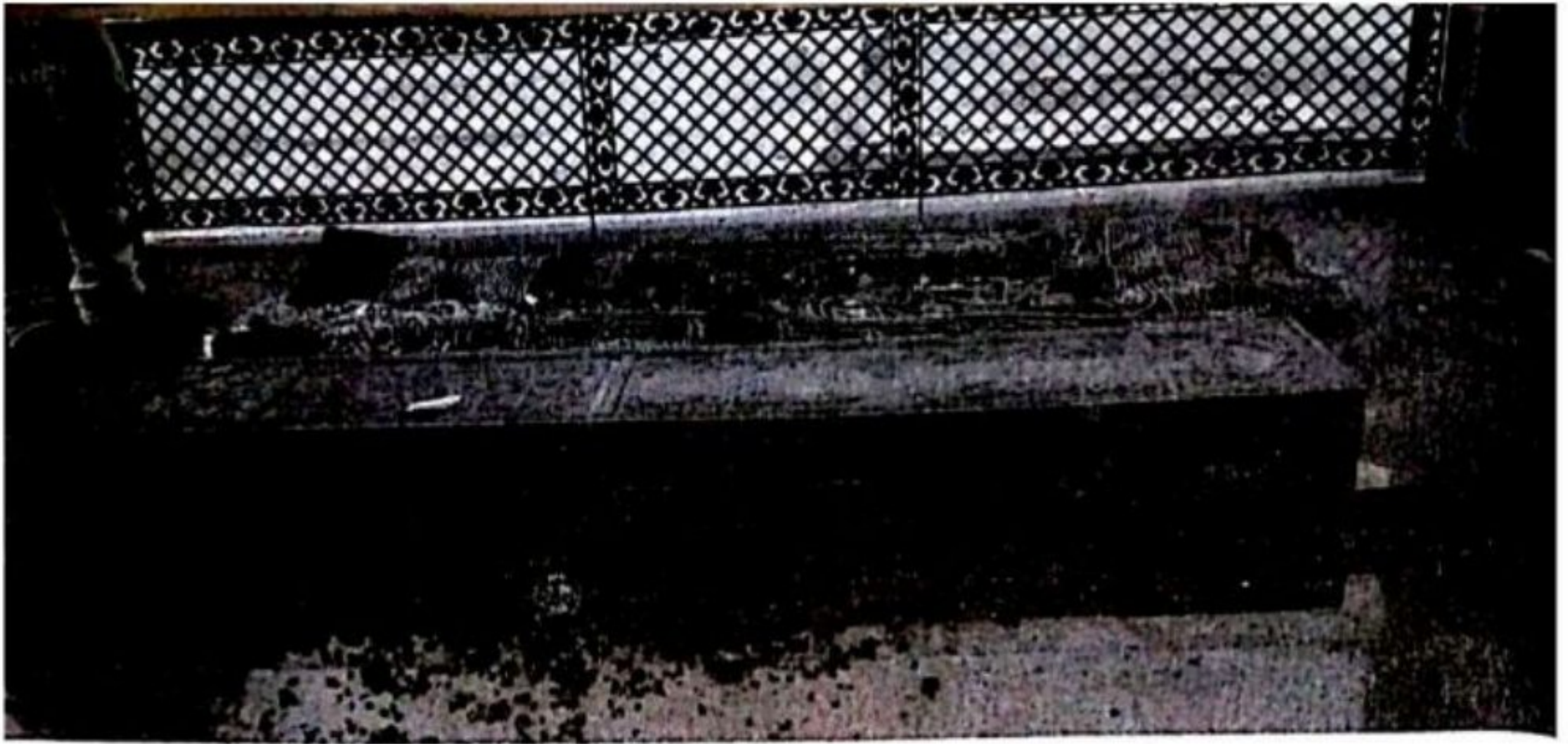
حزیں کی ایک وضع یہ بھی تھی کہ کسی سے نہ ملاقات کرنے جاتے اور نہ کسی کی تعظیم کے لیے اٹھتے۔ سوائے شاہ عالم کے آپ نے کسی کی تعظیم نہ کی۔ شاہ عالم خود ان کی قیام گاہ پر بھی آتے تھے۔

راجا بلونت سنگھ [متوفیٰ ۱۷۸۰ء] والی بنارس سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے یہاں تک کہ ان کے صغیر السن صاحبزادے راجا چیت سنگھ کبھی کبھی شیخ کے پاس آتے تو ان کو اپنے چاندی کے کھٹولے پر بٹھاتے۔

حزیں نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ م ۱۷۶۶ء میں وفات پائی۔ اور للا پورہ میں واقع فاطمان میں [جہاں اپنی قبر پہلے ہی سے تیار کرا دی تھی] مدفون ہوئے[1]۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ [متوفیٰ ۱۷۸۶ء] نے یہ تاریخ وفات لکھی ہے:

علامہ عصر و شاعر خوب   افسوس کز میانہ برخاست
تاریخ وفات او نوشتم   ازفوت حزیں حزیں دل ماست
۱۱۸۰ھ

لوح مزار پر خود انہیں کے ہاتھ کی تحریر کردہ یہ عبارت:

یامحسن قداتاك المسیء العبدا لراجی الیٰ رحمة
ربه محمد المدعو بعلی بن ابی طالب الجیلانی

کندہ ہے۔ اس کے نیچے یہ تین شعر درج ہیں:

زباں دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم   ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پاے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم   سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا
روشن شد از وصال تو شب ہاے تار ما   صبح قیامت است چراغ مزار ما[۲]

مولانا رضا علی بنارسیؒ [متوفی ۱۳۱۲ھ] نے اوپر کے پہلے مصرعہ سے مختلف طریقوں پر ۷ طور سے شیخ کی تاریخ وفات نکالی ہے اور اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تحریر کیا ہے جو قابل دید ہے۔

حزیںؔ کو فارسی کے علاوہ عربی شاعری پر بھی مکمل قدرت حاصل تھی، لیکن افسوس کہ فارسی داں حلقہ چوں کہ عموماً عربی سے ناواقف ہوتا ہے، اس لیے یہ بھی اس کے لیے ایک نئی بات معلوم ہوگی۔ چنانچہ حدیقة الافراح یمنی شروانی میں شیخ علی حزیںؔ کا ایک عربی قصیدہ لامیہ حضرت علیؓ کی مدح میں درج کیا گیا ہے۔

تصنیف وتالیف بھی حزیں کا خاص ذوق تھا، چنانچہ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

واقعات سرگزشت : یہ خود انہی کی خودنوشت سوانح حیات ہے جس کو انہوں نے بنارس کے زمانہ قیام میں لکھی تھی، اور مفاد ہند پریس بنارس میں ۱۸۵۱ء میں چھپ چکی ہے۔

سوانح حزیںؔ: اس کتاب میں دہلی کے زمانہ قیام میں انہوں نے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔

شرح حال: ۱۱۵۴ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔

تذکرۃ المعاصرین :۱۱۶۵ھ میں لکھی۔ یہ دونوں کتابیں اپنے معاصر شعراء کے حالات میں ہیں جواب تک طبع نہ ہوسکیں۔

---

[۱] ۱۹۹۴ء میں الحاج سید قمر حسین رضوی [متوفی ۲۰۰۸ء] کے عہد تولیت میں شیخ کے مقبرہ کو تعمیر نو سے آراستہ کردیا گیا ہے۔ اس وقت فاطمان کے موجودہ متولی جناب عباس حسین رضوی عرف شفق ہیں۔ ع ب نعمانی

[۲] آخر عمر میں حزیںؔ کو بنارس چھوڑ کر اپنے آبائی وطن جانے کا خیال پیدا ہوا، لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ مشہور ہے کہ اسی اثناء میں انہوں نے حضرت سیدنا امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں "حزیں! تم یہیں رہ جاؤ" مذکورہ بالا تینوں اشعار اسی موقع پر کہے اور بنارس ہی کو اپنا مسکن دائمی قرار دیا۔ [تاریخ بنارس۔ ۱/۲۷] ع ب نعمانی

تذکرہ شعراء: یہ شعراء کا ایک ضخیم تذکرہ ہے، اور ندوہ کے کتب خانے میں یہ بھی موجود ہے علامہ سید سلیمان ندویؒ [متوفی ۱۹۵۳ء] نے اس پر یہ یادداشت لکھ رکھی ہے:

"مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کے کتب خانہ واقع حبیب گنج علی گڑھ میں حزیں کی مطبوعہ کلیات کے علاوہ اور بھی دو ضخیم کلیات ہیں۔ مولانا مرحوم نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بیالیسویں اجلاس منعقدہ بنارس کے موقع پر 'بنارس اور حزیں' کے عنوان سے ایک بڑا جامع اور علمی خطبۂ صدارت پڑھا تھا جو مولوی مقتدا خاں شیروانی کے اہتمام سے شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ میں چھپ گیا ہے اور اب بھی دستیاب ہوسکتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کا ایک خط مولانا ابوالکلام آزاد کے نام 'کاروان خیال' میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے مولانا آزاد کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے شعر العجم میں حزیںؔ کا تذکرہ نہیں کیا۔ کاش حزیںؔ کا یہ شعر ان کے کان میں پہنچ جاتا:

کیفیت صہباست بجام سخن من
اے بادہ گساراں برسانید دماغے"

اسی طرح ایک رسالہ 'عملیات' میں بھی لکھا ہے، جو حکیم محمد صادق مرحوم ساکن دلہی پور [ضلع چندولی] کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ کئی کلیات و دیوان بھی ہیں جن میں 'کلیات حزیں' کی دو جلدیں بمبئی سے طبع ہو چکی ہیں۔

مولانا آزاد بلگرامیؒ سے حزیںؔ کی ملاقات بھکر [سندھ] کے علاقہ میں ہوئی شیخ ایران سے ہجرت کر کے آرہے تھے۔ بھکر میں شیخ نے اپنے قلم سے چند اشعار لکھ کر مولانا کے حوالے کیا۔ شیخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک دیوان بھی مولانا کو ایک شخص سے مل گیا۔ اس سے آپ نے چند اشعار اپنی کتاب 'مآثر الکرام' دفتر دوم میں نقل کیے ہیں۔

خود حزیںؔ کے اوپر بھی کئی کتابیں لکھی گئیں، جن میں منشی غلام حسین خان آفاق

بنارسی [ملازم قدیم دربار بنارس] کی 'تذکرہ حزیں' خاص طور سے قابل ذکر ہے، جو الناظر پریس لکھنؤ میں ۱۹۱۷ء میں طبع ہو چکی ہے۔

مسجد فاطمان، ایوان و شہ نشین:

حزیں نے فاطمان کے اندر ایک مسجد، ایوان اور شہہ نشین بھی تعمیر کرائی جو آج بھی اس کی یادگار ہیں۔ مسجد ۱۱۶۷ھ میں تعمیر ہوئی، جس کی یہ تاریخ محراب میں کندہ ہے:

جبہہ برخاک نہ دریں مسجد — کہ برائے عبادت است اینجا
بہر تاریخ ایں بنا ہاتف — گفت 'درگاہ حاجت است اینجا'
۱۱۶۷ھ

فاطمان کی یہ مسجد شہر کے ایک نامور خاندانی طبیب حکیم ابوعلی محمد جعفر صاحب[1] نے ۱۳۳۶ھ میں دوبارہ تعمیر کرائی اور یہ کتبہ نصب کرایا:

آں محمد جعفر عیسیٰ نفس — بانی مسجد شد از لطف کریم
مصرعہ تاریخ باشد حسب حال — حکمت نیک است ایں فعل از حکیم
۱۳۳۶ھ

رانی بھوانی بنگال[2]:

سلطان محمد فرخ سیر [م ۱۷۱۹ء] ہی کے زمانے میں بنگال کی رانی بھوانی

---

[1] آپ بنارس کے مشہور طبیب حکیم محمد کاظم صاحب [متوفی ۱۹۸۸ء] کے والد محترم اور مشہور شاعر جناب ناظم جعفری کے دادا تھے۔ مذکورہ بالا فارسی کے اشعار مرزا محمد حسن فائز بنارسی [متوفی ۱۳۴۷ھ] کے ہیں۔ ع ب نعمانی

[2] یہ صوبہ بنگال کے ضلع بوگرا میں ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی اس وقت کے ایک بڑے زمیندار راجا رام کنٹھ سے ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد یہ اس کی جانشین اور ناٹور کی ملکہ منتخب ہوئیں۔ یہ ایک بہترین تنظیمی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ ہول ویل (HOLWELL) کے مطابق ان کے دور حکومت میں شاہی محصول جو پہلے ستر لاکھ روپے تھا، وہ بڑھ کر ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ گیا تھا۔ تعلیم، رفاہی کاموں اور عوامی فلاح و بہبود سے انہیں کافی دلچسپی تھی۔ غرض انہوں نے اپنے چالیس سالہ دور حکومت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے لیے ایک طویل عرصہ درکار تھا۔ کلکتہ کا بھوانی پور علاقہ انہی کی طرف منسوب ہے۔ ۱۸۰۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

بنارس آئیں اور بنارس میں بہت سے تالاب ،گھاٹ اور لنگر خانے بنوائے۔انہی تالابوں میں ایک تالاب عیدگاہ لاٹ کا بھی ہے۔اس طرح انہوں نے بنارس والوں پر بڑے احسانات کیے۔

سلطان مجاہدالدین ابوالنصر احمد شاہ:

محمد شاہ کے قلعہ میں بند کیے جانے اور وفات کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔اگر اس کے اندر کچھ بھی ہمت وصلاحیت ہوتی تو یہ سلطنت سنبھالنے کا موقع تھا۔مگر محمد شاہ عیش وآرام کا دلدادہ تھا اسی لیے وہ رنگیلے شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت جس کی بنیادیں پہلے ہی سے ہل چکی تھیں، اب اور بھی کمزور ہوگئیں۔مرہٹوں کی لوٹ مارنے سارے ملک میں ایک آفت مچادی۔ایران سے نادر شاہ کے چند باغی ہندوستان آئے۔نادر شاہ نے لکھا کہ باغیوں کو واپس کرو،لیکن یہاں رنگ رلیوں سے فرصت ہی کہاں تھی۔غصہ میں نادر شاہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء میں ہندوستان آیا۔آصف جاہ[1] نے بیچ میں پڑ کر معاملہ سلجھانا چاہا،لیکن اودھ کے صوبے دار برہان الملک نے بھڑا دیا اور دہلی میں خون کی

---

[1] دہلی کی مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی جو خودمختار ریاستیں برصغیر میں قائم ہوئیں ان میں سب سے بڑی اور پائیدار حیدرآباد دکن کی مملکت آصفیہ تھی۔ یہ آصف جاہ اسی مملکت کے بانی تھے۔ان حکمرانوں نے کبھی بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا۔خود کو نظام کہلاتے تھے اور جب تک آزاد رہے مغل بادشاہوں کی بالادستی تسلیم کرتے رہے۔

نظام الملک آصف جاہ کا اصل نام میر قمرالدین تھا اور ان کے اجداد کا تعلق ترکستان سے تھا۔آصف جاہ کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو سلطنت مغلیہ کے زوال کو روک سکتی تھیں۔چنانچہ جب انہیں محمد شاہ کے زمانے میں ۱۷۲۱ء میں ہندوستان کا وزیر اعظم بنایا گیا تو انہوں نے اس کے زوال سے بچانے کے لیے ضروری اصلاحات کیں،لیکن خود بادشاہ اور اس کے نااہل مصاحبین نے بدقسمتی سے ان کی اصلاحات میں رکاوٹیں ڈالنی شروع کیں تو یہ بددل ہوکر حیدرآباد چلے گئے جہاں کہ ۶ صوبوں کا انہیں صوبہ دار بنایا گیا تھا۔یہاں انہوں نے ایک خودمختار حکمراں کی حیثیت سے ۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء شاندار حکومت کی۔ان سب کے باوجود یہ مغل بادشاہ کا اتنا خیال کرتے تھے کہ اس کے حکم پر دہلی پہنچ جاتے۔چنانچہ نادر شاہ کے حملے کے موقع پر انہوں نے دہلی جا کر مغل بادشاہ کے حقوق کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی۔یکم جون ۱۷۴۸ء کو برہان پور میں ان کا انتقال ہوا اور اورنگ آباد کے قریب خلدآباد میں شیخ برہان الدین چشتی کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ع ب نعمانی [ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ]

ہولیاں کھیلی گئیں۔اس حملہ کے بعد مغلوں کا اثر ختم ہوگیا اور محمد شاہ کا ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء میں انتقال ہوگیا۔ پھر اس کا لڑکا احمد شاہ یکم ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ کو تخت پر بیٹھا، لیکن ۱۱۶۷ھ م ۱۷۵۴ء میں اس کو تخت سے اتار کر قید میں ڈال دیا گیا اور معظم شاہ [متوفی ۱۷۱۲ء] کے پوتے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا دیا گیا۔

برہان الملک سعادت خان حاکم بنارس[۱]:

محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں نیشاپور کا ایک سپاہی سعادت خاں داخل ہوا جس کا اصل نام تو محمد امین تھا لیکن ہندوستان آکر اس کا نام سعادت خاں ہوگیا، پھر شاہی دربار سے برہان الملک کا خطاب عطا ہوا۔ نادر شاہی قتل عام کا جو ہولناک واقعہ پیش آیا اس کی ساری ذمہ داری اسی کے سر عائد ہوتی ہے۔

محمد شاہ رنگیلے نے اس کو اپنے زمانہ حکومت میں ۱۷۱۹ء میں اودھ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ چنانچہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ [متوفی ۱۷۸۶ء] تحریر فرماتے ہیں:

> ''چوں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری درآغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ شد و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد و نیز مثل دارالخیور جون پور، بنارس، غازی پور، کٹرہ، مانک پور وکوڑہ جہان آباد وغیرہ ضمیمہ حکومت گردید۔'' [مآثر الاکرام۔ص ۲۲۱]

اس سے معلوم ہوا کہ بنارس بھی نواب سعادت خاں کی حکومت کے ضمیمہ میں داخل ہو گیا۔اس حاکم نے تمام وظائف بند کردیے اور مخلوق کو بڑی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ ۱۱۵۱ھ م ۱۷۳۹ء میں اس نے وفات پائی۔

---

[۱] یہ سلطنت اودھ کا بانی تھا، اودھ میں اس کا دور حکومت ۱۷۳۱ء تا ۱۷۳۹ء ہے۔ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۹/۳/۱۷۳۹ء کو وفات پائی۔اس کے والد میر محمد نصیر شاہ مغل دور میں وطن کو خیر باد کہہ کر ہندوستان آئے تھے۔ [اودھ کا بیان۔ص ۱۷، تواریخ اودھ، ص ۱۰] ع ب نعمانی

نواب صفدر جنگ حاکم بنارس:

یہ برہان الملک سعادت خاں کا بھانجہ اور داماد تھا[1] جس کو احمد شاہ رنگیلے کے دربار سے ابوالمنصور صفدر جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا، پھر محمد شاہ رنگیلے نے اس کو اپنے زمانے میں ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء میں بنارس کا حاکم مقرر کیا۔ یہ صرف محمد شاہ کی سلطنت کی مدت تک بنارس کا حاکم رہا۔

سلطان عزیز الدین عالمگیر ثانی:

معظم شاہ کا پوتا عالمگیر ثانی[2] تخت نشین ہوا، ۔ادھر نادر شاہ کے مرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی[3] نے افغانستان اور پنجاب پر قبضہ کر لیا اور اسی عالمگیر ثانی کے زمانے میں وزیر غازی الدین نے پنجاب پر قبضہ کرنا چاہا۔لیکن احمد شاہ نے بڑھ کر روک تھام کی اور نجیب الدولہ[4] کو اپنا نائب بنایا اور دہلی کی بادشاہت شاہ عالم ثانی[5] کو سپرد کر کے واپس ہوا۔

---

[1] یہ ۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا، اصل نام محمد مقیم تھا۔ برہان الملک سعادت خاں کے انتقال کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ ۱۷۵۶ء میں انتقال ہوا۔ [تاریخ اودھ۔ص ۱۲] ع ب نعمانی

[2] یہ جہاندار شاہ کا بیٹا تھا، ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوا، ۷ اد سمبر ۱۷۵۹ء میں انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی

[3] اس کا پورا نام احمد خان ابدالی تھا۔ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام محمد زماں خان ابدالی تھا۔ یہ نادر شاہ درانی کا جنرل، افغانوں کے ابدالی قبیلے کا سردار اور افغانستان میں ابدالی سلطنت کا بانی تھا۔ نادر شاہ کی موت کے بعد افغانستان کا بادشاہ بنا۔ 'ہرات' اور 'مشہد' پر قبضہ کیا۔ ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۷ء تک اس نے ہندوستان پر کئی ایک حملے کیے جن میں سب سے مشہور حملہ ۱۷۶۱ء کا ہے۔ جس میں اس نے مرہٹوں کو پانی پت کی لڑائی میں شکست دی۔ ۱۷۵۶ء میں دہلی کو تاخت و تاراج کیا اور بہت سا مال غنیمت لے کر واپس چلا گیا۔ ان حملوں نے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی۔ پنجاب میں سکھوں کے فروغ کا سبب احمد شاہ ابدالی کے یہ پے در پے حملے بھی ہیں۔ اس کا دور حکومت ۱۷۴۷ء سے ۱۷۷۳ء تک ہے۔ ۱۷۷۳ء میں اس نے افغانستان میں وفات پائی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[4] یہ افغان کے رہنے والے تھے، ۱۷۳۹ء میں ہندوستان آئے۔ شروع میں مغل حکمرانوں کے ساتھ رہے۔ بعد میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہو گئے۔ ضلع بجنور کا مشہور شہر 'نجیب آباد' آپ ہی کا آباد کردہ اور آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ ۱۷۷۰ء میں آپ کا انتقال ہوا اور نجیب آباد میں ہی دفن ہوئے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[5] اس کے دور میں برطانوی حکومت عروج پذیر ہو رہی تھی، چنانچہ اس کا پورا دور حکومت برطانوی حکومت کی کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء میں لال قلعہ میں اس کا انتقال ہوا اور دہلی میں واقع مہرولی میں دفن ہوا۔ ع ب نعمانی [ہندوستان میں اسلامی حکومت]

راجا بلونت سنگھ:

سلطان عزیز الدین عالمگیر ثانی، پھر سلطان جلال الدین عالی گوہر شاہ عالم کے زمانے میں ۱۱۵۴ھ م ۱۷۴۹ء سے ۱۱۸۴ھ م ۱۷۷۰ء تک راجا بلونت سنگھ ریاست بنارس کے حکمراں تھے۔ ان کے دو دیوان تھے:

۱۔ دیناناتھ: جن کے نام سے بنارس میں گولہ دیناناتھ مشہور ہے۔

۲۔ ڈھونڈھا بھگت: جن کے نام سے دیوان گنج اور دیوان گھاٹ ہے۔

لعل خاں:

یہ راجا بلونت سنگھ والی بنارس کے خاص مصاحب اور سپہ سالار تھے۔ نسلاً افغانی اور مسلکاً شیعہ تھے۔ سفارت کا کام بھی انہی سے متعلق تھا۔ کچھ عرصہ جونپور میں حاکم بھی رہ چکے تھے۔ حسن تقریر اور ان کے آداب شاہی سے راجا بہت خوش تھے۔

لعل خاں سخاوت میں مشہور تھے۔ تین سو سے زیادہ اشخاص روزانہ ان کے دسترخوان سے کھانا کھاتے تھے اور روزانہ دو سو فقیروں کو ایک روپیہ سے لے کر پانچ روپے تک نقد تقسیم کرنے کا بھی معمول تھا۔

حضرت شاہ لکڑ:

یہ اسی زمانے میں ایک درویش بزرگ تھے۔ ان کی ایک کرامت اب تک عوام میں مشہور ہے کہ راج گھاٹ سے متصل محلّہ بھدؤں میں 'پیر میاں کی مسجد' میں لکڑی کا ایک شہتیر تھا جس پر انہوں نے ہاتھ رکھ کر فرمایا 'تجھے صرف جنگل ہی میں بڑھنا تھا؟ یہاں کیوں نہیں بڑھی؟' یہ فرمانا تھا کہ لکڑی بڑھ گئی، کیونکہ وہ چھوٹی تھی۔

لعل خاں کو ان بزرگ سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کا مزار بھی راج گھاٹ میں نواب شائستہ خاں[1] کی بنوائی ہوئی سرائے کے قریب ہے اور قبہ کے اندر واقع ہے۔ مسجد
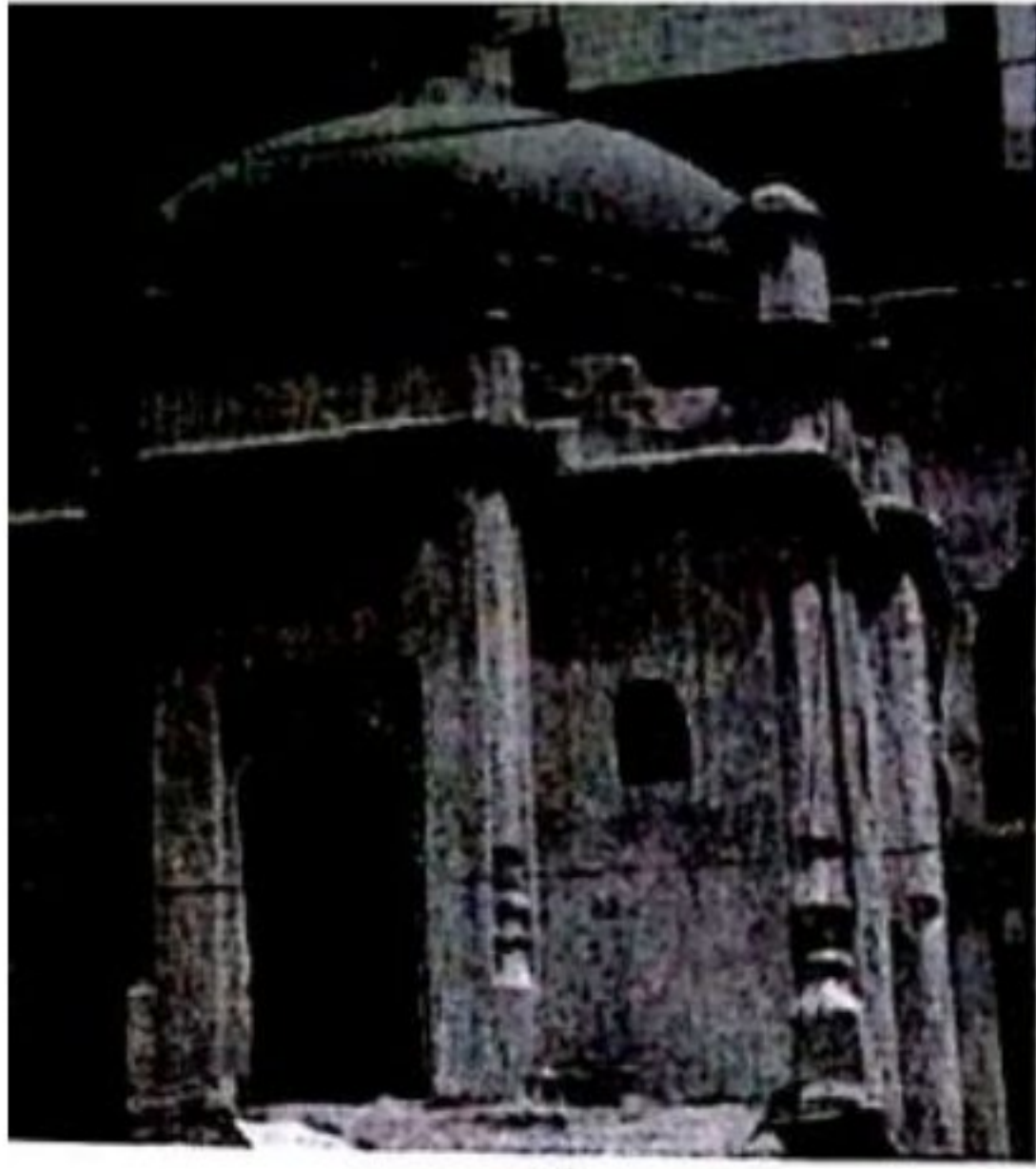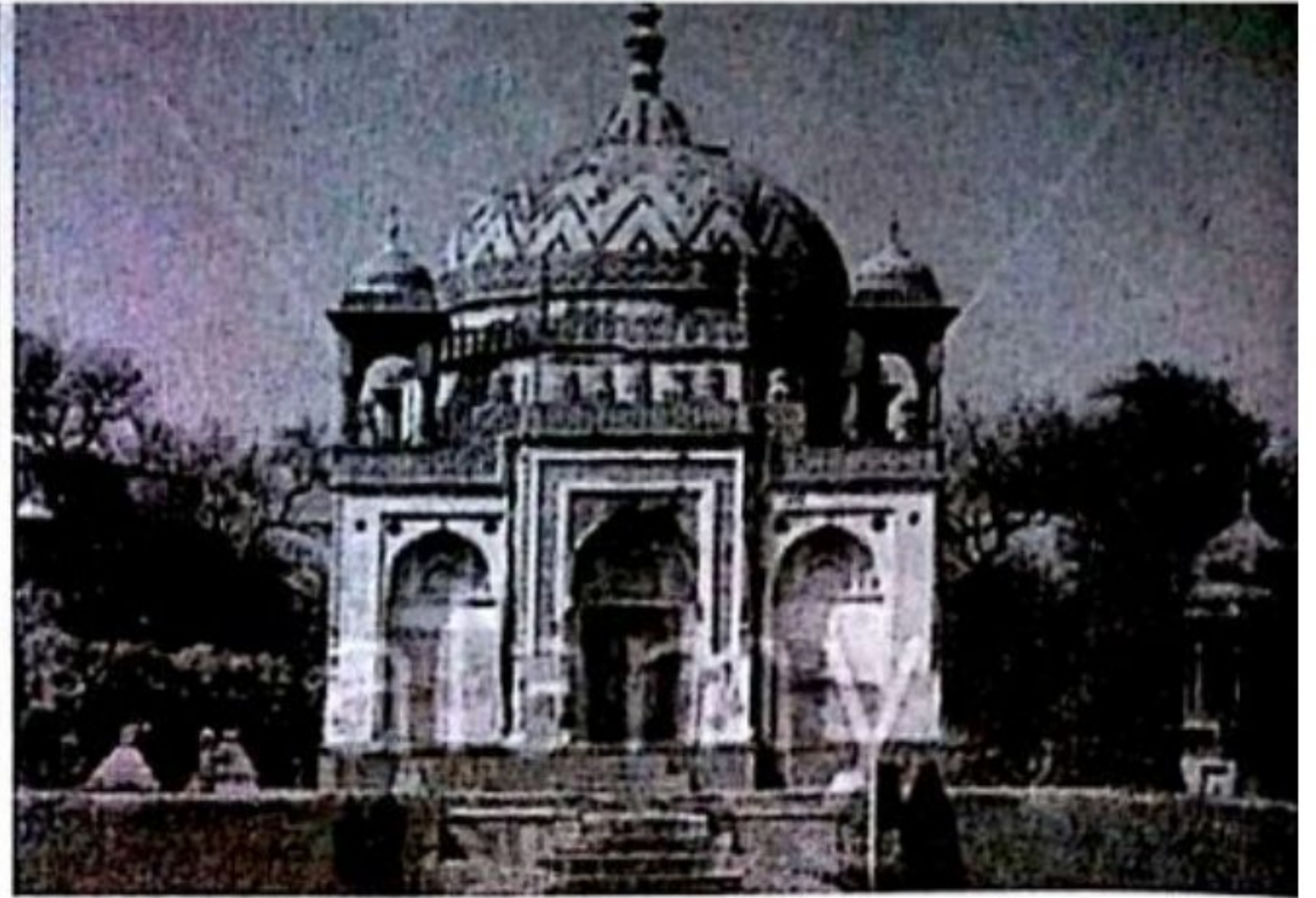
روضہ لعل خاں واقع محلہ راج گھاٹ

روضہ لکڑ شاہ

مذکور بھی اسی سے متصل ہے۔ ہر سال صفر کی آخری جمعرات کو عرس ہوتا ہے۔ میرے محترم و مخلص جناب ڈاکٹر جمیل احمد صاحب مرحوم کے بعد ان کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب اس کے متولی ہوے اور اب انہی کے اہتمام سے یہ عرس ہوتا ہے[1]

لعل خاں نے ۱۱۸۴ھ میں وفات پائی۔ راج گھاٹ میں راجا بنار کے پرانے قلعہ کے پاس گنگا کے کنارے بلندی پر آپ کا خوشنما مقبرہ ہے۔ قبہ بڑا شاندار ہے اور شہر میں اس نمونہ کا کوئی مقبرہ نہیں ہے۔ دروازے پر سنگ مرمر کا یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

هو الفتاح العلیم

دریغا لال خاں آں مرد یکتا	کہ بود اندر سخا چوں ابر دریا
سخاوت با شجاعت ہر دو میداشت	علم در نیک نامی نیک افراخت
مساکین پرور و درویش رادوست	موحد بسکہ می گفتی 'ہمہ اوست'
زدنیا رخت چوں مردانہ بربست	بظل رحمت حق رفت بہشت
بگفت سال وصالش نوراللہ	'تعالیٰ مرقدہ اے مرد آگاہ'

۱۱۸۴ھ

چوہٹہ لعل خاں: بنارس میں چوہٹہ لعل خاں محلّہ ان ہی کے نام سے مشہور ہے جو کسی وقت میں شہر کا بڑا مرکزی بازار تھا۔

[1] افسوس کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد ماسٹر ریاض احمد خان ساکن بھدؤں چنگی بنارس اپنے کچھ معاونین کے ساتھ عرس کا انتظام کرتے ہیں۔ ع ب نعمانی
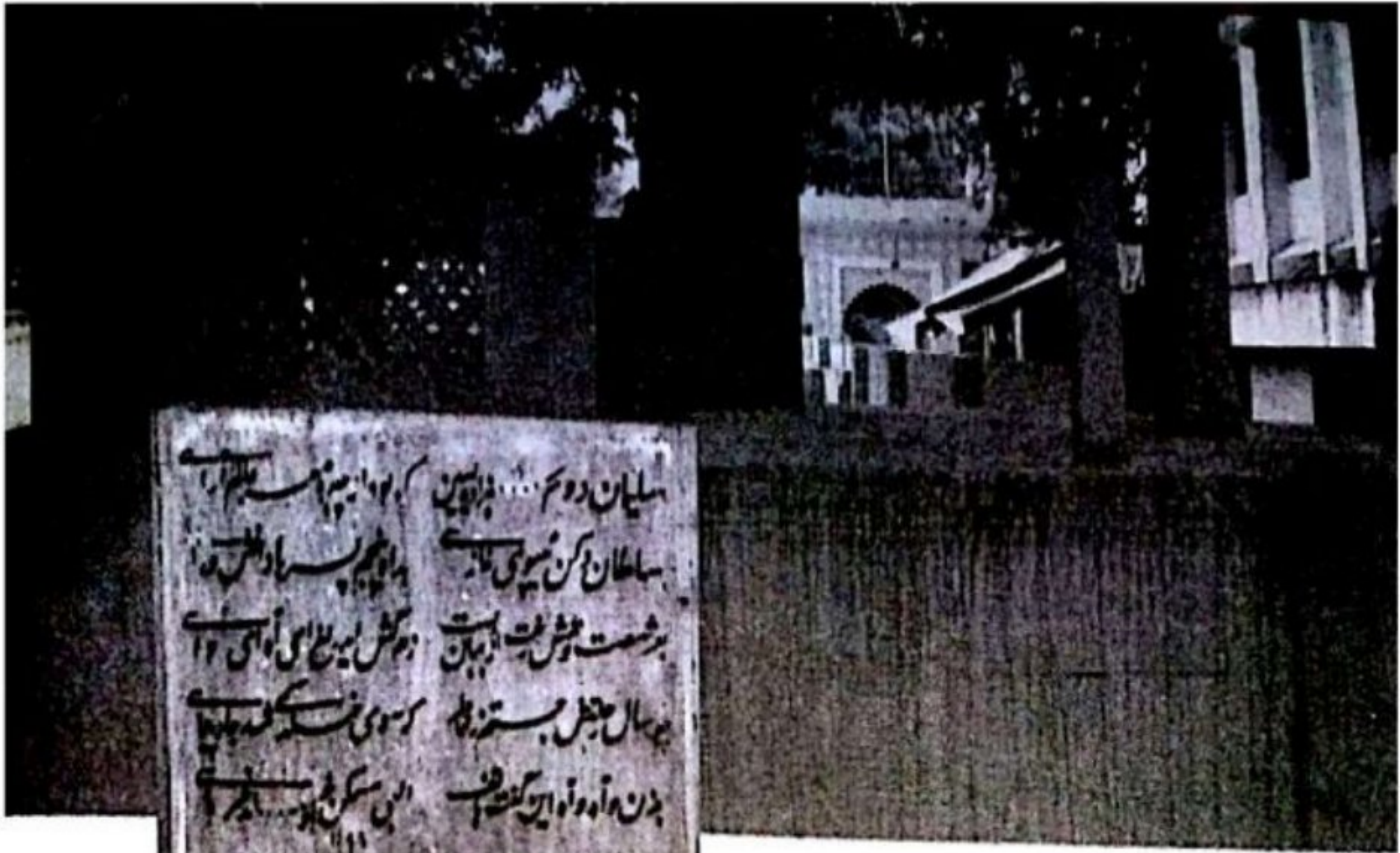
سلیمان دوم[1] ابن ٹیپو سلطان:

سلطان ٹیپو [شہید ۱۷۹۹ء] کے لڑکے سلیمان دوم اسی زمانے میں بنارس آئے اور یہیں پر ۱۱۸۸ھ میں بعمر ۶۶ سال وفات پائی۔ فاطمان کے پوربی دروازے سے باہر قبرستان میں ان کی قبر ہے اور سرہانے یہ کتبہ نصب ہے:

سلیمان دوم شہزادہ پسیں	کہ بود از چہرہ عالم آرائے
زسلطان دکن ٹیپوے غازی	بداد پنجم بسر باد انش و رائے
بعمر شصت و شش رخت از جہاں بست	زمرگش اے دریغ اے آہ اے وائے
چو سال رحلتش جستم ز خاطر	کہ سوے خلد کے شد بادہ پیمائے
بحزن و آہ ایں گفت ہاتف	الٰہی مسکن او خلد فرمائے

۱۱۸۸ھ

---

[1] بعض مؤرخین کی تحقیق کے مطابق ٹیپو سلطانؒ [شہید ۱۷۹۹ء] کے چار بیٹوں میں سے دو کو کلکتہ بھیج دیا گیا تھا اور دو بیٹے بنارس آئے جن میں سے ایک سلیمان دوم کا ذکر اوپر ہوا، جب کہ دوسرے کا پتہ نہ چل سکا۔ سلیمان دوم تعلیم یافتہ وخوددار تھے، اس لیے انہوں نے حکومت وقت سے وظیفہ لینے کی تمنا ظاہر نہ کی، اور نہ ہی مغل شہزادوں کی طرح کوئی محل و جائیداد لینا پسند کیا۔ حالانکہ انگریز چاہتے تھے کہ شہزادہ ہم سے امداد طلب کرے۔ لیکن خودداری اور غیرت نے کبھی بھی ان کے منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ چونکہ یہ خوش نویسی کے فن سے واقف تھے اس لیے اسی کو ذریعہ معاش بنایا۔ بقیہ اوقات بچوں کی تعلیم میں صرف فرماتے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی، لیکن خودداری پر تادم آخر آنچ نہ آنے دی۔ [سرالسالکین۔ ص ۲۰۔ بحوالہ 'بنارس کے تاریخی مقبرے' ص ۵۰۔ از سلام اللہ صدیقی

سلطنت مغلیہ کا خاتمہ

احمد شاہ ابدالی [متوفی ۱۸۰۶ء] دہلی کی سلطنت شاہ عالم ثانی کو سپرد کر کے چلے گئے، لیکن اب وہاں کی مرکزی حکومت بھی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مغلوں میں بھی حکومت کا دم باقی نہ تھا۔ چند ہی دنوں میں یہ کیا کرایا بیکار ہو گیا۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی بنارس میں ہندو راج کا آغاز ہو گیا[٭] منسارام پہلے حکمراں تھے جنہوں نے نیم خود مختار حکومت قائم کی اور ۱۸۲۵ء تک اسے مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے بیٹے راجا بلونت سنگھ نے بنارس کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت دے دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے بنارس کی ایک علاحدہ حیثیت تسلیم کی اور پربھو نرائن سنگھ کو سارے اختیارات حاصل ہو گئے، مگر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں بنارس پھر صوبہ اتر پردیش میں شامل ہو گیا۔

بنارس میں راجا بلونت سنگھ کے زمانے میں تمام اختیارات نواب آصف الدولہ[۱] والی صوبہ اودھ و بنارس کو حاصل تھے۔ ۱۱۸۴ھ م ۱۷۷۰ء میں راجا بلونت سنگھ کا انتقال ہو گیا اور نواب شجاعت[۲] اپنے بیٹے آصف الدولہ کے ساتھ بنارس آئے اور اسی

٭ اس سلسلے میں خصوصی نوٹ بعنوان 'بنارس میں ہندو راج' اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱ یہ نواب شجاع الدولہ [متوفی ۱۷۷۵ء] کے بڑے بیٹے تھے، ۲۷ سال کی عمر میں تخت حکومت پر فائز ہوئے۔ انہوں نے اپنا دارالریاست بجائے فیض آباد کے، لکھنؤ قرار دیا۔ مزاج میں شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی کا جذبہ تھا اور تعمیرات کے بھی بڑے شوقین تھے۔ لکھنؤ کا بڑا امام باڑہ آپ ہی کا بنوایا ہوا ہے۔ ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور امام باڑہ مذکور میں دفن ہوئے۔ [اودھ کا بیان۔ ص ۲۳۔۲۵] ع ب نعمانی

۲ یہ محمد مقیم صفدر جنگ [متوفی ۱۷۵۶ء] کے بیٹے تھے، صفدر جنگ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ ابتدا میں بڑے رنگین مزاج اور عیش پرست تھے، اسی لیے کچھ لوگوں نے چاہا کہ ان کی جگہ کسی ...... بقیہ اگلے صفحہ پر]

سال بتاریخ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۴ھ م ۱۷۷۰ء کو رام نگر جا کر راجا بلونت سنگھ کے بیٹے راجا چیت سنگھ کو بباعث پیروی بابو اوسان سنگھ [مدار المہام راجا بنارس] راجا بنا دیا۔

راجا پورہ:

بنارس میں راجا چیت سنگھ کے نام سے محلّہ راجا پورہ موسوم ہے۔ راجا پورہ کا بڑا بازار جس کو بابو بازار اور وہاں کی آبادی کو اوسان گنج کہتے ہیں، جو راجا اوسان سنگھ کے نام سے موسوم ہے اور وہاں ان کا قلعہ بھی ہے۔

[سابقہ صفحے کا بقیہ حاشیہ]: ...... اور کو تخت سلطنت حوالے کی جائے، لیکن ان کی چالاک وہوشیار بیوی بہو بیگم کی مداخلت سے ایسا نہ ہوسکا۔ انہی کی اصلاح وتربیت کا نتیجہ تھا کہ نواب کی عادت بدلنی شروع ہوگئی اور پھر کوئی شکایت نہ رہی۔ البتہ ان کے دور میں اودھ حکومت انگریزوں کے زیر اختیار آنی شروع ہوچکی تھی۔ ۱۷۷۵ء میں وفات پائی۔ [ایضاً۔ ص ۲۳] ع ب نعمانی
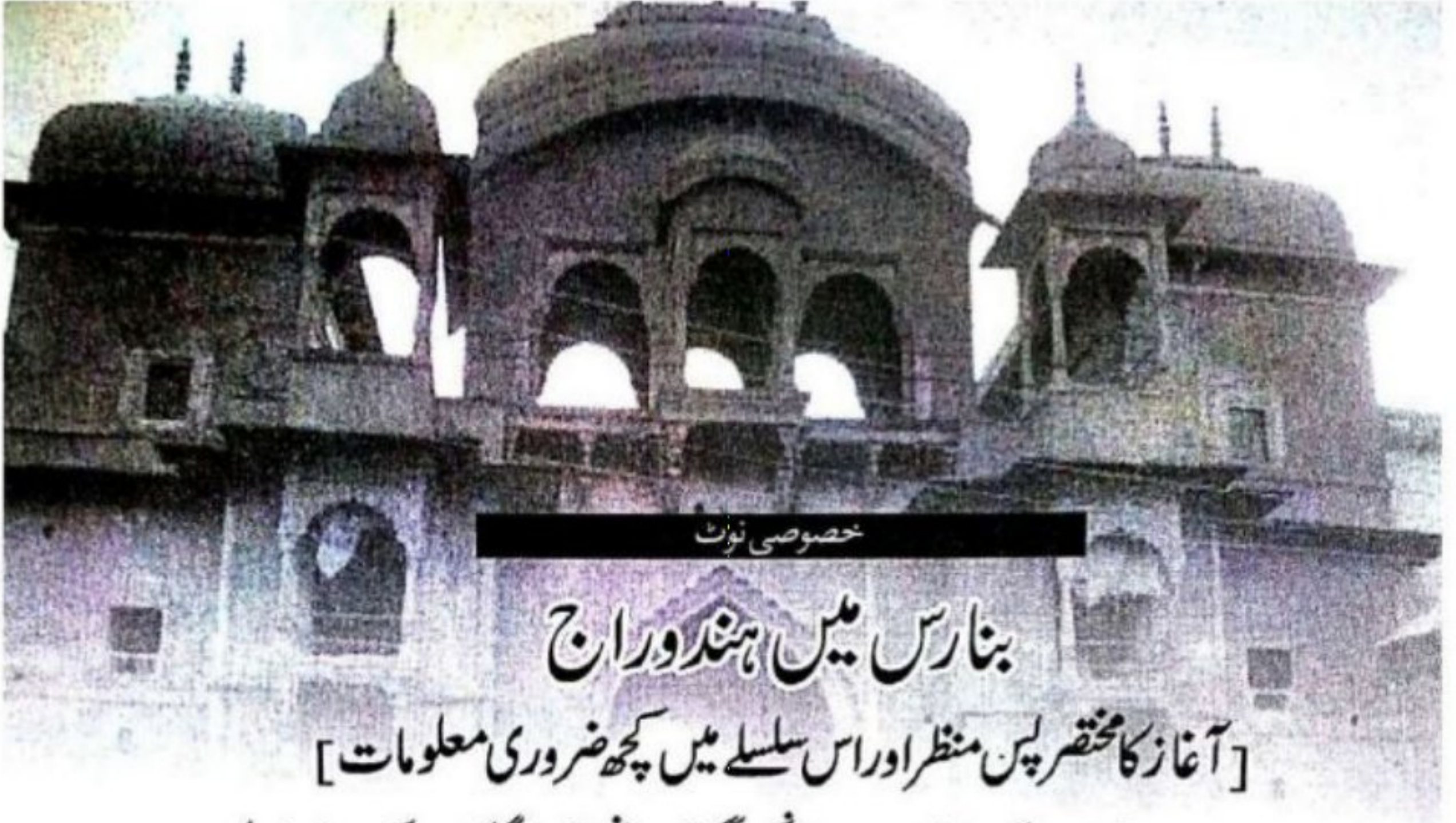
خصوصی نوٹ

بنارس میں ہندو راج

[آغاز کا مختصر پس منظر اور اس سلسلے میں کچھ ضروری معلومات]

راجا منسارام کے والد کا نام بابو منورنجن سنگھ تھا جو موضع تتریا [گنگا پور] کے رہنے والے اور اپنے مذہب کے بہت بڑے عالم اور عبادت گزار تھے۔ غریب پروری، خودداری اور انسانیت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بابو منورنجن سنگھ کے اجداد میں ایک اور بزرگ گزرے ہیں جن کا نام کتھو مصر تھا۔ یہ بھی نہایت عبادت گزار، علم و عمل کے پیکر اور انسانیت کے علمبردار تھے۔

راجا بناران کا بہت معتقد تھا۔ از راہ عقیدت اس نے ایک مرتبہ بہت بڑی قطعہ آراضی ان کے نام لکھ دی۔ چونکہ یہ عمل بابو منورنجن سنگھ کے مزاج کے خلاف تھا، اس لیے راجا نے چپکے سے اس کی سند ان کے دیگر سامان کے ساتھ رکھ دی۔ گھر آ کر جب انہیں اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا، لیکن چونکہ اسے نادانستہ ہی سہی، قبول کر چکے تھے، اس لیے اس کا لوٹانا مناسب نہ تھا۔ البتہ انہوں نے راجا بنار کو اس بات پر بددعا دی کہ تو نے میرے زہد و تقویٰ میں یہ دان دے کر فرق ڈالا اور مجھے دھوکا دیا۔ لہٰذا تمہارا راج غارت ہو جائے گا اور میری اولاد تمہاری جگہ حکمرانی کرے گی۔ بابو منورنجن سنگھ بہت بڑے زمیندار اور مال و دولت کے مالک ہونے کے باوجود حکمرانی، عہدہ و منصب سے کوسوں دور رہتے۔ ان کی اس صفت سے ان کے اہل خانہ و ماتحت کو بہت رنج ہوتا، جب یہ لوگ کبھی عہدے و حکمرانی کی بات کرتے تو یہ ٹال جاتے۔ اسی عرصہ میں ایک روز بابو صاحب نے اپنے اجداد میں کتھو مصر کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہے ہیں کہ تم بنارس میں حکمرانی کرو۔ بابو صاحب نے اولاً اسے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن جب کتھو مصر برابر اس کا اصرار کرتے رہے تو بابو صاحب نے عرض کیا کہ اگر آپ کی خوشنودی اسی میں ہے تو میرے لڑکے اور پوتے کے واسطے دعا فرمایئے کہ وہ بنارس کے حکمراں ہو جائیں اور آپ کی زبان پوری ہو جائے اور میں عبادت الٰہی میں مصروف رہوں۔

بابو صاحب نے جب صبح میں اس خواب کو گھر والوں سے بیان کیا تو منسارام [جو کہ اس وقت صرف پانچ سال کے تھے] نے عرض کیا کہ میں اپنے جد امجد کے خواب کو ضرور پورا کروں گا۔

بالآخر ان لوگوں نے مسلسل کوشش اور جدوجہد شروع کردی۔ متعدد حالات وواقعات اور مختلف مراحل سے گزرتے گزرتے ایک دن ایسا آیا کہ بابو صاحب کا خواب پورا ہوا اور ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں منسارام تخت حکومت پر متمکن ہوئے اور چھ برس چند ماہ حکومت کر کے ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۰ء کو انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین کی حیثیت سے ان کے بیٹے راجا بلونت سنگھ مقرر ہوئے اور ۱۱۸۴ھ مطابق ۱۷۷۰ء تک مسند حکومت پر رہ کر ۱۷۷۰ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے راجا چیت سنگھ ان کے جانشین ہوئے، لیکن ۱۱ سال ہی تک حکومت کی تھی کہ ان کی مخالفت شروع ہوگئی، بالآخر انہیں منصب سے ہٹا کر ان کی جگہ اکتوبر ۱۷۸۱ء میں راجا بلونت سنگھ کے نواسے راجا مہیپ نرائن سنگھ کو تخت حکومت دے دیا گیا۔ یہ ۱۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۹۵ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین کی حیثیت سے ان کے بڑے صاحبزادے اودیت نرائن سنگھ کا انتخاب عمل میں آیا۔ ان کا دور حکومت چالیس سال تک رہا۔ پھر جب ۱۷۹۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا تو ان کی جانشین ایشری پرشاد نرائن سنگھ مقرر ہوئے اور تقریباً ۵۵ سال تک حکومت کر کے ۱۸۸۹ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجے پربھو نرائن سنگھ کا انتخاب عمل میں آیا۔ ان کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا اور ان کے جانشین آدتیہ نرائن سنگھ ہوئے جن کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ ان کے بعد ان کے جانشین ڈاکٹر وبھوتی نرائن سنگھ مقرر ہوئے۔ واضح ہو کہ ان تمام راجگان کا خطاب کاشی نریش ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مذکور یہاں کے آخری کاشی نریش تھے۔ پھر جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو ۱۵/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ان لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۲۰۰۰ء میں ہوا۔ اب ان کے بیٹے کنور اننت نرائن سنگھ ان کے جانشین ہیں۔ باوجودیکہ ان لوگوں کی ظاہری حکومت کا ایک عرصہ قبل ہی خاتمہ ہو چکا ہے لیکن ان حضرات کے یہاں کی عوام پر اتنے احسانات ہیں کہ کیا ہندو، کیا مسلم سبھی کے دلوں پر آج بھی ان کی حکومت اور ان کا دبدبہ قائم ہے۔ ایک طرف یہاں کی ہندو عوام نے اگر اس منصب پر فائز لوگوں کو 'بھگوان' کا درجہ دیا تو دوسری طرف مسلمانوں نے بھی ان کی قدر دانی میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی، اور آج بھی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے کہ راجگان بنارس کے خلاف کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتا۔

ع ب نعمانی [بحوالہ تاریخ بنارس اول تا سوم]

انگریزوں کا قدم ہندوستان میں

ہندوستان کی مالداری اور دولت کے قصے تو ساری دنیا میں مشہور تھے یورپ کی قوموں کو بھی عرصہ سے اس سے نفع اٹھانے کی فکر لگی تھی۔ اسی دھن میں ایک پرتگیز جہازی واسکوڈی گاما[1] کسی عرب مسلمان کی مدد سے ۱۴۸۸ء میں کالی کٹ پہنچا اور سمندر کا نیا راستہ کھل گیا۔ پرتگیزیوں کی دیکھا دیکھی ہالینڈ، جرمنی، سویڈن، فرانس اور انگلستان کے سوداگروں نے بھی ہندوستان کا رخ کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے علاوہ سب کے قدم اکھڑ گئے۔ آگے چل کر فرانس کو بھی سامنے سے ہٹنا پڑا اور انگریزوں کے لیے میدان صاف ہوگیا۔

انگریز سوداگر سولہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہی ہندوستان پہنچ گئے ۱۰۰۹ھ م ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ [اول[2]] کی اجازت سے ایسٹ انڈیا کمپنی[3] نے سوڈیڑھ سو برس

---

[1] محققین کے نزدیک اس کی حیات کا زمانہ ۱۴۶۰ء سے ۱۵۲۴ء تک ہے۔ یہ پرتگال میں سائنس نامی علاقے میں پیدا ہوا۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ ۱۴۸۸ء میں، اور دوسری مرتبہ ۱۵۰۲ء میں آیا۔ ۲۴ر دسمبر ۱۵۲۴ء کو چین میں انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[2] یہ انگلستان کی ملکہ تھی۔ ۷ ستمبر ۱۵۳۳ء میں پیدا ہوئی۔ اس کے والد کا نام ہنری ششم تھا۔ اس کا عہد برطانیہ میں نشاۃ ثانیہ کا عہد ہے۔ نہایت فراست اور تدبر کی مالکہ تھی۔ اس کے دور میں فن ادب اور دیگر فنون کو کافی عروج حاصل ہوا۔ برطانوی جہاز رانی کو بھی بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک میں تجارتی کمپنیاں قائم ہوئیں، ان میں سے ایک ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہے۔ ۲۴ر مارچ ۱۶۰۳ء کو انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[3] یہ انگریزی لفظ ہے جس کا اردو ترجمہ ہے 'مشرقی ہند کے شرکاء'۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حقیقت یہ ہے کہ پرتگال والوں کو ہندوستان میں آتا دیکھ کر برطانوی انگریزوں کو بھی سرزمین ہند میں آنے کی للک پیدا ہوئی۔ چونکہ دیگر کچھ لوگوں کے ہندوستان سے تجارتی تعلقات پہلے سے قائم تھے، اس لیے انگریزوں نے بھی اپنی آمد کا مقصد تجارت ہی بنایا۔ اس کے لیے وہاں چند لوگوں نے آپسی مشورے سے ایک جماعت تیار کی جس کے اراکین نے اس زمانے میں [باقی اگلے صفحہ پر]

تک صرف تجارت سے سروکار رکھا۔لیکن اورنگ زیب اور معظم شاہ کے بعد جب سلطنت کو زوال ہوا تو مغل سلطنت کی بنیادیں ایسی ہلیں کہ ملک بھر میں جھگڑے شروع ہو گئے۔

نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ م ۱۷۷۵ء سے ۱۲۱۲ھ م ۱۷۹۷ء تک اودھ اور بنارس کے فرمانروا تھے اور ۱۱۸۹ھ مطابق ۲۱ر مئی ۱۷۷۵ء میں بنارس، جون پور، غازی پور، چنارگڑھ کو گورنمنٹ انگلشیہ متعلقہ جارج سوم[۱] شاہ انگلستان کو بذریعہ معاہدہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر کے سپردگی کی سند تحریر کی[۲]

انگریزوں نے سب سے پہلے نواب سراج الدولہ[۳] کو ۱۱۷۰ھ م ۱۷۵۷ء میں شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا اور پھر شاہ عالم سے بکسر میں ۱۷۶۴ء میں انگریزوں کو فتح ہوئی اور شاہ عالم کے لیے چھبیس لاکھ سالانہ پنشن مقرر ہوگئی جو بعد میں ان کی اولاد کو ملتی رہی۔کوئی سو برس تک یہی شکل قائم رہی اور انگریزوں کے سہارے دہلی میں نام کی بادشاہت رہی۔آخر ۱۲۷۳ھ م ۱۸۵۷ء میں یہ بھی ختم ہوگئی۔انگریزوں نے آہستہ آہستہ سارے ہندوستان میں قدم جما لیے اور حیدر آباد کرناٹک میں جھگڑے برپا ہوئے۔

[سابقہ صفحے کا بقیہ]......بغرض مشترک تجارت ۳۰ لاکھ روپیوں کا سرمایہ اکٹھا کیا اور سرزمین ہند کو روانہ ہوے۔یہاں آنے سے قبل ان لوگوں نے اس زمانے میں وہاں کی فرمانروا ملکہ الزبتھ [اول] سے ایک معاہدے پر دستخط کرا لیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۵ سال تک بغیر اس تجارتی کمپنی کے شرکاء کی اجازت کے برطانیہ کا کوئی شخص ہندوستان آکر تجارت نہیں کرے گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔یہ جماعت ہندوستان آئی اور تجارت شروع کر دی۔اسی تجارتی کمپنی کا نام 'ایسٹ انڈیا کمپنی' رکھا گیا تھا۔[تاریخ بنارس ا/۲۲۰] ع ب نعمانی

۱۔ اس کا نام جارج ولیم فریڈک تھا۔۴رجون ۱۷۳۸ء کو پیدا ہوا اور ۲۹رجنوری ۱۸۲۰ء کو انتقال ہوا۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۲۔ [چراغ نور تاریخ ظفر آباد و جون پور ص ۲۹] عبد السلام نعمانی

۳۔ ان کا اصل نام مرزا محمد تھا اور سراج الدین شاہ قلی خاں لقب۔یہ بہار کے حاکم علی وردی خاں المعروف بہ مہابت جنگ[متوفی ۱۷۵۶ء] کے نواسے اور زین الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔ان کی پرورش نانا ہی کے یہاں ہوئی تھی، اسی لیے حد سے زیادہ لاڈ پیار نے انہیں اخلاقی طور پر بہت پست کر دیا تھا۔مہابت جنگ کے انتقال کے بعد یہ ان کے جانشین ہوے۔تخت نشینی کے بعد بھی اخلاقی پستی برقرار رہی۔بنگال میں انگریزوں کے خلاف لشکر کشی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔بالآخر ۱۷۵۷ء کو انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۱۲۶۴ھ م ۱۸۴۷ء میں حیدر آباد اور کرناٹک اور اس کے بعد ہی بنگال پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہر جگہ لڑائیاں ہوئیں۔ انگریزوں نے دیکھتے ہی دیکھتے کلکتہ سے دہلی اور میسور سے ہمالیہ کی ترائی تک اپنا قبضہ جما لیا۔ صرف پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی لیکن آخر میں وہ بھی انگریزوں کے ماتحت ہو گئی۔

برما، سندھ اور اودھ کی بعض ریاستیں قائم تھیں، لیکن انگریزوں نے ان کو بھی چلنے نہ دیا۔ ۱۲۶۸ھ م ۱۸۵۲ء میں برما کے راجا سے جنگ ہوئی جس کے بعد صوبہ آسام اور برما کا بڑا حصہ انگریزی سلطنت میں آ گیا۔ پھر ۱۲۷۳ھ م ۱۸۵۷ء تک کشمیر سے راس کماری اور درۂ خیبر سے لے کر برما تک انگریزی حکومت قائم ہو گئی۔

دہلی کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر[1] ۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوے جنہیں بعد میں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ اس طرح لال قلعہ کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ ان کی کشتی بنارس میں چیت گھاٹ پر رکی تھی، جہاں انہوں نے شہزادوں سے ملاقات کی جن کا قیام شیوالہ میں تھا۔

۱۲۷۳ھ م ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا اور کمپنی راج قائم ہو گیا، انگلستان کی حکومت نے ہندوستان کا انتظام خود اپنے ہاتھ لے لیا۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء م ۱۲۷۵ھ کو الہ آباد میں ایک بڑا دربار ہوا جس میں ملکہ وکٹوریہ[2] کی جانب سے عام معافی کا اعلان کیا گیا اور لوگوں کو اطمینان دلایا گیا کہ اب

---

[1] ان کا نام محمد سراج الدین تھا۔ ۲۴ / اکتوبر ۱۷۷۵ء کو پیدا ہوے۔ یہ نہایت علم دوست اور اچھے شاعر بھی تھے۔ ظفر تخلص تھا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو تخت سلطنت پر متمکن ہوئے، لیکن جلد ہی یعنی ۱۴ / ستمبر ۱۸۵۷ء کو تخت سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی زبردست جنگ جو غدر کے نام سے مشہور ہوئی، اسی بادشاہ کے دور میں ہوئی۔ اس لڑائی میں انگریزوں نے جتنے مظالم ڈھائے وہ محتاج بیان نہیں۔ اسی کا ایک حصہ اس بادشاہ کی گرفتاری بھی ہے۔ انہیں نہ صرف گرفتار کیا گیا، بلکہ رنگون کی جیل میں انہیں قید کر کے ان کے اوپر بے انتہا مظالم ڈھائے گئے۔ حتیٰ کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کو قتل کیا گیا۔ اسی کسمپرسی کے عالم میں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [تاریخ بنارس ا / ۲۱۷۔۲۳۰] ع ب نعمانی

[2] یہ سلطنت برطانیہ کی ملکہ تھی، ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئی ۱۸۳۷ء میں تخت سلطنت پر بیٹھی اور تاحیات اسی منصب [بقیہ اگلے صفحہ پر]

ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

بنارس انگریزی دورِ حکومت میں جھگڑوں اور فسادوں سے محفوظ تھا، ادھر ادھر کے فسادات کا کوئی اثر بنارس میں نہیں پڑا۔ زوال سلطنت مغلیہ کے بعد یہاں کے چند خاص اور اہم تاریخی واقعات قابل ذکر ہیں جو آئندہ صفحات میں بترتیب سنہ لکھے جائیں گے۔

۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۱ء سے کچھ پہلے کسی وقت میں وارن ہیسٹینگز[1] نے جو فورٹ ولیم[2] بنگال کا پہلا گورنر جنرل تھا، اس نے بنارس میں انگریزی فوج کے رہنے کے لیے کوارٹرز بنوائے تھے جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ یہ جگہ کبیر چورا میں 'آج' اخبار کے سامنے ہے اور 'سوامی باغ' کے نام سے موسوم ہے۔ باہر کی دیوار پر انگریزی میں یہ تحریر ہے:

In the garden with in this wall wae quarters occupicd in the on time of 1781 by waren hastings first governor genrel of Fort Willium in Bengal.

[گزشتہ صفحے کا بقیہ]
پر رہی۔ اس کا دور سلطنت ۶۳ سال سے بھی زائد کا ہے جو برطانوی حکمرانوں میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے دور حکومت میں سلطنت برطانیہ اپنی طاقت اور عالمی رسوخ میں اپنی انتہا پر تھی۔ ۱۹۰۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[1] یہ ۶ دسمبر ۱۷۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ انگریزی دور میں ۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۵ء تک ہندوستان میں گورنر جنرل کے عہدے پر رہے۔ ۱۸۱۸/۸/۲۲ء کو انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[2] یہ کلکتہ میں ہبلی ندی کے مشرقی کنارے پر ایک قلعہ ہے جسے برطانوی دور حکومت میں ۱۷۸۱ء میں انگلینڈ کے راجا ولیم سوئم کے نام پر بنوایا گیا تھا۔ اس کے سامنے ایک وسیع و عریض میدان ہے جو کلکتہ کا سب سے بڑا شہری پارک ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

انگریزی دور حکومت کے اہم تاریخی واقعات

۱۔عدالت قوانین اور شرعی فیصلے:

انگریزی حکومت کی ابتداء میں اسلامی اور شرعی قانون کے مطابق کلکٹری اور دیوانی کے مقدموں کے فیصلے ہوتے رہے۔البتہ عدالت دیوانی میں کسی قدر ترمیم کی گئی تھی۔اس زمانے میں مولانا واصل علی خاں قاضی القضاۃ نے شرعی قوانین کو جمع کر کے ایک کتاب 'ذخیرہ' ترتیب دی تھی،اس وقت تک جج اور چیف جسٹس وغیرہ کا لفظ رائج نہیں ہوا تھا۔جج کو قاضی اور چیف جسٹس کو قاضی القضاۃ اور کلکٹر کو حاکم کہتے تھے۔

۲۔مرزا احسن خاں بہادر حاکم بنارس:

ابتدائے حکومت میں پہلے جب محکمہ فوجداری قائم ہوا تو مرزا محمد حسن خاں حاکم مقرر ہوئے،ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے امامی مقرر ہوئے۔

چھتہ مرزا امامی: ریشم کٹرہ سے متصل محلّہ جس کو اب چھتہ تلے کہتے ہیں،انہیں کے نام سے مشہور ہے۔

۳۔شہزادہ مرزا جواں بخت خلف شاہ عالم:

۱۲۰۱ھ م ۱۷۸۶ء میں خاندان مغلیہ کے آخری یادگار شہزادہ جواں بخت الملقب بہ جہاندار شاہ خلف اکبرو ولی عہد شاہ عالم فرخ آباد سے بنارس آئے اور یہیں رہ گئے۔پھر ۱۲۰۲ھ م ۱۷۸۸ء میں انتقال کیا۔ان کے تین بیٹے تھے،جن میں

شہزادہ مرزا خرم بخت[1] بہادر اپنے پدر بزرگوار کے قائم مقام تھے۔ان کا قیام شوالہ میں تھا،۱۲۳۳ھ م۱۸۱۸ء میں انتقال ہوا۔بادشاہ باغ فاطمان میں دفن ہوئے۔قبر پر یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے:

چوں خرم بخت سلطاں جہاندار — ز دنیا رفت خلقے کرد در ماتم
بتاریخش سروش از آسماں گفت — بہ فردوس از پئے او جام خرم

مرزا صاحب بڑے ہی علم دوست آدمی تھے اور بہت سی فارسی کی گرانقدر کتابیں نقل کر کے رکھ چھوڑی تھیں،لیکن بعد میں کوڑیوں کے مول فروخت ہو گئیں۔بعض کتابیں مہاراجا بنارس کی اسٹیٹ لائبریری رام نگر میں محفوظ ہیں اور میری نظر سے گزر چکی ہیں۔

حیدر باغ فاطمان موسوم بہ بادشاہ باغ:

مرزا خرم بخت نے ایک عالیشان باغ فاطمان میں تعمیر کرایا تھا جس کا نام حیدر باغ ہے۔اس کے اندر ایک عالیشان بارہ دری بھی بنوائی جس پر یہ کتبہ درج ہے:

بسم اللّٰہ
۱۲۲۶ھ(۱۸۱۱ء)

اسی باغ میں ایک مسجد بھی بنوائی جو آپ کی یادگار ہے۔

مرزا خرم بخت کا مکان شیوالہ میں تھا،ان کے چھوٹے بھائی مرزا بلاقی اور

---

[1] یہ جہاندار شاہ کی پہلی بیوی قطلک بیگم کے بطن سے ۱۷۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ان کے بھی کئی بیٹی بیٹے تھے جن میں بڑے بیٹے مرزا اظفر بخت اور چھوٹے بیٹے محمود جان کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔مرزا اظفر بخت کی نسل سے پیدا جناب مہدی بخت صاحب [منیجر بال بھارتی اسکول] موجود ہیں۔ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:
مہدی بخت ابن ہاشم رضا علی بخت ابن مرزا ولی بخت [م۱۹۵۷ء] ابن مرزا فیروز بخت [م۱۹۲۰ء] ابن مرزا نادر بخت [م۱۹۰۲ء] ابن مرزا اظفر بخت ابن مرزا خرم بخت ابن جہاندار شاہ ابن شاہ عالم الخ۔[ایک شہزادے کی داستان۔از: ڈاکٹر ہاشم رضا علی بخت] ع ب نعمانی

شگفتہ بخت راج گھاٹ میں رہتے تھے، وہاں ان کے مکانات آج بالکل کھنڈر کی صورت میں ہیں وہیں ایک پختہ چبوترے پر مرزا ابلاقی کے خاندان والوں کی قبریں ہیں۔

مرزا ابلاقی فاطمان ہی میں مدفون ہیں اور ان کی قبر پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

شہ با صدق بولاقی مرزا	کہ بجز تخم نکوئی نکشت
زدم زندگیش تالب مرگ	نشدے صادر ازو فعلے زشت
کس وناکس ہمہ رادر ہمہ عمر	زکرم خوان کریما بہ فرست
روح پاکش سفر خلد گزید	رفت و برخاک تن خاکی ہشت
خواستم سال وفاتش عارف	ہاتفے گفت رواں شد بہ بہشت

۱۲۷۵ھ

الا یاساکن القصر المعلیٰ	ستدفن عنقریب فی التراب
له ملك ينادى كل يوم	لدو اللموت وابنو اللخراب

ھشتم محرم ۱۲۷۵ھ

بادشاہی باغ:

راج گھاٹ میں وہ جگہ جہاں مرزا ابلاقی کا مکان اور ان کے خاندان کی قبریں ہیں چاروں طرف آٹھ بیگھہ کے اندر سرکاری بندوبست میں باغ درج ہے جیسا کہ آل تیمور ایسوسی ایشن والوں نے فراہم کیا تھا۔

مرزا خرم بخت کے پوتے مرزا سعید الدین عرف پیارے صاحب [مدفون یعقوب شہید بنارس] نے بادشاہ باغ میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور مسجد کے ساتھ شاہ عبد القادر صاحب[1] کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ ان کی ایک پر پوتی اختر سلطان[2] اور ایک نواسے مرزا بابر بخت موجود[3] ہیں اور دونوں آپس میں میاں بیوی ہیں۔

محلّہ شیوالہ میں مرزا آصف الدین بخت[4] کے ذریعہ مجھے ایک شاہی نسب نامہ دستیاب ہوا ہے، جو اب تک وہاں محفوظ ہے:

مرزا آصف الدین بخت بن مرزا فرید الدین بخت بن مرزا محمد سلطان عرف

مرزا راحت بخت بن مرزا رحمت بخت بن مرزا خرم بخت بن عزیز الدین عالمگیر بادشاہ ثانی بن معزالدین جہاندار شاہ ابن محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ ابن محی الدین محمد اورنگ زیب بن شہاب الدین محمد شاہجہاں ابن نورالدین محمد جہانگیر بن جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بن محمد نصیر ہمایوں بادشاہ بن محمد ظہیر الدین بابر بن محمد سلطان عمر شیخ مرزا بادشاہ بن محمد سلطان ابوسعید مرزا بادشاہ بن سلطان محمد مرزا بادشاہ بن جلال الدین محمد میران شاہ بن امیر تیمور بن امیر طراغا ابن امیر برگل بن امیر ایلنگر نویاں بن امیر انجل نویاں بن امیر قرار چانویاں ابن امیر سوغوججن ابن قاچولی بہادر سپہ سالار بن سلطان تومند خاں بن باتسیقر خاں بن قائیدو خاں بن ذوالمنن خاں بن یوقا خاں بن بوزنجر خاں بادشاہ از بطن ملکہ النقوا بادشاہ بنت جونیہ خاں بادشاہ ابن بلدوز خان ابن تنگیز خان ابن منگلی خاں ابن تیمور تاس بادشاہ۔

اسی خاندان کی ایک نامور خاتون صالحہ سلطان بیگم کی فاطمان میں ایک چبوترے پر پختہ قبر ہے۔ جس پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

آں شمعِ ایوانِ شہنشاہانِ تیموری نژاد — آں ہمایونِ ظہیرالدین بابر دادگر

آں دخترِ حاجی سکندر بخت عالی مرتبت — آں بانوے فرخندہ طینت نیکدل فرخ سیَر

آں گوہرِ ابرِ کرم والا شیَم عالی ہمم — آں صالحہ سلطان بیگم نازشِ علم و ہنر

واحسرتا بست و ششم آمد چوں ماہِ رجب — آں پاک دیں یوم نہ بنمود از دنیا سفر

۱؎ یہ شیوالہ کے رہنے والے اور اس مسجد کے پیش امام تھے۔ اب ان کے ورثہ میں بنارس میں کوئی نہیں رہتا۔ سب لوگ پاکستان منتقل ہو گئے۔ ع ب نعمانی

۲؎ و ۳؎ مرزا خرم بخت کی تین بیویاں تھیں۔ [۱] زیب جہاں بیگم [۲] سعید النساء بیگم [۳] فہیم النساء بیگم۔ اختر سلطان [جنہیں کشتہ بیگم بھی کہا جاتا تھا] زیب جہاں بیگم کے بطن سے پیدا تھیں۔ اب اختر سلطان و مرزا بابر بخت دونوں ہی انتقال کر چکے ہیں۔ یہ لوگ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ایک بیٹی حمیرہ سلطان ہیں جن کا نکاح ملک شاکر رضا صاحب ساکن شہنشاہ پور ضلع بنارس سے ہوا ہے، جو اپنے شوہر کے ساتھ شیوالہ ہی میں اپنے آبائی مکان میں مقیم ہیں۔ ع ب نعمانی [بحوالہ ملک شاکر رضا صاحب]

۴؎ یہ محلہ باندی پورہ متصل گوبند پورہ، دالمنڈی کے رہنے والے اور مرزا آصف الدین کے یہاں ملازم تھے۔ ع ب نعمانی

ہم حاجی وہم خاک بوسِ آستانِ مصطفٰے	نازل شود رحمت بروئش از خدائے بحر و بر
صد مرحبا مرزا وحید الدیں اخی اصغرش	از صرفِ خود تعمیر کرد ایں تربتِ عبرت اثر
از کلکِ طاہر مصرعِ سال است نقشِ مرقدش	ایں خوابگاہِ صالحہ سلطان بیگم نامور

۱۳۳۹ھ

۴۔ نواب علی ابراہیم خاں حاکم بنارس:

۱۲۰۱ھ م ۱۷۹۴ء میں عزیز الممالک نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی نے جو پہلے نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بہادر جلاوت جنگ ناظم بہادر وبنگال کے متوسل اور بنارس کے حاکم تھے۔نظامت کمزور ہونے کے بعد انگریزی حکومت کی ملازمت کرلی۔لارڈ کارنوالس[۱] کے زمانے میں بنارس کے چیف مجسٹریٹ پھر گورنر ہوگئے[۲] اور بنارس میں ہی ۱۸۰۳ء م ۱۲۱۸ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔فاطمان میں مدفون ہیں۔نواب صاحب کے مکانات آج بھی موجود ہیں ۔اصل رہائش گاہ محلّہ چاہ مہماں میں تھی جہاں ان کا خاندان آج بھی رہائش پزیر ہے۔

نواب کی ڈیوڑھی:

محلّہ نرہر پورہ میں واقع ہے اور ان ہی کے نام سے موسوم ہے[۳] نواب علی ابراہیم خاں نے اپنے زمانے میں ۱۱۹۸ھ میں مسجد دھرہرا کی مرمت، اور عمارت میں کچھ

---

[۱] یہ انگریزی دور حکومت میں ہندوستان میں ۱۷۸۶ء سے ۱۷۹۳ء تک گورنر جنرل کے عہدے پر تھا۔پورا نام Charles Cornwallis تھا۔۳۱ر دسمبر ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا اور ۵ر اکتوبر ۱۸۰۵ء میں انتقال کیا۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[۲] اس کا پس منظر یہ ہے کہ وارن ہیسٹنگز نے علی ابراہیم کو جب اس منصب پر مقرر کرنا چاہا تو تمام روءساء شہر کو اپنے یہاں مدعو کرکے اپنے خیال کا اظہار کیا۔بالآخر علی ابراہیم کا اس منصب پر خاطر خواہ تنخواہ کے ساتھ تقرر ہوا اور ماہ ذی قعدہ ۱۱۹۵ھ سے باضابطہ انہوں نے کام شروع کیا اور فرائض منصبی انجام دینے کے لیے جگہ وہی مقرر ہوئی جو دالمنڈی میں آج پرانی عدالت کے نام سے جانی جاتی ہے۔[تاریخ بنارس ۲۸/۲] پرانی عدالت کی تاریخ پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ع ب نعمانی

[۳] یہ وہی جائیداد ہے جس پر آج بال بھارتی اسکول قائم ہے۔اس اسکول کا قیام یکم اگست ۱۹۶۶ء کو عمل میں آیا۔ع ب نعمانی

ترمیم کرائی اور مسجد کے اندر ایک کتبہ بھی نصب کرایا۔ جس کا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے۔

نواب صاحب بڑے علم دوست تھے۔ بنارس کے زمانۂ قیام میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں تذکرہ شعراء، وقائع جنگ مرہٹہ، خلاصۃ الکلام، گلزار ابراہیم زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا علی لطیف نے 'تذکرہ شعراء' کے بعض اجزاء کا اردو ترجمہ کر کے 'گلشن ہند' کے نام سے شائع کیا جو ایک مدت تک کمیاب رہا۔ بالآخر حیدرآباد دکن کی ۱۳۲۳ھ کی شدید طغیانی کے زمانے میں اس کا ایک آب زدہ نسخہ مولوی عبداللہ خاں مرحوم کو دستیاب ہوا۔ انہوں نے مولوی عبدالحق صاحب بی، اے [انجمن ترقی اردو والے] سے ایک تفصیلی دیباچہ لکھوا کر ۱۹۰۶ء میں مطبع رفاہِ عام لاہور سے شائع کیا۔

'خلاصۃ الکلام' فارسی گو شعراء کا ایک تذکرہ ہے، جس میں ۱۸۸ مثنویات کا انتخاب ہے۔ اس کو نواب صاحب نے ۱۱۹۸ھ م ۱۷۸۳ء میں مکمل کیا۔

'وقائع جنگ مرہٹہ' نامی یہ کتاب لارڈ کارنواس کے زمانے میں ۱۲۰۱ھ م ۱۷۸۶ؑ میں بنارس کے زمانۂ قیام میں مرتب کی۔ خاتمہ میں یہ عبارت تحریر ہے:

"الحمدللہ والشکر کہ بسال ہزار و دو صد و یک ہجری در بلدہ بنارس صورت ارقام یافت، امید کہ پسند طبع پسندیدگاں ومقبول عام وخاص گردد۔"

آپ نے ۱۲۰۰ھ میں بنارس کے مشہور وشوناتھ مندر کا نوبت خانہ بھی تعمیر کرایا جیسا کہ نوبت خانہ پر فارسی میں لگے ایک کتبے سے ظاہر ہے۔

۵۔ قاضی القضاۃ مولوی واصل علی خاں:

۱۲۰۵ھ م ۱۷۹۰ء میں قاضی القضاۃ مولوی واصل علی خاں دوبارہ بنارس آئے اور محلّہ گوکرن میں قیام پزیر ہوئے۔ اور ان سے اکثر لوگوں نے عہدۂ قضا کی سند لی۔ اب محلّہ گوکرن کو قاضی پورہ کلاں کہا جاتا ہے۔ گوکرن کوئی نہیں کہتا۔

۶۔ مسجد آغا گنج:

۱۲۲۱ھ م ۱۸۰۷ء میں شہر بنارس کے ایک مشہور زمین دار آغا فخر الدین محمد خاں نے اپنی زمینداری کے زمانے میں محلّہ آغا گنج میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ محراب میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے[۱]:

'ایں مسجد در ۱۲۲۱ھ فخر الدین محمد خاں تعمیر نمود'

۷۔ چوب وضو سرور کائنات ﷺ:

۱۲۲۲ھ م ۱۸۰۸ء سے فاطمان کے پوربی دروازے کے جنوبی قبرستان پر ایک چھوٹے سے حجرے میں ایک تختہ نصب ہے جس کی بابت مشہور ہے کہ یہ سرور کائنات ﷺ کے وضو فرمانے کی لکڑی ہے[۲]۔ واللہ اعلم۔ اس پر ایک قبہ بھی تعمیر کیا گیا ہے، ساتھ ہی کتبہ بھی ہے۔

۸۔ عیدگاہ لاٹ بھیرو:

۱۲۲۴ھ م ۱۸۰۹ء میں بنارس میں ایک بڑا تاریخی ہنگامہ ہوا، جو بلوہ لاٹ کے نام سے عوام میں آج بھی مشہور ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ عالمگیر بادشاہ کی قناتی مسجد کے قریب واقع امام باڑہ کلاں کے پاس پتھر کا ایک ستون قائم تھا، جس کو 'لاٹ بھیرو'

۱۔ مسجد مذکور کی نئی تعمیر کے وقت وہ کتبہ اپنی جگہ سے ہٹا کر کسی محفوظ جگہ رکھا ہوا ہے۔ واضح ہو کہ محلّہ آغا گنج انہی آغا فخر الدین کی طرف منسوب ہے جو طویل عرصے سے اسی محلے کے باشندے تھے۔ تعمیر مسجد کے علاوہ انہوں نے بہت ساری زمینیں بھی مسجد مذکور میں وقف کی تھیں جو آج بھی موجود ہیں۔ مسجد مذکور کے جنوبی سمت آپ کا ایک احاطے میں مزار بھی واقع ہے۔ ع ب نعمانی

۲۔ یہ قدم رسول ﷺ سے مشہور ہے۔ ایک لکڑی پر انسانی قدم کا نشان نمایاں ہے، جسے کہا جاتا ہے کہ یہ آقائے دو جہاں ﷺ کا قدم مبارک ہے۔ بنارس میں اس وقت کئی مقامات پر قدم رسول ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، مگر تاریخی اعتبار سے ان کی کیا حیثیت ہے اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ع ب نعمانی

کہتے ہیں۔ مسلمان اس کو دھوپ گھڑی سمجھتے تھے۔ اس کے متصل ہی اذان و جماعت کا انتظام کر دیا۔ جبکہ ہندو اس کو متبرک سمجھ کر وہاں پوجا کرتے تھے۔ چنانچہ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی اور مطابق اشتہار فوجداری بنارس ۷ امئی ۱۸۱۰ء م ۱۲۲۵ھ نمبر ۱۵۵۸ بذریعہ صاحب مجسٹریٹ بہادر تصفیہ ہوا[1]

لاٹ بھیرو کی تاریخ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ صرف فرضی قصے اور سنی سنائی روایات ہیں۔ تاریخ کی کسی کتاب میں بھی اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کی قدیم اور تاریخی کتاب 'کاشی کھنڈ' بھی اس کے ذکر سے خالی ہے۔ ہندوؤں کا زبانی بیان یہ ہے کہ صدیوں سے ایک مورتی کپال بھیرو اور تالاب[2] موسومہ کپال موچن وجود پزیر ہیں۔ لیکن تاریخی طور پر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

لاٹ کے نام سے جو ستون ہے وہ عیدگاہ کے بیچ میں واقع ہے اور چاروں طرف مسجد کا صحن ہے۔ یہ پہلے ۴۰ فٹ بلند تھا اور اس پر کتبہ لگا ہوا تھا، جیسا کہ بعض انگریز سیاحوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ عیدگاہ کسی مندر کی جگہ پر تعمیر نہیں ہوئی [جیسا کہ فرقہ

---

[1] کہتے ہیں کہ بنارس کی تاریخ کا یہ پہلا فرقہ وارانہ فساد تھا جو ہندو اور مسلمان کے درمیان ہوا۔ جبکہ عیدگاہ کے تعلق سے اس سے پہلے کسی طرح کا بھی کوئی نزاع نہ تھا۔ عارضی طور پر فریقین کے مابین مذکورہ بالا تصفیہ تو ہو گیا، لیکن اختلاف کی یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق کے مابین مقدمہ بازی کا جو سلسلہ اس وقت ۱۸۱۰ء سے چلا تو صدیوں تک چلا۔ بالآخر اس مقدمہ کا آخری اور قطعی فیصلہ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ ع ب نعمانی

[2] اس تالاب سے وہی تالاب مراد ہے جو عیدگاہ سے دکھن طرف واقع ہے۔ ہندوؤں نے اس کے بارے میں ایک دعویٰ یہ بھی کیا تھا کہ یہ رانی بھوانی کا تالاب ہے، لہٰذا یہ ہمارا ہے، اور ہمیں اپنے تمام مذہبی امور کے انجام دینے کی اجازت ملنی چاہئے۔ لیکن اس طویل مقدمہ بازی کے باوجود وہ آج تک نہ کپال بھیرو کو ثابت کر سکے اور نہ ہی اس تالاب کے مذکورہ دعویٰ کو بالآخر ۱۹۳۶ء کے فیصلے کے مطابق یہ تالاب قیصر ہند کا تسلیم کیا گیا اور دونوں فریق کو اس سے استفادہ کا اختیار دے دیا گیا جس کے بعد سے جہاں مسلمان اس تالاب کے اردگرد کی خالی جگہوں پر عیدین کی نماز ادا کرتے ہیں، وہیں ہندو بھی اپنے اپنے وقت پر اس تالاب سے جو بھی مذہبی امور وابستہ ہیں انہیں انجام دیتے ہیں۔ لیکن دونوں فریق کو اس فیصلے سے ہٹ کر کسی نئی چیز کو قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ محمد حنیف صاحب ساکن کٹیہر]

پرستوں کا دعویٰ ہے] اور نہ ہی کسی مسلمان بادشاہ سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس جگہ اسلامی آثار کی جو کثرت اور جابجا قناتی مسجدیں اور گور غریباں ہیں، ان سے یہ قیاس آرائی تقریباً ناممکن ہے اور بلا کسی تردد کے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اہل اسلام کا قدیمی ورثہ ہیں جہاں صدیوں سے ان کی ہڈیاں دفن ہیں۔

عیدگاہ کے نیچے تالاب کے مغربی حصے میں قدیم زمانے کا ایک کتبہ ایک قناتی مسجد کی محراب میں لگا ہوا ہے۔ وہ یہ ہے:

افتادہ بخاک کاروانے اینجاست آسودہ زکشمکش جہانے اینجاست

یمنی زجہاں گم کردہ اینجا جوے کزعالم بے نشاں نشانے اینجاست

عیدگاہ کی موجودہ تعمیر ۱۲۵۹ھ میں ہوئی، جیسا کہ محراب میں لگے اس کتبے سے ظاہر ہے:

"در یک ہزار و دوصد و پنجاہ و نہ استحکام و وسعت یافت"

۱۳۱۰ھ م ۱۸۹۲ء میں سردار رحمت اللہ صاحب[1] [متوفیٰ ۱۹۲۵ء] متولی مسجد ہذا نے فرش مسجد کو وسیع کرنے کی غرض سے آراضی کا ایک جز و حاصل کیا جس کا پرجوٹ اب تک ملتا ہے۔

ہندوؤں کو اقرار نامہ کی رو سے اب تک پوجا پاٹ کی اجازت ہے اور لاٹ کی حدود کے اندر جا کر اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں۔ رام لیلا کے موقع پر اس اقرار نامہ کی رو سے جو سردار عبدالستار [متوفیٰ ۱۹۵۶ء] ساکن کٹیہر متولی اور مہنت نرسنگھ داس کے درمیان ۱۶/ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہوا، رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ ان سب کی تفصیلی رپورٹ ایڈیشنل سب ججی دوئم بعدالت بنارس ۱۹۳۴ء میں ہے۔

---

[1] آپ رئیس القوم جناب الحاج سردار یار محمد صاحب [متوفیٰ ۱۲۹۱ھ] ساکن کٹیہر بنارس کے صاحبزادے تھے۔ تاحیات عیدگاہ لاٹ کی تولیت کے فرائض انجام دے کر ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں وفات پائی اور عیدگاہ کے مشرق جنوب گوشے میں دفن ہوئے۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

سردار عبدالستار صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجے سردار شمس الدین صاحب [متوفی ۱۹۸۱ء] اس عیدگاہ کے متولی ہوے، پھر ان کے انتقال کے بعد جناب سردار محمد یٰسین صاحب اس وقت متولی ہیں [1]

حضرت مولانا رضا علی صاحب قطب بنارسؒ [متوفی ۱۳۱۲ھ] جو اس عیدگاہ کے پورب جانب مدفون ہیں، یہاں کے امام عیدین تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحبؒ [متوفی ۱۳۵۳ھ] یہاں کے امام عیدین ہوے اور اب تک انہی کی اولاد میں امامت عیدین کا یہ سلسلہ قائم ہے۔

۹۔ بلوۂ ٹیکس:

۱۲۲۶ھ م ۱۸۱۱ء میں بلوۂ ٹیکس ہوا جس کا واقعہ یہ ہے کہ بنارس میں انگریزی حکومت ٹیکس جاری کرنا چاہتی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے متفقہ طور سے اس کے خلاف اقدام کیا جس کے نتیجے میں سخت ہنگامہ ہوا۔ آخر راجا اودت سنگھ بہادر [2] کی کوشش سے تصفیہ ہوا اور بابو شیو نرائن پسر بابو اوسان سنگھ کو اس کے صلہ میں گورنمنٹ کی طرف سے خلعت ملی۔

۱۰۔ کوتوالی کی مسجد چاندنی چوک بنارس:

اسی سن میں جناب مرزا کریم اللہ بیگ رئیس بنارس و مدار المہام جون پور نے ایک

---

[1] افسوس کہ ۱۹۹۱ء میں آپ بھی انتقال کر گئے۔ پھر آپ کے جانشین کی حیثیت سے جناب سردار عبدالسلام صاحب ابن سردار شمس الدین صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، لیکن ۱۹۹۷ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا تو ان کے جانشین جناب سردار محمد بشیر صاحب ابن الحاج عبدالاحد صاحب ہوے جن کا ۲۰۰۵ء میں انتقال ہوا۔ اب اس وقت ان کے جانشین سردار مقبول حسن صاحب ابن سردار شمس الدین صاحب اس عیدگاہ کے متولی ہیں۔ واضح ہو کہ اس عیدگاہ کا متولی وہی شخص ہوتا ہے جو کہ تنظیم چودھو کا سربراہ ہوتا ہے۔ ع ب نعمانی

[2] یہ مہاراجا مہیپ نارائن سنگھ [م ۱۷۹۵ء] کے بیٹے تھے، ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوے۔ ۱۷۹۶ء میں والد کے جانشین ہوے اور ۱۸۳۵ء میں انتقال ہوا۔ [تاریخ بنارس، جلد دوم] ع ب نعمانی

پختہ اور سنگین مسجد بنوائی جو چوک میں کوتوالی کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ محراب میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

چوں کریم اللہ از حسن یقیں　　کرد مسجد را بطرز نو بنا
آفریں صد مرحبا بر طینتش　　بے تامل گفت ہر مرد خدا
نمامہ راقم شد ز روے اعتقاد　　'خانہ حق است' تاریخ بنا
۱۲۲۶ھ

۱۱۔ جارج چہارم کی تخت نشینی:

۱۲۳۶ھ م ۱۸۲۰ء میں جارج سوئم[۱] کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے جارج چہارم[۲] قائم مقام ہوئے۔

۱۲۔ سید احمد بریلویؒ[۳] کی بنارس آمد[۴]

۱۲۳۶ھ م ۱۸۲۱ء میں ماہ شوال کی آخری تاریخ کو سید احمد بریلوی [شہید ۱۲۴۶ھ]

---

[۱] اس کا نام جارج ولیم فریڈرک (George William Frederick) تھا، ۴ جون ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۷۶۰ء سے اپنے یوم وفات ۲۹ رجنوری ۱۸۲۰ء تک برطانیہ کا حکمراں تھا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[۲] اس کا نام جارج آگسٹس فریڈرک George Augustus Frederick تھا، ۱۸ر اگست ۱۷۶۲ء کو پیدا ہوا۔ ۲۹ جنوری ۱۸۲۰ء سے اپنے یوم وفات ۲۶ جون ۱۸۳۰ء تک برطانیہ کا حکمراں رہا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[۳] آپ ۶ر صفر ۱۲۰۱ھ مطابق ۲۹ر نومبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں دائرہ شاہ علم اللہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سید محمد عرفانؒ [متوفی ۱۲۱۴ھ] کے صاحبزادے تھے۔ اخلاق حسنہ و جملہ اوصاف ستودہ گویا آپ کو وراثت میں ملے تھے جس کی وجہ سے صغر سنی ہی میں مقبول خاص و عام ہو گئے تھے۔ ساری زندگی شرک و بدعات و خرافات کے خلاف جنگ لڑی۔ آپ کی انہی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے اور نہ جانے کتنے گمراہ و بدعقیدہ لوگوں کو ضلالت و گمراہی کے قعر عمیق سے رشد و ہدایت کی روشنی میں آنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے خلاف جہاد بھی آپ کا خاص مشن تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے مجاہدین تیار کرنے کا کام بھی خوب انجام دیا۔ ۲۴ر ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ میں آپ نے سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ [سیرت سید احمد شہید] ع ب نعمانی

[۴] حضرت کی بنارس میں یہ دوسری مرتبہ تشریف آوری تھی، پہلی مرتبہ ۱۲۳۴ھ میں تشریف لائے تھے جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ ع ب نعمانی

چار سو آدمیوں کے ہمراہ رائے بریلی سے پیدل بنارس کے لیے روانہ ہوئے۔ الہ آباد، مرزاپور اور چنار گڑھ ہوتے ہوئے بنارس آئے اور گوشائیں گھاٹ پر کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ اس کے بعد قافلہ کے کچھ لوگ ان کے ہمراہ راجابی بی کی مسجد [بی بی رضیہ] میں ٹھہرے اور شہر کے رئیسوں نے قافلہ کی سکونت کے لیے حویلی تجویز کی اور تقریباً ایک ماہ ان کا قیام رہا۔ مرزا ابلاقی [1] نے اپنی والدہ، اہل خانہ، متعلقین وملازمین کے ساتھ بیعت کی۔ حیات النساء بیگم اور شہزادگان تیموری وغیرہ نے بھی مہمان داری کی۔ مولوی عبداللہ اور بھولا چابک سوار [2] اور نور بافوں میں سے تقریباً دو ہزار مسلمانوں نے بیعت کی۔ [3] نماز عید الاضحیٰ بھی سید احمد صاحبؒ نے بنارس ہی میں ادا کی اور سو جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کیے۔ ان کا خاص مشن انگریزوں کے مقابلے کے لیے مجاہدین تیار کرنا تھا۔

---

[1] ان کا اصل نام محمود بخت تھا، مرزا ابلاقی عرفیت تھی، مورخین کے مطابق یہ شہزادے تھے اور مغلیہ خاندان سے تعلق تھا، لیکن یہاں جلاوطن کی حیثیت سے نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے، بنارس کے تیلیا نالہ نامی علاقے میں اقامت پزیر تھے۔ [علماء ہند کا شاندار ماضی ۲/۵۵۵، بحوالہ وقائع احمدی۔ ص:۶۳] ع ب نعمانی

[2] بنارس کے راج گھاٹ کے علاقہ میں مولوی عبداللہ اور بھولا چابک سوار بڑے ذی عزت ونامدار لیکن وہاں کے تمام اہل بدعت کے سرکردہ اور سردار تھے۔ [سیرت سید احمد شہید ۱/۲۸۷] ع ب نعمانی

[3] اس بیعت کا پس منظر یہ ہے کہ مولوی عبداللہ اور بھولا چابک نے ایک روز حضرتؒ سے اپنے احوال کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے اور علاقے کے مسلمانوں کی اصلاح کی غرض سے انہیں اپنے گھر مدعو کیا، چنانچہ حضرت تشریف لے گئے تو سب سے پہلے ان دونوں نے، اس کے بعد کئی ہزار لوگوں نے توبہ کر کے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہا، آخر میں آپ نے فرمایا کہ "بھائیو! بیعت لیتے لیتے ہم تھک گئے ہیں، اب ہم کو فرصت دو، باقی لوگوں کی بعد میں بیعت لیں گے" دوسرے یا تیسرے روز اس محلے کے لوگ آپ کو دوبارہ لے گئے اور پھر بہت بڑی تعداد میں توبہ کرا کے بیعت کیا، حتیٰ کہ ایک انگریزی اسپتال میں پچاس ساٹھ مسلمان مریض بھرتی تھے، اس کی وجہ سے وہ حضرت کے پاس حاضر نہ ہو سکتے تھے، اس لیے انہوں نے حضرت کے پاس درخواست بھجوائی کہ اگر یہاں تشریف لے آئیں تو ہم بھی بیعت کر لیتے۔ چنانچہ حضرتؒ بنفس نفیس چند لوگوں کے ہمراہ اسپتال تشریف لے گئے، اور ان سب سے بیعت لی۔ اس ایک ماہ کے قیام کے دوران حضرت کی ذات سے بہت سارے لوگوں کو جہاں شرک وبدعت سے توبہ کرنے اور اپنی اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملا، وہیں بڑے بڑے جھگڑوں اور قدیم سے قدیم تر آپسی اختلاف کی وجہ سے ایک دوسروں سے نفرتوں اور کدورتوں کا بھی خاتمہ اور آپسی میل محبت واتحاد واتفاق کا بھی خوب کام ہوا۔ [سیرت سید احمد شہیدؒ۔ ۱/۲۸۷]۔ ع ب نعمانی

۱۳۔انگریزی سکوں کا رواج:

۱۲۴۳ھ م ۱۸۲۷ء میں ولیم شاہ انگلستان کا سکہ ہندوستان میں رائج ہوا۔

۱۴۔تعمیر جے نرائن کالج:

۱۲۲۹ھ م ۱۸۱۴ء میں مہاراجا جے نرائن گھوشال بہادر[۱] نے ریوڑی تالاب میں یہ کالج تعمیر کرایا جو اپنی نوعیت کا بنارس کا سب سے پہلا انگریزی تعلیم کا کالج ہے۔ اس کی بارہ دری میں یہ کتبہ بھی اردو میں لگا ہوا ہے:

'پاٹھ شالہ مہاراجہ جے نرائن گھوشال بہادر ۱۸۱۴ء' [۲]

۱۵۔حیات النساء بیگم:

۱۲۴۳ھ م ۱۸۲۸ء میں حیات النساء بیگم کا انتقال ہوا۔ یہ غالباً تیموری خانوادے سے تھیں۔ فاطمان کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد احاطہ کے اندر مزار ہے، جس کی لوح پر یہ کتبۂ تاریخ نصب ہے:

اللہ اکبر

وقل رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین

۱۲۴۳ھ

بہادر جناب حشمت الدولہ احتشام الملک ولیم اکستن بروک بہادر فیروز جنگ زاد افضالہ برخلائق احسانہا کردہ و برجادہ دین اسلام ثابت قدم ماندہ۔ عالمی را ممنون و مشکور داشت و بعد توبہ و استغفار مدتے در عبادت

---

[۱] یہ بنگال کے مہاراجا تھے۔ یکم ستمبر ۱۷۵۱ء کو بنگال کے خضر پور نامی علاقہ میں پیدا ہوے۔ ۱۷۸۱ء میں مغلیہ سلطنت کے زیر اہتمام وہاں کے راجا مقرر ہوے۔ ۱۷۹۱ء میں بنارس آئے۔ اس کالج کے علاوہ انہوں نے درگا کنڈ کے پاس واقع گرودھام مندر بھی بنوایا۔ یکم اکتوبر ۱۸۲۱ء میں انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ زیندر دیو پانڈے۔ سابق پرنسپل کالج ہٰذا]

[۲] اب بارادری نہیں ہے اور مذکورہ بالا کتبہ بھی وہاں سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیا گیا ہے۔ ع ب نعمانی

وریاضت بسر بردہ بجنت آسود، حقوق دینی آں مغفورہ برسائر اہل اسلامی مستحق است، آں مرحومہ رابد عای مغفرت وفاتحہ یاد کرد کہ عنداللہ اجر عظیم دارد۔

ان اللّٰہ لایضیع اجر المحسنین

مزار سنگین ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

یافتاح

مرقد مغفورہ مرحومہ بی بی حیات النساء کہ بہ دولت صاحب کلاں

۱۶۔ مسجد ترلوچن بازار:

۱۲۴۱ھ م ۱۸۲۶ء میں ترلوچن بازار کے مشہور رئیس دھنو بخش نے دریا کے کنارے بلندی پر ترلوچن بازار میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ محراب میں یہ تاریخ کندہ ہے:

شدہ تعمیر مسجد برلب گنگ　　بجد شیخ دھنو بخش محمود
سن بنیاداو خوش گفت ہاتف　　عبادت خانہ حق باصد جود
۱۲۴۱ھ

اس کے بعد ۱۲۵۷ھ م ۱۸۴۱ء میں اسی کے قریب ترلوچن بازار کی سڑک پر دوسری مسجد تعمیر کرائی۔ محراب میں یہ کتبہ ہے:

علو ہمت دھنو و بخشو　　بدل ایں مسجد محکم بہ پرداخت
ہماں دم از سر الہام ہاتف　　نظیر کعبہ تاریخش عیاں ساخت
۱۲۵۷ھ

۱۷۔ اردو تحریر کا رواج:

۱۲۵۲ھ م ۱۸۳۶ء میں دفتر کلکٹری سے فارسی تحریر موقوف کر دی گئی اور اردو

تحریر کا رواج ہوا۔

۱۸۔ ولیم چہارم[1] کی وفات اور ملکہ وکٹوریہ[2] کی تخت نشینی:

۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء میں ۲۰ جون کو ولیم چہارم شاہ انگلستان کی وفات ہوئی اور ان کی بھتیجی کوئن وکٹوریہ فرمانروائے انگلستان و ہندوستان ہوئیں۔

۱۹۔ بلوۂ پنسیری:

۱۲۵۸ھ م ۱۸۴۲ء میں بلوہ پنسیری ہوا۔ بنارس کے مختلف بازاروں میں مختلف اوزان رائج تھے۔ حاکم کے اس اعلان سے کہ وزن ایک رہے، بلوہ فرو ہوا۔

۲۰۔ مسجد اورنگ آباد:

۱۲۶۵ھ م ۱۸۴۹ء میں شیخ خدا بخش نامی سوداگر نے اورنگ آباد میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی، جو مسجد ڈھالگیر کے نام سے لب سڑک واقع ہے۔

---

[1] اس کا نام ولیم ہینری (William Henry) ہے۔ یہ جارج سوم کا تیسرا لڑکا تھا، ۲۱ راگست ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوا۔ ۲۰ جون ۱۸۳۷ء میں بعمر ۷۲ سال انتقال ہوا۔ ۲۶ جون ۱۸۳۰ء سے اپنے یوم وفات تک اپنے منصب پر قائم رہا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[2] یہ سلطنت برطانیہ کی ملکہ تھی۔ ۲۴ رمئی ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئی۔ اصل نام الیگزینڈرینا وکٹوریا (Alexandrina Victoria) ہے۔ پرنس ایڈورڈ (Prince Edward) کی لڑکی اور جارج سوم کی پوتی تھی۔ ۲۰ جون ۱۸۳۷ء میں اپنے چچا ولیم چہارم کی جانشین ہوئی اور مئی ۱۸۷۶ء میں ملکہ ہند کا اضافی عہدہ لیا اور اپنے سال انتقال ۱۹۰۱ء تک اس منصب پر قائم رہی۔ اس کے دور میں سلطنت برطانیہ اپنی طاقت اور عالمی اثر ورسوخ میں اپنی انتہا پر تھی۔ اس کی شادی شہزادہ البرٹ سے ۱۸۴۰ء میں ہوئی جس سے ۹ بچے پیدا ہوئے لیکن ۱۸۶۱ء میں وہ بیوہ ہوگئی اور طویل اداسی اور تنہائی کے دور سے گزری۔ بالآخر ۲۲ رجنوری ۱۹۰۱ء میں انتقال کر گئی۔ اس کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریز دنیا میں جہاں بھی گئے اپنی اس ملکہ کو نہ بھولے۔ مثلاً آسٹریلیا کے ایک صوبے کا نام وکٹوریا ہے، افریقہ میں ایک جھیل کا نام وکٹوریا ہے، للی کے خاندان میں ایک بڑے پتوں والے پودے کا نام وکٹوریا ہے، اور اسی طرح برطانیہ کے سب سے بڑے فوجی اعزاز کا نام بھی وکٹوریا کراس ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۲۱۔ پیپے کا دھماکہ:

۱۲۶۶ھ م ۱۸۵۰ء میں پیپے کا خطرناک واقعہ پیش آیا جو عوام میں 'پیپا شاہی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہوا کہ سرکاری کشتیوں پر میگزین راج گھاٹ آیا، اتفاقاً بارود کا ایک پیپا رات کو کسی طرح اڑ گیا جس سے زمین کو اتنا سخت صدمہ ہوا کہ زلزلہ پیدا ہوگیا۔ کنارے کے بہت سے مکانات منہدم ہوگئے جن میں مرزا ابلاقی صاحب کا مکان بھی اسی صدمے سے منہدم ہوگیا۔ اس کا اثر کئی کوس تک رہا۔ ایک میل کا علاقہ اور چوہٹہ لال خاں کی عمارتیں بھی منہدم ہوگئیں۔ جہاں پہلے شہر کا مرکزی بازار تھا۔ یہی نہیں، بلکہ بنارس سے بارہ کوس کے فاصلے پر واقع چکیا کی عمارتوں کے شیشے بھی گر کر ٹوٹ گئے۔

۲۲۔ قیدیوں کا بلوہ:

۱۲۶۸ھ م ۱۸۵۲ء میں بنارس کے ڈسٹرکٹ جیل کے قیدیوں میں سخت بلوہ ہوا۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ چند مفسدین نے مشورہ کیا کہ ہندو اور مسلمان قیدی جو اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پکاتے ہیں، اب ایک جگہ بٹھا کر کھلائے جائیں گے، اس طرح وہ لامذہب ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں چوکا گھاٹ، ناٹی املی کچھا میں بلوہ کی صورت ہوگئی۔ مگر بابو دیونرائن سنگھ کی تدبیر اور حسن کارگزاری سے بلوہ فرو ہوا جس کے صلے میں انھیں راؤ کا خطاب ملا۔

۲۳۔ زرافہ جانور:

۱۲۶۹ھ م ۱۸۵۳ء میں ایک عجیب الخلقت جانور مہاراجا بنارس کے یہاں آیا اور کچھا کے باغ میں رکھا گیا۔ یہ جانور افریقہ میں ہوتا ہے۔ گردن اونٹ کی طرح، سم بیل کی طرح اور رنگ ہرن جیسا ہوتا ہے۔

۲۴۔ کوئنس کالج:

۱۲۶۸ھ م ۱۸۵۲ء[۱] میں گاتھک طرز کی ایک خوبصورت اور بڑی شاندار عمارت 'کوئنس کالج' کی تعمیر مکمل ہوئی جس میں صرف گورنمنٹ کا خرچ ۱۳۶۹۰ پونڈ ہوا۔ یورپین اور ہندورؤساء کے چندے اس کے علاوہ ہیں، جن کے کتبے لگے ہوے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ نے اس سے زیادہ شاندار عمارت کوئی نہیں تیار کی۔ یہ عمارت مسٹر کٹوئی مشہور ماہر فن تعمیر نے بنائی تھی۔ بیچ کی برجی ۵۷ فٹ اونچی ہے۔ صدر ہال ۶۰x۳۰ فٹ اور ۳۲ فٹ اونچا ہے۔ کالج کے شمال میں ایک وسیع کمپاؤنڈ ہے، جس کے اندر سرخ پتھر کا ایک ستون ۳۱۔۲ فٹ لمبا کھڑا ہے جو موضع پر ہلا د پور ضلع غازی پور سے منگا کر مسٹر طامسن گورنر ممالک مغربی وشمالی نے نصب کرایا۔ یہ بڑا قدیم ہے اور اس پر قدیم زمانے کی ایک تحریر کندہ ہے۔ اس کے نیچے مسٹر طامسن نے کتبہ بھی لگا دیا ہے۔

"

ایں ستون زمان قدیم در موضع پر ہلا د پور متعلقہ ضلع غازی پور بہم
رسید بموجب حکم جناب مستطاب معلیٰ القاب نواب جیمس ٹامسن صاحب
بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی و نیز اعانت اخراجات بار برداری
ازطرف جناب ممدوح وسعی جناب ولیم کا مزاہ ممٹن صاحب لفٹنٹ سکنڈ
فوزیلیرس ۱۸۵۴ء بمقام بنارس رسید وحسب الارشاد گورنمنٹ اٹیکنس
صاحب لفٹنٹ بنگال انجینیرس در ماہ مئی ۱۸۵۴ء برپا گردید۔

"

جنوری ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۰ فصلی میں اس کالج کا افتتاح ہوا۔ اب جمہوری حکومت نے اس کالج کی حیثیت بدل کر سنسکرت یونیورسٹی کر دی ہے اور بہت سی عمارتیں اور ہوسٹل اس میں تعمیر ہو چکے ہیں[۲]

---

[۱] مورخہ ۲ رنومبر ۱۸۴۷ء کو اس عمارت کا سنگ بنیاد مہاراجا بنارس نے رکھا تھا۔ ع ب نعمانی
[۲] اس کی مزید تفصیلات کے لیے صفحہ ۵۸ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ ع ب نعمانی

۲۵۔ ہریش چندر کالج:

میداگن پر واقع یہ کالج بھارتیندو ہریش چندر[1] کے نام سے ہے جسے انہوں نے ۱۸۶۶ء میں پہلے اپنی رہائش گاہ واقع چوکھمبا میں صرف پانچ طلبہ سے شروع کیا تھا۔ ابتداء میں اس کا نام چوکھمبا اسکول تھا۔ ان کے انتقال کے بعد انہی کے نام سے موسوم ہوا[2]۔

۲۶۔ نواب امین الدولہ پسر نواب شمس الدولہ[3]:

۸ر ستمبر ۱۸۵۴ء م ۱۲۷۰ھ کو امین الدولہ پسر نواب شمس الدولہ ساکن درگا کنڈ

---

[1] یہ بابو گوپال چند کے صاحبزادے تھے۔ اصل نام ہریش چند اور بھارتیندو خطاب تھا جسے یہاں کی عوام نے ان کی ادبی و علمی خدمات سے متاثر ہو کر انہیں دیا تھا جس کا مفہوم 'ہندوستان کا چاند' ہے۔ ان کی ولادت بنارس ہی میں ۹ر ستمبر ۱۸۵۰ء میں ہوئی تھی جبکہ انتقال جنوری ۱۸۸۵ء میں بہت ہی کم سنی کے عالم میں ہوا۔ ان کی اس کم سنی میں گوں ناگوں خصوصیات اور بہت ساری صلاحیتوں نے انہیں اہل بنارس کا ہر دل عزیز بنا دیا تھا، آج بھی ان کے اہل خاندان کو اسی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت اس خانوادے میں جناب گریش چند چودھری صاحب ہیں جو بھارتیندو جی کے علمی و ادبی وارث و امین ہیں۔ ع ب نعمانی

[2] طلبہ کی بڑھتی تعداد کے پیش نظر ۱۹۱۰ء میں یہ کالج وہاں سے میداگن منتقل کر دیا گیا۔ جہاں اس قت پندرہ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اس کے ماتحت ۳ کالج ہیں۔ [۱] انٹرمیڈیٹ کالج [۲] ڈگری کالج [۳] بالکا ودیالیہ [برائے نسواں] اس وقت اس کا نام ہریش چندر پوسٹ گریجویٹ کالج ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ جناب گریش چند چودھری جوائنٹ سکریٹری ہریش چند پوسٹ گریجویٹ کالج بنارس]

[3] نواب امین الدولہ کے ایک چھوٹے بھائی اقبال الدولہ تھے جو بادشاہ باغ بنارس سے متصل قبرستان میں مدفون ہیں۔ امین الدولہ کے دو بیٹے عابد علی و جعفر علی تھے جن کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جبکہ دوسرے بھائی اقبال الدولہ کی نسل کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ پہلے یہ لوگ درگا کنڈ میں واقع ۲را یکڑ ۱۴ر ڈسمل رقبے پر مشتمل ایک احاطے میں رہائش پزیر تھے جیسا کہ اوپر متن میں گزرا۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں وی ڈی اے نے تقریباً ۵ بسوہ زمین کو چھوڑ کر بقیہ زمینوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ان زمینوں پر نوابوں کی تعمیر کردہ ان کی رہائش گاہیں، بارہ دری، شیش محل وغیرہ موجود تھے سب منہدم کر دیے گئے۔ باقی ماندہ زمین پر آج صرف امام باڑہ رہ گیا ہے جہاں محرم کی رسوم اپنی اپنی تاریخوں میں نوابوں ہی کے دور سے ادا کی جاتی ہیں۔ امام باڑے کے متولی اقبال الدولہ کی چھٹی پشت میں جناب مرزا پیارے حسن صاحب ہیں۔ اب اس گھرانے کے سارے لوگ درگا کنڈ سے منتقل ہو کر شیو پور میں رہائش پزیر ہیں جہاں ان لوگوں کی پہلے زمینداری تھی۔ نواب صاحب مذکور کا سلسلہ نسب نواب شمس الدولہ تک اس طرح ہے: نواب پیارے حسن مرزا ابن نواب اعظم علی مرزا ابن نواب واجد علی مرزا ابن نواب کاظم علی مرزا ابن نواب داراب جنگ بہادر ابن اقبال الدولہ ابن شمس الدولہ ابن نواب سعادت علی خاں۔ واضح ہو کہ مذکورہ امام باڑے سے متصل مغربی سمت میں کچھ فاصلے پر واقع محلہ 'نواب

نے جونواب اودھ سعادت علی خاں کے خاندان سے تھے، انتقال کیا۔ ان کے وارث امین الدولہ عابد علی مرزا و جعفر علی مرزا تھے جن کی اولاد اب تک موجود ہے۔ بنارس کے مسلمان رئیسوں میں باعتبارِ امارت اعلیٰ درجہ کی طبیعت رکھتے تھے۔

۲۷۔ نواب واجد علی خان، اودھ[1]:

۱۲۷۲ھ م ۱۸۵۶ء میں نواب واجد علی خاں ملک اودھ ضبط ہونے کے بعد کلکتہ جاتے ہوئے بنارس آئے اور مہاراجا بنارس کی کوٹھی واقع ندیسر میں قیام کیا۔

۲۸۔ مسجد دائم خاں:

۱۲۷۳ھ م ۱۸۵۷ء میں دائم خاں رئیس اردلی بازار کے صاحبزادے مولا بخش خاں نے اپنے والد کے نام سے مسجد دائم خاں تعمیر کرائی۔ 'عبادت خانہ اسلام آباد' مادہ تاریخ ہے جس سے سال تعمیر ۱۲۷۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے متولی اسی خاندان کے لوگ ہوتے آئے ہیں۔ فی الحال محمد حنیف خاں صاحب متولی ہیں[2]۔

---

[1] ۳۰ر جولائی ۱۸۲۲ء کو اودھ کے شاہی خاندان میں یہ پیدا ہوئے۔ پورا نام ابوالمنصور سکندر شاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ اختر تھا۔ والد کا نام امجد علی شاہ [متوفی ۱۸۴۷ء] تھا۔ ان کے والد امجد علی شاہ کے دور خلافت میں ایسٹ انڈیا کمپنی فوجی اور سیاسی حیثیت سے اودھ کے معاملات میں اتنا حاوی ہو چکی تھی کہ وہ صرف موقع کی تلاش میں تھی کہ اس حکومت کو کس طرح اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ سوے اتفاق کہ واجد علی شاہ کی ۱۸۴۷ء میں تخت نشینی کے بعد جلد ہی ان کے خلاف بد نظمی وانتشار اور ان کی نااہلی و عیاشی کے ایسے ایسے الزامات تراشے گئے کہ ان کا علاج سوائے معزولی کے کچھ نہ تھا، چنانچہ انہیں معزول کر دیا گیا، جس کے بعد وہ جلاوطن ہو گئے۔ پھر یکم ستمبر ۱۸۸۷ء میں کلکتہ کے مٹیا برج میں انتقال کر گئے۔ واضح ہو کہ یہ سلطنت اودھ کے گیارہویں اور آخری فرمانروا تھے۔ ان کے بعد سلطنت اودھ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[2] افسوس کہ آپ کا مورخہ ۲۱ر مارچ ۱۹۹۱ء کو انتقال ہو گیا، اب اس وقت جناب حاجی محمد شوکت صاحب ساکن اردلی بازار اس منصب پر فائز ہیں، جو دائم خاں کے خاندان کے نہیں ہیں۔ کیونکہ محمد حنیف خاں کے انتقال کے بعد اس خاندان میں اس منصب کے لائق کسی شخص کے نہ ہونے کے باعث اب تولیت کا منصب اس خاندان میں نہ رہا۔ ع ب نعمانی

۲۹۔غدر:

۱۲۷۳ھ م ۱۸۵۷ء کو ہندوستان کا مشہور تاریخی واقعہ غدر پیش آیا۔اس سلسلے میں بنارس میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ فوجیوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ان کی بندوق کی کارتوس میں سوّر اور گائے کی چربی ملی ہے۔اس خبر سے ہندو اور مسلمان دونوں سخت برہم ہوئے اور جابجا فسادات ہوئے۔اس وقت بنارس میں ایک پلٹن سکھ اور ایک رسالہ موجود تھا چنانچہ ۴ جون ۱۸۵۷ء کو کرنیل بہادر نے چاہا کہ ہتھیار لے لیں۔سپاہیوں نے یہ خبر سنی تو گھبرا کر حملہ کرنا چاہا۔چنانچہ گوروں کے ہاتھوں سے ہلاک ہوئے اور کچھ جوت پور بھاگے۔

شہر بنارس بالکل محفوظ رہا اور راجا دیونرائن کو بحسن کارگزاری 'راجا بہادر' کا گورنمنٹ سے خطاب ملا۔

۳۰۔اجراء ریل گاڑی:

۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۹ء میں بنارس میں ریل جاری ہوئی اور مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ [م ۱۸۸۹ء] نے ریل کا سفر کرکے کان پور پہنچ کر گورنر لارڈ کیننگ[۱] سے ملاقات کی۔

۳۱۔وفات مہاراجا بابو پرسدھ نرائن سنگھ والی بنارس:

۲۹/رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۵/جون ۱۸۵۹ء میں مہاراجا پرسدھ نارائن نے انتقال کیا جو بابو پربھونرائن سنگھ والی بنارس کے والد تھے۔لیکن بوقت انتقال رانی صاحبہ حمل سے تھیں، چنانچہ مہاراجا کے انتقال کے چند ماہ بعد بتاریخ ۱۵/ربیع الاول

---

[۱] یہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔۱۴/دسمبر ۱۸۱۲ء کو لندن میں پیدا ہوا اور ۱۷ جون ۱۸۶۲ء کو انتقال ہوا۔ع ب نعمانی

۱۲۷۲ھ ۲۶؍نومبر ۱۸۵۵ء کو ہوئی۔

۳۲۔عیدگاہ کاشی ودیا پیٹھ:

مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ نے اپنی زندگی میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ ودیا پیٹھ کی عیدگاہ قابل ذکر ہے[1] جس پر یہ کتبہ بھی لگا ہوا ہے:

"زمین احاطہ مسجد عیدگاہ ہٰذا مہاراجہ سر پربھو نرائن سنگھ بہادر جی سی آئی ای والی بنارس نے بکمال شفقت ومہربانی واسطے ادائے کار مذہبی یعنی نماز عیدین وغیرہ کے اہالیان اسلام کو بلا کسی معاوضہ کے عطا فرمائی۔"

یہ عیدگاہ بالکل لب سڑک کاشی ودیا پیٹھ کے صدر دروازے کے سامنے واقع ہے۔

۳۳۔کاشی ودیا پیٹھ:

۱۹۲۱ء میں بابو شیو پرشاد گپت [آنجہانی ۱۹۴۴ء] نے ۱۹۲۱ء میں اس ادارے کو قائم کیا جس کی حیثیت بعد میں یونیورسٹی کی ہوئی۔ اس کا سنگ بنیاد مہاتما

---

[1] اس عیدگاہ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے کا پس منظر یہ ہے کہ اس زمین پر ابتداء میں مسلمانوں نے عیدین کی نماز پڑھنی شروع کی تھی جس پر کوئی ممانعت نہ تھی، رفتہ رفتہ جب مستقل نماز ہونے لگی اور کچھ تعمیر ومرمت کا کام بھی ہونے لگا تو شہری انتظامیہ کی طرف سے مداخلت ہوئی جس کے خلاف اس زمانے کی اہم سماجی شخصیت جناب مولوی فیض القدیر کی جانب سے ایک درخواست کمشنر کو دی گئی کہ ہم لوگ ایک عرصہ سے اس زمین پر نماز ادا کرتے چلے آرہے ہیں لہٰذا امسال راجا کی جانب سے روک ٹوک کی وجہ دریافت کی جائے۔ چنانچہ کمشنر نے مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ کو خط لکھا اور تاکیدی طور پر یہ بھی لکھ دیا کہ چونکہ یکم اپریل کو عید ہے، لہٰذا اس سے قبل کوئی فیصلہ ہوجانا چاہئے۔ مہاراجا نے اس معاملہ میں روک ٹوک اپنی شان کے خلاف سمجھ کر اس زمین کو عام مسلمانوں کو عیدین کی نماز ادا کرنے کے لیے مستقل طور پر دے دی۔ اور چونکہ مہاراجا صاحب پربھو نرائن سنگھ سے کافی محبت کرتے تھے، اس لیے عیدگاہ مذکور پربھو نرائن سنگھ کی جانب سے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کتبے میں بجائے ایشری پرشاد نرائن کے پربھو نرائن سنگھ لکھا گیا ہے۔ [تاریخ بنارس ۳؍۲۲۴] یہ عیدگاہ وقف بورڈ لکھنؤ میں مندرج ہے اور اس ناچیز کے زیر صدارت کمیٹی کے ذریعہ اس کا سارا انتظام والنصرام عمل میں آتا ہے۔ ع ب نعمانی

گاندھی [مقتول ۱۹۴۸ء] کے ہاتھوں مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۲۱ء کو رکھا گیا۔ اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، جمنالال بجاج وغیرہ بھی موجود تھے۔

۳۴۔ مرزا رجب علی بیگ سرؔور:

آپ ایک باکمال ادیب، مایۂ ناز شاعر اور غازی الدین حیدؔر والی لکھنؤ، [متوفی ۱۸۲۷ء] ونواب واجد علی شاہ [متوفی ۱۸۸۷ء] کے ہمعصر اور مرزا افانی نوازش میر سوز کے شاگرد رشید تھے۔ ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۹ کو مہاراجا ایشری پرشاد ونرائن سنگھ بہادر کاشی نریش والی بنارس [متوفی ۱۸۸۹ء] نے انہیں اپنا خاص شقہ بھیج کر بنارس طلب کیا، چنانچہ سرؔور بنارس آئے۔ مہاراجا موصوف نے بے انتہا قدر کی اور انہیں اپنا مہمان بنایا۔ یہ آخر عمر تک تقریباً دس سال یہیں رہ گئے۔ 'گلزار سرور' اور 'شبستان سرور' بنارس ہی میں تصنیف کیں جو 'حدائق العشاق' کا ترجمہ ہے اور مرزا غالبؔ [متوفی ۱۸۶۹ء] نے اس پر بڑی پرزور تقریظ لکھی ہے جو یہ ہے:

> "سبحان اللہ خدا کی کیا نظر افروز صنعتیں ہیں، تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں۔ یہ جو 'حدائق العشاق' کا فارسی زبان سے عبارت اردو میں نگارش پاتا ہے، ارم کا زمین دنیا سے اٹھ کر بہارستان قوس کے ایک باغ میں جاتا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے نخل بند و آبیار ہوے۔ یہاں مرزا رجب علی بیگ صاحب سرؔور حدائق العشاق کے صحیفہ نگار ہوے۔ اس مقام پر ہیچ میرز جو موسوم بہ اسد اللہ اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے، خداے جہاں آفریں فہم وادراک سرور سحر بیان کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیا گراں پایہ ہے؟

سرؔور کے بنارس میں قیام کے دوران دسمبر ۱۸۶۱ء میں مہاراجا پٹیالہ مہاراجا بنارس سے ملنے کے لیے آئے، اس موقع پر مہاراجا پٹیالہ نے سرؔور کو سونے کے کڑے

کی جوڑی دی تھی۔

سرؔور نظم اور نثر دونوں میں یکتا تھے۔ بعد خرابی اودھ ملازم ریاست بنارس ہوے۔ مہاراجا سے پہلی ملاقات ندیسر کی کوٹھی میں ہوئی جو برنا ندی سے قریب ہے۔ سرؔور نے بطور لطیفہ کہا:

"حضور کی بدولت پیری میں برنا دیکھا"[1]

مہاراجا یہ جملہ سن کر بے حد خوش ہوے۔

سرؔور اردو شعراء کے اساتذہ میں تھے، شاعر اور صاحب دیوان اور افسانہ نگار بھی تھے۔ افسانہ میں ان کی مشہور کتاب 'فسانۂ عجائب' ہے جس میں اس عہد کے لکھنؤ کی مکمل تصویر ہے۔

۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۷ء میں محمد واجد علی شاہ [متوفی ۱۸۸۷ء] کی تخت نشینی پر یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا:

بہار جوش پہ ہے اور نئی ہے کیفیت
سرور سب کو ہے کہتے ہیں متقی و رند
جو زیب تخت ہوا شب کو شاہ نیک اختر
ہوا ہے سال جلوس اس لیے 'چراغ ہند'
۱۲۶۳ھ

ایڈورڈ ہفتم[2] کی شادی کے موقع پر مہاراجا بنارس کی فرمائش پر سرؔور نے ایک تہنیت نامہ بعنوان 'نثرہ نثرہ نثار' تحریر کیا، جو کافی پسند کیا گیا۔

سرؔور کے علمی شاہکاروں میں فسانۂ عجائب، سرور سلطانی، شرار عشق، شگوفۂ

---

[1]: اس جملے کا دو مفہوم ہے۔ پہلا تو یہ کہ حضور کی بدولت بڑھاپے میں جوانی دیکھی اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بڑھاپے میں برنا ندی دیکھ رہا ہوں۔ فارسی میں 'برنا' بمعنیٰ 'جوان' ہوتا ہے۔ ع ب نعمانی

[2]: اس کا پورا نام البرٹ ایڈورڈ (Albert Edward) تھا۔ ۹ نومبر ۱۸۴۱ء کو پیدا ہوا۔ ۲۲ رجنوری ۱۹۰۱ء سے اپنے یوم وفات ۶ مئی ۱۹۱۰ء تک ہندوستان کا حکمراں رہا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

محبت، نثرنثرہ نثار، شبستان سرور، گلزار سرور، انشائے سرور قابل ذکر ہیں۔

سرؔور ۸۵ سال کی عمر میں رات کے وقت گر گئے اور چوٹ کھانے کے کئی روز بعد ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں بمقام رام نگر انتقال کیا اور فاطمان کے باہری دروازے کے قبرستان میں دفن ہوے۔ان کی قبر کے قریب ہی ملا باقر مجلسی [متوفی ۱۱۱۰ھ] کا بھی مزار ہے۔ بدایوں کے ایک شاعر منشی دیبی پرشاد سحر نے یہ تاریخ وفات کہی:

مرد چوں شاعر بے مثل سرور — در جہاں شور وشغب کرد ظہور
ہست جاری بزبان ہر کس — ہائے آمد الم و رفت سرؔور
۱۲۸۴ھ

۳۵۔نواب محمد علی، خان آف ٹونک:

ہندوستان کی تاریخ میں بیک وقت مسند علم اور مسند سیاست پر جلوہ افروز ہونے والی شخصیات میں آپ کا نام نامی زندہ جاوید رہے گا۔کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم اور ملک دونوں نعمتوں سے نوازا تھا۔آپ ٹونک کی ریاست کے فرمانروا تھے، جو ۱۸۱۷ء میں عالم وجود میں آئی اور جو راجستھان کی ریاستوں میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اس کے بانی نواب امیر الدولہ محمد امیر خاں تھے جو ایک بہادر افغانی تھے۔

جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند ہوا، جسے انہوں نے 'غدر' کا نام دیا اور اس کے نتیجے میں بے شمار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا، نواب محمد علی صاحب انگریزوں سے مسلمانوں کے اس قتل عام کا بدلہ لینے کی فکر میں تھے، لیکن افسوس کہ ان کے کچھ قریبی لوگ ہی انگریزوں کے وفادار نکلے جنھوں نے انگریزوں کو نواب صاحب کے ارادوں سے باخبر کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو راجستھان اسٹیٹ 'کولاوہ' کے ٹھاکروں کے قتل کے الزام میں سرغنہ قرار دے کر تخت حکومت سے معزول کر کے بنارس بھیج دیا گیا اور یہاں انگریزوں نے بجرم بغاوت آپ کو نظر بند کر دیا۔

بنارس میں نواب صاحب کا قیام ۲۰ سال رہا۔آپ کا دربار علماء، شعراء و

ارباب فن سے معمور تھا۔ آپ کے یہاں جگرؔ مرادآبادی [متوفی ۱۹۶۰ء] کے والد ملازم تھے اور یہیں ۱۸۹۰ء میں جگر پیدا ہوئے۔

نواب صاحب ایک زبردست عالم تھے اور آخر عمر تک تصنیف وتالیف سے شغف رکھا اور رفاہ عام کے بہت سے کارنامے انجام دیے۔ آپ کا قیام نواب پیلس نرائن پور میں تھا، جو بعد میں مسمار ہوکر بھوجو بیر میں واقع یو پی کالج کی تعمیر کے وقت اس کے احاطہ کے اندر شامل ہوگیا۔ اپنے محل سے قریب ہی نواب صاحب نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی، جو چھوٹی مسجد نواب ٹونک کے نام سے اب بھی یو پی کالج کے احاطہ کے اندر موجود ہے۔

۳۶۔ مسجد نواب ٹونک:

نواب صاحب نے بنارس میں دوسری عالیشان مسجد شیو پور روڈ پر واقع گلٹ بازار میں ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۴ء میں تعمیر کرائی جو بالکل لب سڑک واقع ہے اور نواب ٹونک کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے صدر دروازے پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

در مسجد خواب شد تعمیر　　سن تعمیرا و چوں کرد نگاہ
پئے تاریخ مصرعہ استاد　　یاد آمد شبم زد نگاہ
از سر عقل و دانش گفت　　باب ہذا کباب بیت اللہ
۱۲۸۰ھ

نواب صاحب نے ۱۳۱۶ھ م ۱۸۹۸ء میں انتقال فرمایا، اور مذکورہ مسجد کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ آپ کے تفصیلی حالات میری دوسری تصنیف 'تذکرہ مشائخ بنارس' میں ملاحظہ فرمائیے۔

۳۷۔نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی بنارس تشریف آوری:

۱۸۶۱ء میں نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کسی ضرورت سے بنارس تشریف لائیں۔ ایشری پرشاد نرائن سنگھ مہاراجا بنارس نے ان کی خدمت میں چند اشیاء بطور تحفہ بھیجیں۔ ۱۷ نومبر ۱۸۶۱ء کو مہاراجا بنارس نے ان کے خیمے میں ملاقات کی اور اس کے دوسرے دن بیگم صاحبہ مہاراجا کی کوٹھی پر آئیں۔

کرنیل جان بی اسیرن بہادر سی پی پولیٹکل ایجنٹ بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں صاحب بہادر و محمد جلال الدین مدار المہام وغیرہ بھی ساتھ آئے تھے۔

۳۸۔سر سید احمد خاں:

۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء میں بحیثیت جج آپ کا غازی پور سے بنارس تبادلہ ہوا۔ قیام مقبول عالم روڈ برنا ندی کے کنارے 'مور کی کوٹھی' کے اندر تھا۔ یہ عمارت آج بھی موجود ہے۔

یہاں سر سید نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے۔ اس سے پہلے جب سر سید ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں مقیم تھے، اس وقت دیونرائن سنگھ مہاراجا بنارس کی سرپرستی میں وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت اور مسلمانوں کو سائنس و جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے غازی پور ہی میں سائنٹیفک سوسائٹی نامی ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ 'رفیع الاخبار' کے نام سے بنارس سے ایک اخبار بھی جاری کیا جو منشی سید فدا حسین کی ادارت میں جواہر اکسیر پریس محلّہ سلیم پورہ میں چھپتا تھا۔ یہ بنارس کا سب سے پرانا پریس تھا جو ڈاکٹر غلام ربانی حمیدی ساکن سلیم پورہ بنارس کے مکان میں واقع تھا۔

بنارس کے زمانۂ قیام میں سر سید کو یہ خیال ہوا کہ ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے کوئی طریقہ بہتر نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے بنارس میں اس کے لیے ایک کمیٹی بنائی اور اسی سال ایک شفاخانہ بنام 'ہومیو ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل' کھولا جو اسی کمیٹی

کے ماتحت تھا۔اس کے صدر مہاراجا بنارس اور سکریٹری خود سرسید تھے۔اس شفا خانہ کا چرچا چند ہی دنوں میں دور و نزدیک تک ہوگیا، چنانچہ پہلے ہی مہینے میں ۵۱۶ مریض آئے۔سرسید نے اس کے اصول علاج پر ایک لکچر بھی دیا اور ایک رسالہ بھی لکھ کر شائع کیا۔اسی سنہ میں بنارس کے چند سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی خط موقوف ہوجائے اور اس کی جگہ بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔چنانچہ اس کام کے لیے ہندوؤں نے کمیٹیاں بنائیں، سبھائیں کیں اور گورنمنٹ کو میمورنڈم بھیجے۔سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو اور مسلمان کو بطور ایک قوم کے دونوں کو ملا کر ساتھ چلنے کی کوشش کرنا محال ہے۔سرسید نے اردو کی حمایت میں مضامین لکھے جس کی وجہ سے اس وقت اردو کے مخالفوں کی تدبیریں کارگر نہ ہوسکیں۔

۱۸۲۲ء میں ہندوؤں نے ایجوکیشن کمیشن کو میمورنڈم بھیجے۔سرسید نے باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا کہ یہ مسئلہ تعلیمی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا پولیٹکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے ملکی مصالح وابستہ ہیں۔اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ ہندوؤں نے سرانٹونی مکڈانل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پھر ایک میمورنڈم اردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت میں پیش کیا۔اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہموم اور رنج والم کے سبب [جس کا سب سے بڑا سبب ان کے بڑے بیٹے سید حامد کی علالت اور سوءمزاج تھا] ایک سکتہ کا عالم تھا کہ وہ بالکل نقش بردیوار بن گئے تھے مگر اس حالت میں بھی انہوں نے ایک مضمون لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے ۹ دن پہلے شائع ہوا۔اس کے بعد انہوں نے میمورنڈم کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں دیں۔اس وقت تو ہر آنر نے عدالتوں کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی لیکن سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور رزولیوشن پاس ہوگیا جس کی رو سے عدالت کی زبان بجائے ہندی یا اردو کے

انگریزی رکھی گئی۔

سرسید جس سال بنارس آئے تھے اسی سال وہ اپنے دونوں لڑکوں حامد و محمود کو لے کر ولایت چلے گئے تھے۔تیسرے سال یعنی ۱۲۸۶ھ م ۱۸۷۰ء میں وہ بنارس واپس ہوئے۔لندن کے سفر ہی میں انہوں نے حضرت رسول اللہ ﷺ کی سوانح عمری لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔اس کے لکھنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ انگریزی کا مشہور مصنف کارلائل اس وقت سرسید سے مذہبی مباحثہ کیا کرتا تھا۔

لندن سے واپسی کے بعد بنارس ہی سے ان کا مشہور اخبار 'تہذیب[1] الاخلاق' پہلی بار ۱۲۸۷ھ م ۱۸۷۰ء سے لے کر ۱۲۹۲ھ م ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔دوسری بار ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء سے لے کر ۱۲۹۹ھ م ۱۸۸۱ء تک، اور تیسری بار ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۴ء سے لے کر ۱۳۱۴ھ م ۱۸۹۷ء تک شائع ہوتا رہا۔

سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' کے ساتھ ہی ۲۶ ردسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں ایک کمیٹی 'خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان' قائم کی۔اس کے مقاصد کا اعلان پہلے ہی سے اشتہار و اخبار کے ذریعہ کرا دیا تھا اور اس کے لیے مضامین نگاری کرائی گئی جس کا اعلان کرایا گیا اور انعام بھی دینے کا وعدہ کیا گیا۔اس سلسلے کا پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ایم اے کو ملا جو اس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے۔

سرسید کے وقت میں بنارس کا صحافتی مقام بہت اونچا ہو گیا تھا۔اس سلسلے میں بنارس کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ یوپی میں ہندوؤں کا پہلا اخبار ۱۸۳۰ء میں بنارس سے شائع ہوا جس کا نام 'سدھا کر اخبار' تھا۔اس کے ایڈیٹر تارا موہن متر تھے۔

1: اس اخبار کا اصل نام 'محمڈن سوشل ریفارمر' تھا۔اس میں تمام مضامین اردو میں چھپتے تھے۔صفحات کی تعداد ۸ یا ۱۲ ہوا کرتی تھی۔اس کے اجراء کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کو جدید تہذیب اور سائنس کے فوائد سے روشناس کرانا تھا تا کہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔اس اخبار میں ایسے ایسے مضامین آپ نے تحریر کیے جن کی بدولت مسلمانان ہند کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوا اور علی گڑھ تحریک کی بنیاد پڑی۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

اس کے علاوہ غدر ۱۸۵۷ء سے تقریباً ۳۵ سال پہلے گووند گرو ناتھ کی ادارت میں 'بنارس اخبار' اردو میں نکلتا رہا۔ اس اخبار کو مہاراجا نیپال سے مدد ملتی تھی۔ پھر ۱۸۵۱ء میں 'باغ و بہار' کے نام سے مہاراجا بنارس کی سرپرستی میں ہندوؤں کا دوسرا اردو اخبار نکلا۔ پھر ۱۸۵۱ء میں 'آفتاب ہند' کے نام سے تیسرا اخبار نکلا۔ اس کے ایڈیٹر بابو گووند رگھوناتھ تھے۔ اس کے بعد ہندوؤں کے مختلف اخبار نکلتے اور بند ہوتے رہے، لیکن سرسید کا 'تہذیب الاخلاق' کافی دنوں تک نکلتا رہا۔ ابتدا میں سرسید نے 'مسلمان سوشل ریفارمر' کے نام سے بھی ایک اخبار بنارس ہی سے جاری کیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا اور تعلیم و روزگار کے متعلق ان کو ہوشیار کرنا تھا۔

۳۹۔ مسجد لوہٹیہ کبیر چورا:

کبیر چورا اسپتال کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو اسپتال کی تعمیر کے وقت شہید ہوگئی جس سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس زمانے میں سرسید غازی پور میں جج تھے۔ انہوں نے بنارس آکر مسلمانوں کو مطمئن کیا اور لوہٹیہ میں ۱۳۰۳ھ م ۱۸۸۶ء میں ایک زمین اپنے نام سے خرید کر وقف فی سبیل اللہ کر کے اس پر مسجد تعمیر کرائی۔

۴۰۔ ڈیوک الفریڈ[1] پسر ملکہ وکٹوریہ:

۱۲۸۵ھ م ۱۸۶۹ء میں ۱۷ جنوری کو ڈیوک الفریڈ پسر ملکہ وکٹوریہ مع لارڈ میو بسیاحت ہند بنارس آئے جن کے استقبال میں بہت چراغاں کیا گیا۔

---

[1]: یہ ۶ راگست ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے اور ۳۱ رجولائی ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۴۱۔ مسجد باز اودھو پورہ[1]:

۱۲۸۶ھ میں مسجد باز تعمیر ہوئی جسے ساکنان محلّہ اودھو پورہ نے تعمیر کرایا۔ محراب پر ایک کتبہ بھی نصب ہے۔

۴۲۔ سید تراب علی خاں بہادر سپہ سالار:

۱۳۰۴ھ میں نواب شجاع الدولہ مختار الملک سید تراب علی خاں سپہ سالار نائب سلطنت حیدر آباد بنارس آئے۔

۴۳۔ جنگلی شیر کا واقعہ:

۱۲۸۷ھ م ۱۸۷۱ء کو ایک جنگلی شیر رات کے وقت جنگل کی طرف سے شہر میں داخل ہوگیا۔ اس کے مارنے کی تدبیریں کی گئیں، جس کے نتیجے میں اکثر اشخاص زخمی ہوے۔ آخر کار ایک بندوق سے مارا گیا۔

۴۴۔ پرنس آف ویلز[2] کی صحت پر بنارس میں جشن:

۱۲۸۸ھ م ۱۸۷۲ء میں ۲۷ فروری یوم دوشنبہ بوقت صبح باہتمام سید احمد خاں بہادر نجم الہند وجج بنارس، وسید علی حسن صاحب تحصیلدار کے اہتمام سے کثیر تعداد میں

---

[1]: یہ مسجد اب 'انجمن کی مسجد' کے نام سے مشہور ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ 'انجمن تعلیم الاسلام' کے نام سے یہاں ایک ادارے کا قیام عمل میں آیا تھا جس کے زیر اہتمام مسجد ہذا میں ایک مدرسہ کے ذریعہ دینی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مدرسہ کافی عرصہ تک چلا لیکن کچھ نا مساعد حالات کا شکار ہو کر کئی مرتبہ بند بھی ہوا، لیکن اب بحمد اللہ تقریباً دو سال سے پابندی سے اپنے مقاصد قیام کی تکمیل میں مصروف ہے۔ یہ مسجد ۱۹۹۶ء میں جدید تعمیر سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اس کی تعمیر نو کے موقع پر جب مذکورہ بالا کتبے کو باہر نکالنے کی کوشش کی گئی تو بوجہ کمزور اور خستہ ہونے کے وہ صحیح سالم باہر نہ نکالا جا سکا اور اس کے ٹکڑوں کو وہیں دفن کر دیا گیا۔ ع ب نعمانی

[2]: اس کا نام البرٹ ایڈورڈ (Albert Edward) تھا۔ ۹ نومبر ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا اور ۶ مئی ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

مسلمانوں نے جمع ہوکر اس بات کی خوشی منائی کہ وکٹوریہ کے لڑکے پرنس آف ویلز کو صحت ہوئی تھی اور شام ہندوؤں نے اپنی عبادتگاہوں میں خوشیاں منائیں۔

۴۵۔ مسجد چھتہ تلے:

۱۲۸۷ھ م ۱۸۷۱ء میں حرمت النساء بیگم ساکن چھتہ تلے نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ محراب کے اندر کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

۴۶۔ کالی مسجد سلیم پورہ:

۱۱۸۹ھ میں شیخ عبدالرحیم عرف رحیم دمڑی نے محلّہ سلیم پورہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو کالی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا سال تعمیر ۱۱۸۹ھ ہے جو مسجد کے اندر لگے ہوئے اس کتبہ پر درج ہے[۱]: ہوالقیوم

آنکہ عبدالرحیم نیک شاہ　　مسجدی ساخت پرصفا چو نعیم
سال تعمیر او چوں می جستم　　گفت ہاتف 'مقام ذکر حلیم'
۱۱۸۹ھ

۴۷۔ شدید سیلاب اور وباء:

۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۵ء میں بارش اور گرہن کے موقع پر اس کثرت سے آدمی آئے کہ وبا پھیل گئی اور کثرت سے لوگ مرے۔ اسی سال دریا میں اس قدر سیلاب آیا کہ دشاشمیدھ، کودئی چوکی، نواب گنج وغیرہ میں لوگ کشتیوں سے آتے جاتے تھے۔ پھر اس طرح کے سیلاب کا دوسرا نمونہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا۔

۴۸۔ مسجد پر ہلادگھاٹ:

یہ مسجد ۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۴ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کے بانی عبدالعزیز کے نام کا کتبہ

---

[۱] افسوس کہ مسجد مذکور کی تعمیر نو کے موقع پر یہ کتبہ ضائع ہوگیا۔ ع ب نعمانی

محراب میں درج ہے۔

۴۹۔سرکاری اسپتال:

۱۲۹۳ھ م ۱۸۷۷ء میں ۵رجنوری کو ایچ آر ایس پرنس آف ویلز ولی عہد انگلستان ہندوستان کا سفر کرتے ہوے بنارس آئے اور اسپتال کی بنیاد رکھی۔

۵۰۔جلسہ تہنیت و دربار عام:

سنہ ۱۸۷۶ء میں کوئن وکٹوریہ نے اپنا لقب قیصرۂ ہند و شہنشاہ رکھا اور اس کی تہنیت میں بنارس میں ایک جلسہ ہوا اور گورنر جنرل وائسرائے ہند نے دہلی میں دربار عام کیا۔

۵۱۔اسپتال کا اجراء:

۱۲۹۷ھ م ۱۸۸۰ء میں لارڈ پن وائسرائے گورنر جنرل بہادر نے بنارس آ کر ہسپتال موسومہ 'پرنس آف ویلز' کو جاری کیا، جس کی بنیاد ۱۸۷۷ء میں پڑی تھی۔

۵۲۔مسجد انگلشیا لائن:

۱۲۹۸ھ م ۱۸۸۱ء میں شیخ نوبت صوبیدار ساکن انگلشیا لائن نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد کے اندر یہ کتبہ لگا ہے: "نوبت تعمیر مسجد ہذا در ۱۲۹۸ھ"

اوران کی بیگم نے اسی سنہ میں مسجد کے باہر کنواں تعمیر کرایا جس کے اندر یہ کتبہ لگا ہوا ہے[1]:

"زوجہ نوبت چاہ ساخت"

۱۲۹۸ھ

۵۳۔ وفات مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ والی بنارس:

۱۳۰۶ھ م ۱۳؍ جون ۱۸۸۹ء میں مہاراجا ایشری پرشاد نے انتقال کیا، جو مہاراجا اودیت نرائن سنگھ [متوفی ۱۸۳۴ء] کے فرزند متبنیٰ تھے اور بڑے صاحب ذوق تھے۔ انہوں نے مولوی سید محمد صاحب مصنف 'عجب العجائب' کو جو لکھنؤ سے بنارس آئے تھے، اپنے مصاحبین میں شامل کیا۔ مہاراجا موصوف نے 'سبحۃ المرجان' کا فارسی ترجمہ کرایا۔ اور مرزا تقی دردؔ نے مہاراجا کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے دست خاص سے لکھا ہوا اپنا دیوان نذر کیا، جو مہاراجا کے کتب خانے میں اب تک محفوظ ہے۔

۵۴۔ جارج پنجم والی ہند[2] کی بنارس میں آمد:

۱۳۲۰ھ م ۱۹۰۲ء ۲۱؍ فروری کو جارج پنجم والی ہند بنارس آئے اور رئیس القوم

---

[1]: اس مسجد کا نگر نگم میں نمبر S.21/6 مندرج ہے۔ ۲۰۰۷ء میں جب اس مسجد کی نئی تعمیر ہونے لگی تو یہ کتبہ بسبب کمزور وخستہ ہونے کے کئی ٹکڑوں میں ہو گیا جو دوبارہ لگانے کے قابل نہ رہا، چنانچہ وہیں ایک عرصہ تک پڑا رہا جو اب غائب ہو چکا ہے۔

صوبیدار صاحب نے جس زمین پر یہ مسجد تعمیر کرائی تھی وہ دالمنڈی کی رہنے والی پریجان نامی ایک طوائف سے ۱۸۷۹ء میں خریدی تھی۔ صوبیدار صاحب کون تھے، کہاں کے رہنے والے تھے، باوجود تحقیق کے معلوم نہ ہو سکا۔

اوپر متن میں جس کنویں کا تذکرہ آیا ہے وہ آج سے دس سال قبل تک آباد تھا، لیکن وہ اب نہ صرف غیر آباد، بلکہ اس علاقے کے کچھ ملک کی مشہور فرقہ پرست تنظیموں کے اراکین نے اس پر ناجائز قبضہ کرنے کا ناپاک منصوبہ بنالیا ہے، جس کی پشت پناہی افسوس کہ اس علاقے [سکرول تھانے] کے قانون کے 'محافظ' فرما رہے ہیں جس کی وجہ سے اس کنویں کی صفائی نہیں ہو پا رہی ہے اور مصلیان مسجد کو پریشانی درپیش ہے۔ ع ب نعمانی

[2]: اس کا پورا نام جارج فریڈرک ارنسٹ البرٹ (George Frederick Ernest Albert) تھا۔ ۳ جون ۱۸۶۵ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ والد کا نام جارج ایڈورڈ (George Edward) [متوفی ۱۹۱۰ء] تھا۔ مئی ۱۹۱۰ء سے اپنی موت تک برطانیہ اور برطانوی دولت مشترکہ کا بادشاہ اور ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ ہند کے عہدے پر متمکن ہوا اور ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

مولانا الحاج خلیل الرحمٰن صاحبؒ [متوفی ۱۳۵۳ھ] کے مکان واقع کچی باغ اور سردار رحمت اللہ صاحب [متوفی ۱۸۸۰ء] کے مکان واقع کٹیھر پر آئے اور ان دونوں حضرات کو 'خان صاحب' کا شاہی لقب بھی ملا جس کی تہنیت میں ۲۸ رجب ۱۳۲۰ھ م ۱۲ فروری ۱۹۰۲ء کو کوئنس کالج میں جلسہ ہوا۔

۵۵۔ ندوۃ العلماء کا گیارہواں اجلاس اور علمی نمائش:

مولانا شبلی نعمانیؒ کی دور معتمدی کا ایک خاص کام بنارس میں ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کے گیارہویں اجلاس کا انعقاد تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۴/ اپریل ۱۹۰۶ء کو بنارس کے ٹاؤن ہال میں ایک علمی نمائش بھی لگائی جو اس وقت کے ماحول میں ایک نئی چیز تھی۔ اس میں ہندوستان کے قدیم ترین تحریری سرمائے اور شاہی فرامین سجائے گئے تھے۔ شہر کے انگریزی حکام بڑے شوق سے اس میں شریک ہوئے، خصوصاً کمشنر صاحب ایک ایک چیز کو نہایت غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ علماء وفضلاء بھی دور دراز سے آئے ہوئے تھے جنہیں اگرچہ فرامین وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن فن حدیث کی جو نادر کتابیں مہیا کی گئی تھیں اور جن میں سے بعض صحیح بخاری سے بھی پہلے کی تصنیف تھیں، ان کو خواہ مخواہ اپنی طرف مائل کرتی تھیں۔

مشہور خطاطوں کے نمونے، نادر کتابیں مصنفین کے ہاتھ کے مسودات، سلاطین وامراء کی تحریریں، فرامین واحکام شاہی بکثرت فراہم کیے گئے تھے۔ بعض فرامین جو ہندی زبان میں تھے وہ تیرہ تیرہ سو سال پرانے تھے۔ اسلامی زمانہ کے فرامین تغلق سے لے کر احمد شاہ پسر محمد شاہ کے زمانہ تک کے تھے۔ ان فرامین کو دیکھنے سے اسلامی تہذیب وتمدن کا صحیح اندازہ ہوتا تھا۔ ان کا کاغذ، سیاہی، شان خط، حسن تحریر دیکھنے کے قابل تھی۔ چھ چھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی کاغذ اپنی حالت پر قائم تھے۔ سیاہی کا یہ حال تھا کہ لکھنے والا گویا ابھی لکھ کر اٹھا ہے۔ اس نمائش کی مفصل کیفیت 'مقالات شبلی' جلد ۸ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۵۶۔مہاراجابنارس کواختیار ریاست کی سپردگی:

۱۳۳۰ھ م ۱۹۱۱ء میں مہاراجا ریاست بنارس سر پربھونرائن[۱] جی سی ای آئی کو گورنمنٹ نے ریاست کے تمام امور تفویض کیے۔اس وقت ریاست کا کل رقبہ ۸۶۵ میل، مردم شماری ۳۴۶۹۶۳ اور سالانہ آمدنی ۱۶ لاکھ ۸۰ ہزار ہوگئی تھی۔

۵۷۔کالی آندھی:

۶ صفر ۱۳۳۴ھ م ۱۹۱۶ء چیت کے آخری اتوار کو غازی میاں کی لگن کے دن ایک سخت کالی آندھی آئی جس سے سارے شہر میں بالکل رات کی طرح کا اندھیرا چھا گیا، جو قیامت صغریٰ کا ایک نمونہ تھا۔

۵۸۔بلوہ آغا شاہی:

۲۱ رمضان ۱۳۴۹ھ م ۱۹۳۱ء میں بلوہ آغا شاہی ہوا۔

۵۹۔بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام:

۱۳۳۲ء مطابق ۱۹۱۶ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ [متوفی ۱۹۴۶ء] نے

[۱]: یہ ۲۶ نومبر ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوے۔مہاراجا ایشری پرشادنرائن [متوفی ۱۸۸۹ء] کے بھتیجے، ان کے متبنیٰ اور جانشین تھے۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۳۱ء تک تخت حکومت پر متمکن رہے اور ۴ر اگست ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

بنارس ہندو یونیورسٹی کو قائم کیا جس کے مرکزی کیمپس کا سنگ بنیاد اس وقت کے وائس رائے لارڈ ہارڈنگ[1] کے ہاتھوں ۴ر فروری ۱۹۱۶ء کو رکھا گیا[2]

۶۰۔ متواتر اور بھیانک تین زلزلے:

۱۳۵۲ھ م ۱۹۳۴ء میں ایک ہفتہ کے اندر تین زلزلے آئے۔ [۱] ۲۸ر مضان کو ۲ بجے دن کے بعد۔ [۲] ۲۹ رمضان کو دن میں ۱۰ بجے جو بہت خفیف تھا۔ [۳] ۴ شوال سنیچر کی شب میں ۱۲ بجے کے بعد جو پہلے سے کم اور دوسرے سے زیادہ تھا۔ ان متواتر تین زلزلوں سے لوگ کافی ڈر گئے تھے۔

۶۱۔ بلوہ سانڈ شاہی:

محرم ۱۳۵۸ھ م ۱۹۳۹ء میں بلوہ سانڈ شاہی ہوا جس کا سبب وشویشور گنج میں دو سانڈوں کا آپس میں لڑنا تھا۔

۶۲۔ آل انڈیا تاریخی سنی کانفرنس:

۱۳۶۵ھ م اپریل ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس ٹاؤن ہال میں منعقد ہوئی، جس میں صرف علماء ومشائخ اہل سنت کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ ان میں حضرت پیر جماعت علی شاہ، حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی، حضرت صدرالدین مولانا امجد علی مصنف بہار شریعت، حضرت ملک العلماء مولانا ظفر الدین فاضل بہاری کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

---

[1]: یہ ۲۰ر جون ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوا۔ ۲۳ نومبر ۱۹۱۰ء سے ۴ر اپریل ۱۹۱۶ء تک ہندوستان کے وائس رائے کے عہدے پر رہا اور ۲ر اگست ۱۹۴۴ء کو انتقال کیا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا]

[2]: مزید: یہ یونیورسٹی ۱۳۷۰ر ایکڑ رقبے، ۱۴۰ر اعلیٰ تعلیمی شعبوں، ۷۰ قیام گاہوں اور پندرہ ہزار طلبہ وطلبات پر مشتمل ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ کاشی کتھا ڈاٹ کام]

۶۳۔ طاعون:

تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ نوسو برس کے بعد طاعون کا دوبارہ حملہ ۱۸۹۵ء میں بمبئی میں ہوا۔ وہاں سے شروع ہو کر ہندوستان کے تقریباً تمام گوشوں میں ایسا پہنچا کہ شاید ہی کوئی قصبہ اور دیہات بچا ہو۔ یہاں تک کہ ۱۳۲۱ھ م ۱۹۰۳ء میں بنارس کے قریبی اضلاع جیسے اعظم گڑھ وغازیپور میں بھی پہنچا اور ایسی بری طرح سے ان مقامات پر حملہ آور ہوا کہ نہ جانے کتنے گاؤں برباد اور ویران اور مکانات کھنڈر ہو کر بے نام ونشان ہو گئے۔ بحمد اللہ اس وقت تک بنارس اس سے محفوظ رہا، البتہ دو ایک دفعہ گولا دینا ناتھ میں اس کا زور ہوا اور وہیں تک محدود رہا۔

لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں بنارس میں بھی اس کا اثر آ گیا اور آنے کے ساتھ ہی حملہ کرنا شروع کر دیا جو آہستہ آہستہ پورے شہر میں اثر انداز ہونے لگا۔ طاعون کے نتیجے میں جو ویرانی اور بربادی کے قصے لوگ سنا کرتے تھے، افسوس کہ ان حالات سے اب اس شہر کے لوگوں کو بھی گزرنا پڑا اور تقریباً سبھی عمر کے متعدد لوگ لقمہ اجل ہو گئے۔

۶۴۔ اجلاس جمعیۃ علماء ہند:

جمعیۃ علماء کی ایک میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ بنارس میں ایک صوبائی اجلاس کیا جائے۔ چنانچہ ۲۲/۲۳/۲۴/دسمبر ۱۹۴۸ء کی تاریخیں مقرر ہو گئیں اور اجلاس کی تیاری اور اس کے نظم ونسق کی تمام تر ذمہ داری حضرت مولانا محمد اسحٰق بنارسیؒ [متوفی ۱۹۸۶ء] کو سونپی گئی اور محض ۸ دن کا موقع اجلاس کی تیاری کے لیے ملا۔ اسی مختصر سی مدت میں اس اجلاس کی مکمل تیاری کی گئی۔ اس اجلاس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ [متوفی ۱۹۵۷ء] سے لے کر جمعیۃ علماء کے تمام عہدیداران، کارکن اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس قلیل مدت میں اس کانفرنس کے انتظام کی خوبی کو دیکھ کر

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی [متوفی ۱۹۶۲ء] نے فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ یہ اجلاس ایسا عظیم الشان ہوگا تو میں اسے 'کل ہند' قرار دیتا۔

انگریزوں کے دور حکومت کے اہم واقعات تحریر کردیے گئے۔ اس کے بعد بنارس کا کوئی ایسا واقعہ قابل ذکر نظر نہیں آتا۔ البتہ بنارس کی تاریخی عمارتیں جن کا اکثر وبیشتر تذکرہ بقدر تلاش کردیا گیا ہے، ایک اہمیت رکھتی ہیں اوران میں مسلمانوں ہی کے آثار نمایاں ہیں۔

ہندوستان کی آزادی اور انگریزی حکومت کا خاتمہ

تقریباً ۲۰۰ سال تک انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی تھی ،مگر مکمل طور سے ان کی فتوحات اور اقتدار کے باوجود ہندوستانیوں کے دل سے آزادی کا خیال نکلا نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں باقاعدہ آزادی کی لڑائی شروع ہوگئی ،جس کی ابتداء میرٹھ سے ہوئی ۔جس میں بہار اور یوپی کے مختلف شہروں سمیت بنارس کے عوام نے بھی حصہ لیا۔

۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء میں جب سر سید احمد خاں بنارس سول کورٹ میں جج تھے ، ان کے دور میں بھی آزادی کی تحریک مکمل طور پر بنارس میں پھیل چکی تھی ۔اس سلسلے میں سر سید نے ایک رسالہ 'اسباب بغاوت ہند' بھی تحریر کیا تھا ،جس میں انہوں نے انگریزوں کی سخت مذمت کی تھی ۔ بالآخر ۲۸ / رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ م ۱۵ /اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا ۔اب ذیل میں آزادی ہند کے بعد بنارس میں جو قابل ذکر واقعات پیش آئے ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ قتل مہاتما گاندھی اور بنارس کا سوگ:

ربیع الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ناتھورام گوڈسے کے ہاتھوں گاندھی جی قتل ہوئے ۔جس سے سارے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی اور پوری دنیا میں ہر جگہ ان کا سوگ منایا گیا ۔بنارس کے تمام ہی ہندو اور مسلمانوں نے مل کر ایک بہت بڑا ارتھی کا جلوس نکالا جو میدا گن سے اسی گھاٹ تک گیا۔

گاندھی جی اہنسا کے پجاری ، ہندو مسلم ایکتا کے زبردست حامی اور

ہندوستان کی جنگ آزادی کے عظیم سورما تھے۔

۲۔سیلاب:

۱۳۶۷ھ م۱۹۴۸ء اگست میں بنارس میں زبردست سیلاب آیا، نئی سڑک اور گودولیا سے ریوڑی تالاب تک کشتیاں چلتی رہیں۔ پندرہ دن کے بعد سیلاب ختم ہوا۔

۳۔شاہ سعودؒ والی عرب کی بنارس آمد:

۱۸ربیع الاول ۱۳۷۵ھ م۴؍دسمبر ۱۹۵۵ء میں شاہ سعود پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے۔اس کے لیے دہلی سے بنارس تک ریل کا اسپیشل ڈبہ حکومت نے تیار کرایا تھا۔ یہاں مہاراجا بنارس کے مہمان تھے۔اس دن تمام مندروں اور تمام سرکاری عمارتوں پر ایک جھنڈا لگایا گیا تھا، جس پر کلمہ شریف تحریر تھا۔شاہ کے استقبال پر بنارس کے مسلم وغیر مسلم دونوں نے بیک زبان نعرۂ تکبیر بھی بلند کیا تھا[۲]

۴۔ملکہ ایلزبتھ [دومؑ] کی بنارس آمد:

۱۳۷۹ھ م۱۹۶۰ء میں ملکہ ایلزبتھ والیہ انگلستان بنارس آئیں اور مہاراجا بنارس کی مہمان ہوئیں۔

---

[۱]: یہ ۲؍اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ریاست گجرات کے ساحلی شہر پور بندر میں پیدا ہوے۔اصل نام تو موہن داس کرم چند گاندھی تھا، لیکن 'مہاتما گاندھی' اور 'گاندھی جی' سے زیادہ شہرت پائی۔تحریک آزادی کے رہنما کے ساتھ آپ روحانی پیشوا بھی تھے۔ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[۲]: یہ ۱۹ مئی ۱۹۱۰ء کو ریاست مہاراشٹر کے پونہ ضلع میں بارامتی علاقے میں پیدا ہوا۔والد کا نام ونایک وامن راؤ گوڈسے تھا، جو ایک پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ناتھورام کا اصل نام رام چندر تھا۔بعد میں ناتھورام سے مشہور رہوا۔تعلیم وغیرہ سے فراغت کے بعد پہلے اکھل بھارتیہ کانگریس میں، پھر آر ایس ایس میں شامل ہوا۔لیکن ۱۹۳۰ء میں آر ایس ایس سے نکل کر اکھل بھارتیہ ہندو مہاسبھا میں چلا گیا اور 'ہندو راشٹر' نامی ایک جریدے کا ایڈیٹر ہوا، جس سے اس کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس نے گاندھی جی کے قتل کا پہلی مرتبہ منصوبہ اس وقت بنایا تھا جب کہ وہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو دہلی کے 'برلا ہاؤس' میں اپنی دعائیہ مجلس میں مصروف تھے۔ لیکن اس منصوبے میں اسے ناکامی ہاتھ لگی۔ پھر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مذکورہ بالا مقام پر وہ مجلس کی ابتداء سے ۴۰ منٹ پہلے ہی پہنچ گیا اور ان سے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا، اس کے بعد بلا کسی تاخیر کے اپنی پستول سے ۳ گولیاں مار کر انہیں قتل کر دیا۔ قتل کے بعد پنجاب ہائی کورٹ میں گوڈسے کے خلاف ۲۷ مئی ۱۹۴۸ء سے مقدمہ چلنا شروع ہوا۔ بالآخر ۱۵/نومبر ۱۹۴۹ء کو پنجاب کے انبالہ جیل میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۳: آپ شاہ عبدالعزیز آل سعود [متوفی ۱۹۵۳ء] کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوے۔ ۹ نومبر ۱۹۵۳ء کو تخت نشین ہوے۔ ان کے زمانے میں مملکت کو جہاں کافی نفع ہوا، وہیں کچھ افسوس ناک حالات کا بھی شکار ہونا پڑا۔ افسوس کہ شاہ سعود کے اندر اتنا تدبر اور انتظامی صلاحیت نہیں تھی جتنی ان کے بھائی شاہ فیصل کے اندر تھی۔ چنانچہ شاہی خاندان اور علماء کے دباؤ میں ۲۴ مارچ ۱۹۵۸ء میں شاہ سعود نے تمام ملکی اختیارات شہزادہ فیصل کے سپرد کر دیا جو اس وقت حجاز کے گورنر اور ملک کے وزیر خارجہ کے عہدے پر تھے اور شاہ سعود کی حیثیت صرف ایک آئینی بادشاہ کی ہو کر رہ گئی۔ شاہ فیصل کے بڑھتے اثرات اور ان کی روز افزوں مقبولیت سے شاہ سعود کو خطرہ محسوس ہوا جس کے ازالے کے لیے انہوں نے کچھ ایسی نقل وحرکت کی جس کی پاداش میں انہیں ۲۹/اکتوبر ۱۹۶۴ء کو مستقل طور پر تخت سلطنت سے برطرف کر دیا گیا اور شاہ فیصل کو مستقل بادشاہ بنا دیا گیا، جس کے بعد شاہ سعود یورپی ممالک میں زندگی گزارنے لگے۔ بالآخر ۲۳ جنوری ۱۹۶۹ء میں یونان کے دارالحکومت ایتھینز میں وفات پائی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۴: اس دن ان کی گزرگاہوں میں پڑنے والے تمام ہی مندروں کو کپڑوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ اس صورتحال سے متاثر ہوکر بنارس کے ہر دلعزیز شاعر جناب نذیر بنارسی [متوفی ۱۹۹۶ء] نے ایک شعر کہا تھا جو عام طور سے زبان زد عوام خواص ہے:

ادنیٰ سا غلام ان کا گزرا تھا بنارس سے
منھ اپنا چھپائے تھے کاشی کے صنم خانے (ع ب نعمانی)

۵: ان کا پورا نام الیزبتھ الیکزینڈرا میری (Elizabeth Elexandra Mary) ہے۔ ۱۹۲۶/۴/۲۱ء کو لندن میں پیدا ہوئیں۔ یہ جارج ششم پرنس البرٹ ڈیوک کی بیٹی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ولی عہد بنائی گئیں، پھر ۶ فروری ۱۹۵۲ء میں اپنے باپ کی جانشین ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں اپنی ماں کی زیر نگرانی حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں لفٹنٹ فلپ ماؤنٹ بیٹن سے شادی ہوئی جو ہندوستان کے آخری وائس رائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بھتیجے ہیں۔ برطانیہ کے علاوہ کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور برازیل وغیرہ کی بھی یہ ملکہ ہیں۔ یہ دنیا کی واحد حکمراں ہیں جن کی ایک سے زائد آزاد ممالک پر حکمرانی ہے۔ شہزادہ چارلیس ان کا ولی عہد ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

بنارس میں ہندوؤں کی اہم عبادت گاہیں

بے انصافی ہوگی اگر اس کتاب میں ہندوؤں کی ان مندروں کا تذکرہ نہ کیا جائے جن کے باعث بنارس اہل ہنود کی نظر میں متبرک شہر ہے۔ اس لیے ذیل میں ان کا بھی تذکرہ کیا جارہا ہے۔ بنارس کے مشائخ اور حضرات اولیاء کرام کا تذکرہ اس کتاب کی دوسری جلد 'تذکرہ مشائخ بنارس' میں ملاحظہ فرمائیے۔

بنارس کی پوری تاریخ تین حصوں میں منقسم ہوتی ہے:

۱] آریوں کا ابتدائی دور حکومت، اس کے بعد بدھوں کی ہمہ گیر حکومت کا زمانہ

۲] ہندوؤں کا طویل عہد حکومت۔

۳] مسلمانوں کا نوسو سالہ دور حکومت۔

ان تینوں عہد حکومت کی تاریخ اس کتاب میں تفصیل سے آگئی ہے۔ انگریزوں کا دور حکومت تقریباً دوسو برس ہے اس لیے اس کے واقعات بھی جستہ جستہ آگئے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا تینوں دور حکومت میں مسلمانوں کا عہد زیادہ نمایاں رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس دور حکومت کے واقعات اور حالات کا بہت بڑا تحریری سرمایہ موجود ہے۔ باقی سلطنتوں کے واقعات کا سرمایہ زیادہ تر زبانی روایات ہیں۔

لیکن پھر بھی ہندوؤں کے دور حکومت کی بہت سی یادگاریں آج بھی زندہ جاوید ہیں، جن کی بنا پر یہ شہر ہر دور میں ہندوؤں کی نظر میں بڑا متبرک اور مقدس مقام رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر دور میں غیر ملکی سیاح آتے اور مختلف انداز سے اس کے چرچے ہوتے رہے۔ مرزا غالب نے یہاں کے بتوں اور عبادتگاہوں کے لیے بڑے فخر

سے کہا تھا کہ:

عبادت خانۂ ناقوسیاں است

ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

یہاں تک تو غنیمت تھا کہ غالب نے بنارس کو ہندوستان کا کعبہ سمجھا، لیکن ایک ایرانی سیاح الحاج زین العابدین شیروانی آج سے تقریباً ۲۵۰ سال پہلے جب بنارس آئے تو انہوں نے اپنے سفرنامہ 'بستان السیاحہ' میں بنارس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

شهر یست خلد برین و مدینه ایست دلنشیں از اقلیم دوم و
هوایش گرم و آبش از چاه بعضے از رود، الحق مقام محمود است۔

ترجمہ: "بنارس ایک شہر ہے جو خلد کے مانند اور دلنشیں ہے اقلیم دوم میں ہے، وہاں کی ہوا گرم اور اس کا پانی کنویں کا اور بعض نہر کا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ مقام محمود ہے۔"

بنارس تمام ہندوؤں کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے اور ان کی مقدس مذہبی کتابیں، اس شہر کے تقدس کے ذکر سے بھرپور اور یہاں کے واقعات سے لبریز ہیں۔

سنسکرت ادبیات میں ویدوں، برہمن گرنتھوں اور اپنشدوں کے بعد سب سے اول وہ دو کتابیں جو حکایات رزم و بزم سے بھری ہوئی ہیں، وہ رامائن اور مہابھارت ہیں۔ اور یہ بھی بنارس کی ایک اہم خصوصیت ہے کہ رام چرت مانس کو تلسی داس نے بنارس ہی میں تصنیف کیا۔ ان کے علاوہ خاص کاشی کے واقعات و حالات سے متعلق تین کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ کاشی رہسیہ ۲۔ کاشی کھنڈ ۳۔ کاشی مہاتم

بنارس کو ہندو اپنے عقیدے کے مطابق موکچھ کی نگری کہتے ہیں، چنانچہ ہندوستان کے تمام اطراف و اکناف سے ہر سال لاکھوں یاتری اس شہر کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور سیکڑوں یہاں رہ کر اپنی زندگی کے آخری ایام گزارتے ہیں، اور یہاں

رہ کر موت آجانے کو مکتی [نجات] کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

بنارس میں راجا ہریشچندر نے صداقت کی خاطر اپنی ہر چیز کو قربان کر دیا۔ رانی بیجا بائی، رانی اہلیا بائی اور رانی بھوانی والیہ بنگال کی بھی خصوصی توجہات اس شہر پر رہی ہیں۔ ان کے بنوائے ہوئے کافی تعداد میں مندر اور تالاب اب بھی موجود ہیں۔

اس شہر میں ان کے متعدد رفاہی ادارے ہیں جو مخیّر ہندوؤں نے قائم کیے ہیں اور جن کے زیر اہتمام ہندو سادھو سنیاسیوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر مندروں میں یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ وہ بیوائیں جو یہاں اپنے آخری ایام بسر کرنے کی غرض سے آتی ہیں وہ اپنا مختصر سرمایہ اس مندر کے حوالہ کر کے تا عمر کھانے پینے کی فکر سے آزاد ہو جائیں۔ اس شہر کے متعلق ایک مشہور مقولہ یہ ہے کہ:

رانڈ، سانڈ، سیڑھی، سنیاسی
ان سے بچے تو سیوے کاشی

یعنی چار چیزیں بنارس والوں کے لیے زحمت کا باعث ہیں:

۱] وہ بیوائیں جو یہاں آ کر آباد ہو جاتی ہیں اور سڑکوں پر گھوم کر مسافروں اور زائرین کی زحمت کا سبب بنتی ہیں۔

۲] وہ بیل جو دیوتاؤں کے نام پر چھوڑے جاتے ہیں۔

۳] وہ نیچی نیچی سیڑھیاں جو گھاٹوں پر بنی ہوئی ہیں۔

۴] وہ بھیک مانگنے والے سادھو سنیاسی جو یاتریوں کو نوچ کھاتے ہیں۔

بہر حال ہندوؤں کی زبان پر بنارس کی عظمت و تقدس کا بڑا چرچا ہے۔ ان کی بعض عبادت گاہوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ورتکال کا مندر:

محلّہ دارانگر سے متصل یہ مندر شہر کے شمالی حصے میں ہے اور روایات کے لحاظ

سے بہت قدیم ہے۔اس سے متعلق شفاے امراض اور درازیِ عمر کی کہاوتیں مشہور ہیں۔تعمیر کا صحیح زمانہ تو معلوم نہ ہوسکا البتہ اس کی قدامت میں کوئی شبہ نہیں۔

۲۔برہما کا مندر:

برہما گھاٹ پر واقع اس مندر میں پیتل کی پلیٹوں پر ہیرے کی تین سوئیاں نصب ہیں۔ان میں ہر سوئی بیس انچ لمبی ہے اور شہد کی مکھی کے برابر موٹی ہے۔اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب خدا نے دنیا بنائی تو سونے کی ۶۴ پلیٹیں ایک سوئی میں اس طرح پرودیں کہ بڑی پلیٹ سب کے نیچے اس سے چھوٹی اس کے اوپر،اسی طرح تمام پلیٹیں رکھی ہوئی ہیں۔برہما کے عقیدے کے مطابق پلیٹیں ایک سوئی سے دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہیں،اور ایک وقت میں صرف ایک پلیٹ ہٹ سکتا ہے اور جب تمام پلیٹیں پھر اپنی اصلی حالت میں آجائیں گی،یعنی یہ کہ سب سے بڑی سب سے نیچے اس سے چھوٹی اس کے اوپر،تو مندر دھڑام سے زمین پر آ رہے گا اور ساری دنیا تہس نہس ہو جائے گی۔یہاں پجاریوں کی ہر وقت ڈیوٹی لگی رہتی ہے۔

۳۔بشیشور کا مندر:

یہ دوسرے مندروں کے مقابلے میں بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے جو شیو کے نام پر معنون کیا جاتا ہے۔بنارس کا بڑا دیوتا ویشیشور ہے،بنارس کے تمام ہندو ہر سال ایک جم غفیر کے ساتھ پوجا کرتے ہیں۔یہ مندر ۵۱ فٹ اونچا ہے۔زیادہ بڑا نہیں ہے۔اسے ۱۸۷۵ء میں اہلیا بائی نے بنوایا۔انگریزوں نے اس کا نام گولڈن ٹمپل [سونے کا مندر] رکھا ہے،کیونکہ اس کے صحن کے بڑے قبے اور چوٹی پر تانبے و سونے کا پتر منڈھا ہوا ہے جو راجا رنجیت سنگھ [متوفی ۱۸۴۹ء] پنجاب نے ۱۸۳۹ء میں چڑھایا۔

اس مندر کا دوسرا نام وشوناتھ جی کا مندر ہے۔اس کے اندر دارا شکوہ [متوفی

۱۶۵۹ء] کا ایک فرمان بھی موجود ہے جس کا ذکر داراشکوہ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ اس کے نوبت خانہ کی تعمیر شاہ عالم [متوفی ۱۸۰۶ء] کے دور میں ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔ اس وقت علی ابراہیم خاں حاکم بنارس تھے۔ جیسا کہ اس کتبے سے ظاہر ہے:

"ایں نوبت خانہ مہادیو بشیشور رابفرمودہ نواب عمادالدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن ہسٹینگز بہادر جلاوت جنگ دام اقبالہ در سنہ یک ہزار و دوصد ہجری امین الدولہ عزیز الممالک علی ابراہیم خاں بہادت میر جنگ حاکم شہر بہ اہتمام مرزا ندر باقی بیگ خاں تعمیر نمود کہ روزگار یاد گار شد سمب ۱۸۴۲۔"

اس مندر کے باہر ایک بارہ دری ہے جس میں گیان واپی نام کی باولی موجود ہے۔ اسے ۱۸۰۹ء میں بیجابائی نے تعمیر کرایا جو ماتحت فوجی افسر کی بیوہ تھیں۔ اس میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

"دالان و فرش احاطہ گیان واپی و دروازہ جنوبی از طرف سرکار میر منت بیجابائی صاحبہ اہلیہ مہاراجہ عالی جاہ دولت تیار شد بموجب حکم صاحبان عالیشان کمیٹی شہر بنارس صورت تعمیر پذیرفت۔"

۱۸۲۸ء میں مہاراجا گوالیار کے ایک افسر نے گیان واپی میں کنواں از سرنو تعمیر کرا دیا جسے موجودہ وشوناتھ مندر کے صدر دروازے سے دکھن جانب راجا یونا نے ۱۷۲۵ء میں بنوایا تھا۔

۴۔ مان مندر:

یہ بھی قدیم عمارتوں میں ہے، اس کے ساتھ ہی ایک قدیم رصدگاہ بھی ہے جہاں سورج اور چاند کی گردش کے حالات دیکھے جاتے تھے جو قابل دید ہے۔ آمیر کے راجا جے سنگھ نے ۱۱۰۴ھ مطابق ۱۶۹۲ء میں یہ رصدگاہ تعمیر کرائی۔

۵۔ گوپال مندر:

یہ پنچ گنگا گھاٹ پر واقع ہے جو شہر کا مشہور مندر ہے۔ یہ بلبھ آچاریہ[1] کی یاد میں تعمیر کیا گیا۔ اس میں کرشن کی مورتی ہے۔ بلبھ آچاریہ فلسفہ و پرانت کے بانی تھے اور ان کا مسلک یہ تھا:

ازخرمن کائنات کردم چوں نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

۶۔ بندو مادھو مندر[2]:

یہ مندر پنچ گنگا گھاٹ پر واقع ہے اور شری لکشمی کانت مشرا اس کے مہنت ہیں[3]

۷۔ سیتارام مندر:

یہ مسجد دھرھرہ پنچ گنگا گھاٹ کی دیوار سے لگی ہوئی عمارت ہے جو اکبر کے حکم سے راجا مان سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ جیسا کہ اس کے اندر موجود اس محضر نامہ سے ظاہر ہے:

"شری مہاراجہ مان سنگھ بہادر بیکنٹھ باشی در کاشی جی آمدہ بجہت استدراک سعادت معرفت وحقیقت تلاش پنڈتاں ومحققاں نمودند واز بزرگاں من گوشائیں رام گوپال جیو کہ بالائے پنچ گنگا گھاٹ ریاضت می نمود ملاقات کردند واز حسن ارشادات گوشائیں موصوف اطمینان خاطر

۱: ہندوؤں کے یہ مذہبی رہنما ۱۴۷۹ء میں چمپارن میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام لچھمن بھٹ تھا۔ سات سال کی عمر میں چاروں ویدوں، رگ وید، یجروید، سام وید اور اتھروید سے ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ان کے والد مستقل قیام کے ارادے سے بنارس آئے تھے، لیکن کچھ نامساعد حالات کے نتیجے میں انہیں پھر واپس جانا پڑا۔ بلبھ آچاریہ ۱۵۳۰ء میں بنارس آئے تھے اور ہنومان گھاٹ پر مقیم ہوئے۔ ۱۵۳۱ء میں بنارس ہی میں انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

۲: یہ مندر مہاراشٹر کے مہاراجا کے ایک نمائندہ بھاون راؤ کا بنوایا ہوا ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ کاشی کتھا ڈاٹ کام]

۳: ان کا انتقال ہو گیا، موجودہ مہنت کا نام مرلی دھر پٹوردھن ہے۔ ع ب نعمانی

خود حاصل ساختہ ہرگاہ کہ از میر اطراف وجوانب معاودت کردند باز
بکاشی جی تشریف آوردند بالائے پنچ گنگا گھاٹ بسیارے زمین زرخرید
نمودہ یکے مندر سیتارام جی ودوئمی مندر بند مادھو جی تیار کنانیدند۔"

۸۔ نیپالی مندر:

مہاراجا نیپال کے بنوائے ہوئے للتا گھاٹ پر واقع اس مندر کا ستون اور چھت لکڑی کی ہے اور کافی قدیم ہے، جیسا کہ اس پر بنے ہوئے آسنوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن سنہ تعمیر معلوم نہ ہوسکا۔

۹۔ کال بھیرو:

تھانہ کوتوالی کے ٹھیک پیچھے یہ مندر ہے اور محلے کا نام بھی یہی ہے۔ بنارس کے مندروں میں کافی مشہور ہے۔

۱۰۔ درگا مندر:

یہاں بندر بکثرت پائے جاتے ہیں، اس لیے یہ بندروں کا مندر بھی مشہور ہے۔ یہ مندر ایک چوپہل چھت کے اندر ہے۔ اس کا دروازہ چاندی سے بنایا گیا ہے۔ یہ مندر اٹھارویں صدی ہجری میں بنگال میں واقع ناٹھور کی رانی نے تعمیر کرایا۔ درگا دیوی شیو جی کی تین عورتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کا مجسمہ ایسا ہے جس سے مخالفین کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے متصل ہی درگا کنڈ ہے جس میں غسل باعث برکت وطہارت مانا جاتا ہے۔

۱۱۔ بھارت ماتا مندر:

اس کا نام تو یہی مشہور ہے مگر یہ کوئی مندر نہیں، بلکہ ہندوستان کے نقشہ کی ایک نمائش ہے، جسے بنارس کے بابو شیو پرشاد گپت[1] نے تیار کیا۔ اس کا افتتاح ۱۹۳۶ء میں مہاتما

گاندھی[مقتول ۱۹۴۸ء] نے کیا تھا۔ فی الحال یہ کاشی ودیا پیٹھ کے ماتحت ہے۔

۱۲۔ تلسی مانس مندر:

اسے ۱۹۶۴ء میں شری کرشن لال سوریکا نے اپنی والدہ کی یادگار میں تعمیر کرایا، جس میں دو کروڑ روپے خرچ ہوے۔ یہ مندر تلسی داس اور وشنو کی عقیدت میں تعمیر ہوا۔ اس کی سنگ مرمر کی دیواروں پر تلسی داس کی تخلیق رام چرت مانس مکمل تحریر کی گئی ہے۔ زمینی منزل پر تلسی داس کا مجسمہ اور دوسری منزل پر رام چندر جی، ہنومان جی، سیتا جی و لکشمن جی کی تصویریں ہیں اور بائیں بازو پر شیو اور انّ پورنا اور دائیں بازو پر وشنو کی مورتیاں ہیں۔ اس کے صحن میں ایک باغ ہے جس میں ہمالیہ پہاڑ سے شیو کے ذریعہ گنگا

ا: یہ ایک نہایت مالدار اور زمیندار گھرانے میں ۲۸ جون ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوے۔ بھارت ماتا مندر کے علاوہ یہ کاشی ودیا پیٹھ کے بھی بانی ہیں۔ یہ گاندھی جی کے نہایت عقیدت مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکبر پور میں گاندھی آشرم بنانے کے لیے ڈیڑھ سوا ایکڑ زمین دی، تاکہ کھادی کے کپڑوں کی کثرت سے خرید و فروخت ہو سکے۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے بنارس کا مشہور اور قدیم ہندی اخبار ''آج'' قائم کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے کئی سال تک خزانچی بھی رہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام کے بعد ایک خطیر رقم [اس زمانے کے اعتبار سے] مبلغ ایک لاکھ ایک ہزار روپیہ بطور عطیہ پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی بہت ساری خدمات تھیں جن سے متاثر ہو کر انہیں مہاتما گاندھی نے ''راشٹریہ رتن'' کا خطاب دیا۔ حکومت ہند کی جانب سے ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا جا چکا ہے۔ ۲۴ راپریل ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ع ب نعمانی [بحوالہ سوتنترا آندولن اور بنارس، ص ۱۳۵، ووکی پیڈیا]

نکلتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ باقی بہت سے قدیم مندر ایسے ہیں، جن کی تفصیل ابھی تک دستیاب نہ ہوسکی، اس لیے ان کا نام ہی ذکر کرنا کافی ہوگا:

[۱] اپارناتھ ٹیکرامٹھ [۲] کالی مٹھ سورج کنڈ [۳] مندر اوگھڑ ناتھ کبیر چورا [۴] مندر کبیر داس کبیر چورا [۵] مندر گورکھ ناتھ میدا گن [۶] کال بھیرو، بھیروناتھ [۷] باگیشری مندر جیت پورہ [۸] انپورنا مندر [۹] آدھ بشیشور [۱۰] بلوا بیر [۱۱] لاٹ بھیرو [۱۲] سنکٹ موچن [۱۳] پشاش موچن [۱۴] جنگم باڑی۔

بنارس کا سب سے بڑا مٹھ جنگم باڑی ہے، جس کے اندر مغل بادشاہوں کے بہت سے فرامین موجود ہیں۔ ان بادشاہوں نے اس مٹھ کو بہت سی جاگیریں عطا کی ہیں، جن کی تفصیل پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

بنارس میں مندروں کی تعداد پندرہ سو اور مسجدوں کی تعداد ایک ہزار ہے[۱] مندروں کے ساتھ ساتھ گھاٹوں کی بھی بڑی اہمیت ہے، جن کی سارے ہندوستان میں مثال نہیں۔ یہ گھاٹ بڑے بڑے پتھروں سے بنے ہوے اور ۵ میل کی لمبائی میں پھیلے ہیں۔ ان پر مذہبی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ چند گھاٹوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ اسی گھاٹ[۲]: یہ گنگا اور اسی کے سنگم پر بنا ہے اور شہر کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔

---

[۱]: یہ تعداد آج سے تقریباً تیس سال قبل کی ہے۔ موجودہ دور میں دونوں کی تعداد اس سے مختلف ہے۔ ع ب نعمانی

[۲]: یہ بنارس کے اہم وقدیم گھاٹوں میں سے ایک ہے۔ اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ تلسی داس نے اسی گھاٹ کے ایک غار میں قیام کر کے 'رام چرترمانس' کی تخلیق کی تھی۔ پھر ۱۶۸۰ سمبت میں اسی گھاٹ پر ان کا انتقال بھی ہوا۔ یہ گھاٹ کافی بڑا تھا، لیکن ۱۹ویں صدی میں اسے پانچ حصوں اسی، گنگا محل، ریواں، تلسی اور بھدینی گھاٹوں میں تقسیم کردیا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں اس گھاٹ کی پختہ تعمیر ہوئی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ کاشی کتھا ڈاٹ کام]

Scanned by CamScanner

یہاں سے دریا کے پار ریاست بنارس رام نگر کا شاندار اور وسیع قلعہ دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ دشاشومیدھ گھاٹ: اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ برہما نے شیو کے ارشاد کے مطابق یہاں دس گھوڑوں کی قربانی کی تھی، اس لیے یہ نام رکھا گیا۔ 'دشا' کے معنی دس اور 'شومیدھ' کے معنی گھوڑے کے ہیں۔ یہ گودولیہ اور مدنپورہ سے قریب ہے۔[1]

۳۔ ہریشچندر گھاٹ:[2] اسے مہاراجا ہریشچندر کی یاد میں بنوایا گیا ہے۔

۴۔ پنچ گنگا گھاٹ:[3] کہتے ہیں کہ یہاں پانچ دریا آ کر ملے ہیں، دھوت پاپا، یمنا، کرونا، سرسوتی اور گنگا۔ اس لیے یہ نام پڑا۔[4]

---

[1]: ۱۷۳۵ء میں اس گھاٹ کی تعمیر مہاراشٹر کے پیشوا باجی راؤ نے کرائی تھی۔ پرانے زمانے میں اس کا نام رودرسروور تھا۔ اس گھاٹ کی موجودہ تعمیر ۱۹۶۵ء میں صوبائی حکومت نے کرائی تھی۔ ع ب نعمانی [بحوالہ کاشی کتھا ڈاٹ کام]

[2]: سچائی کو فروغ دینے والے راجا ہریش چندر کی طرف یہ گھاٹ منسوب ہے۔ ۱۹۸۸ء سے قبل یہ بالو کی خرید و فروخت کا مرکز تھا، لیکن جب اسی سال گھاٹ کی پختہ تعمیر ہوئی تو یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ ساتھ ہی اسی سال بجلی سے لاشوں کو جلانے کے لیے عمارت کا بھی قیام عمل میں آیا جس کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

[3]: ۱۵۸۰ء میں اس گھاٹ کی پختہ تعمیر رگھوناتھ ٹنڈن نامی شخص نے کرئی تھی۔ اس پرانا نام بندو مادھو گھاٹ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں صوبائی حکومت کے ذریعہ گھاٹ کے نچلے حصے کی تعمیر کرائی گئی۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

[4]: ان میں سے صرف گنگا ہی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ باقی ندیاں زمیں دوز ہیں۔ یہ گھاٹ مختلف اسباب سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ من جملہ ان میں ایک یہ کہ تلسی داس نے اپنی 'ونا یک پتریکا' کو اسی گھاٹ پر لکھا تھا۔ دوسرے یہ کہ ویدوں کے عظیم ماہر سوامی رامانند اپنے شاگردوں کو یہیں پر تعلیم دیتے تھے۔ پھر یہ کہ مغل دور کی عظیم شاہی 'جامع مسجد دھرہرا' بھی یہیں پر واقع ہے۔ ع ب نعمانی
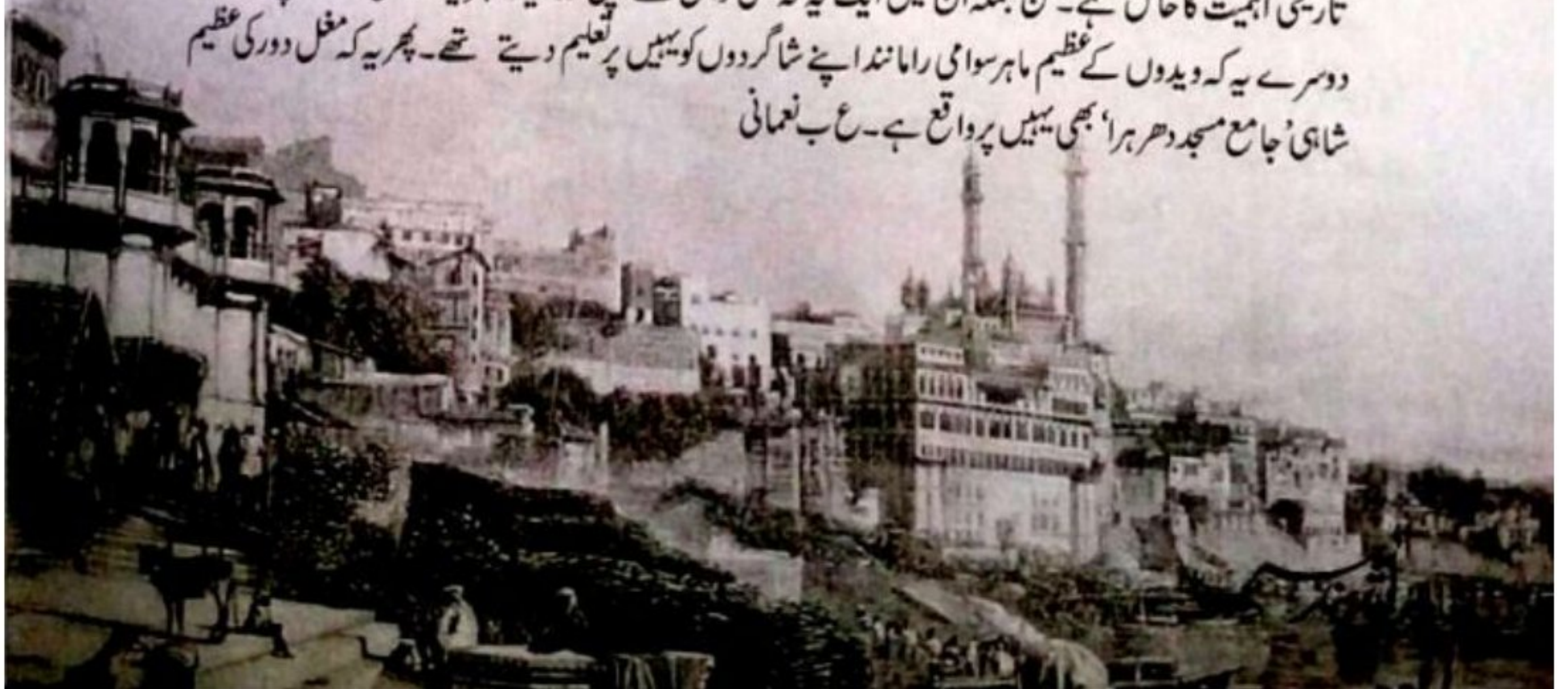
۵۔ منکرنکا گھاٹ[1]: اس گھاٹ پر مردے جلائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اور ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔[2]

۶۔ میر گھاٹ: میر رستم علی خاں حاکم بنارس نے [محمد شاہ کے عہد میں] یہ گھاٹ تعمیر کرایا۔[3]

۷۔ گیان واپی: [عقل کی باولی] وشیشور مندر کے اندر ہے، جہاں شیو کا استھان بتایا جاتا ہے اور مقدس عبادت گاہ سمجھی جاتی ہے۔

۸۔ امرت کنڈ: اس کا پانی امراض کے لیے شفا اور کوڑھ کے لیے مفید بتایا جاتا ہے۔

۹۔ ناگ کنواں: یہ بہت قدیم ہے اور شہر کے تھانہ جیت پورہ کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے نام سے محلّہ بھی مشہور ہے۔ یہاں ہر سال جاترا بھی ہوتی ہے اور سانپ کے کاٹنے سے محفوظ رہنے کے لیے ہندو اس میں دودھ چڑھاتے ہیں۔

---

[1]: اس گھاٹ پر واقع 'چکر پشکرنی' نامی کنڈ کی وجہ سے اس گھاٹ کا نام بھی وہی تھا بعد میں بدل کر منکرنکا گھاٹ ہوگیا۔ اس کنڈ کو ہندوؤں کے بھگوان وشنو نے شیو کی عبادت کرتے ہوئے اپنے 'چکر' سے کھودا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں صوبائی حکومت کے سینچائی محکمہ نے اس کی نئی تعمیر کرائی ہے۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

[2]: پہلے مردوں کو جلانے کا کام صرف ہریشچند گھاٹ پر ہی ہوتا تھا، لیکن اٹھارہویں صدی قبل کشمیری مل نامی ایک متمول شخص کی ماں کا جب انتقال ہوا تو ہریشچند گھاٹ پر لاش جلانے کے معاملے میں چنڈال سے کچھ کہاسنی ہوگئی، چنانچہ کشمیری مل نے وہاں سے ہٹ کر اس گھاٹ زمین خریدی اور یہیں اپنی ماں کی لاش کو جلایا۔ بعد میں یہ سب کے لیے عام ہوگیا۔

یہاں پر وشنو چرن پادو کا نام کا ایک چبوترا ہے۔ چالیس سال قبل تک مخصوص ہندوؤں کی لاشیں ڈی ایم سے اجازت لینے کے بعد اسی پر جلائی جاتی تھیں۔ لیکن اب اس پر کسی کی بھی لاش کے جلانے پر سخت پابندی ہے۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

[3]: ۱۷۳۵ء میں اس گھاٹ اور اس سے متصل ایک بڑے قلعہ کی بھی تعمیر عمل میں آئی۔ ۱۹۵۸ء میں صوبائی حکومت نے اس کی نئی تعمیر کرائی۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

گھاٹوں کا ایک قدیم نقشہ [بشکریہ برٹش میوزیم]

۱۰۔ پشاچ موچن: یہ لہورابیر میں واقع ہے جس کی عمارت کافی قدیم ہے۔ یہاں ایک کنڈ ہے۔ پشاچ موچن سنسکرت لفظ ہے جس کے معنیٰ ہیں شیطان کا دور کرنے والا۔ چونکہ اس کنڈ سے ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق شیطان بھاگتا ہے اس لیے اس کا یہ نام پڑا۔

مزید: اس کے علاوہ کچھ اور گھاٹ بھی ہیں جن کے نام اس طرح ہیں:

گنگا محل گھاٹ، [اول] ریواں گھاٹ، تلسی گھاٹ، بھدینی گھاٹ، جانکی گھاٹ، ماتا آنندمئی گھاٹ، وچھرا گھاٹ، جین گھاٹ، نشاد راج گھاٹ، پربھوگھاٹ، پنچ کوٹ گھاٹ، چیت سنگھ گھاٹ، نرنجنی گھاٹ، مہانروانی گھاٹ، شوالا گھاٹ، گلریا گھاٹ، ونڈی گھاٹ، ہنومان گھاٹ، کرناٹک گھاٹ، لالی گھاٹ، وجیہ نگرم گھاٹ، کیدار گھاٹ، چوکی گھاٹ، شمیشور گھاٹ، مان سرور گھاٹ، نارد گھاٹ، راج گھاٹ، پانڈے گھاٹ، دگپتیا گھاٹ، چوسٹی گھاٹ، رانا محل گھاٹ، دربھنگہ گھاٹ، منشی گھاٹ، اہلیابائی گھاٹ، شیتلا گھاٹ، [اول] پریاگ گھاٹ، راجیند ر پرساد گھاٹ، مان مندر گھاٹ، واراہی گھاٹ، تری پر بھیروی گھاٹ، للتا گھاٹ، جلشائی گھاٹ، سیندھیا گھاٹ، سنکٹھا گھاٹ، بھونسلہ گھاٹ، گنگا محل گھاٹ [دوم] اگنشور گھاٹ، گڑیش گھاٹ، مہتا گھاٹ، رام گھاٹ، جٹار گھاٹ، گوالیر گھاٹ، بالاجی گھاٹ، درگا گھاٹ، برہما گھاٹ، بوندی پرکوٹا گھاٹ، شیتلا گھاٹ، [دوم] لال گھاٹ، ہنومان گڑھی گھاٹ، گائے گھاٹ، بدری ناتھ گھاٹ، ترلوچن گھاٹ، گولا گھاٹ، نندیشور گھاٹ، شوکا گھاٹ، تیلیانہ گھاٹ، نیا گھاٹ، پرہلاد گھاٹ، نشادراج گھاٹ، رانی گھاٹ، راجا گھاٹ، کھڑکی گھاٹ، آدکیشو گھاٹ۔ ع ب نعمانی [ایضاً]

انگریزی دور کی چند اہم اشیاء و عمارتیں

انگریزی دور کی عمارتوں میں سب سے بڑی اور شاندار عمارت کوئنس کالج کی ہے۔ ٹاؤن ہال، کمپنی گارڈن، [میدا گن] راجا برلا ٹاور، [مچھودری] بنارس ہندو یونیور سٹی اور مالویہ پل وغیرہ قابل دید چیزیں ہیں۔

شہر کے ہوٹلوں میں کلارکس ہوٹل اور ہوٹل ڈی پیرس تقریباً ایک سو دس سال قدیم ہیں جن میں کلارکس ہوٹل کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ اس کے مالک سابق میئر بنارس برج پال داس تھے جن کے دیگر بڑے شہروں میں بھی کلارکس گروپ کے نام سے ہوٹل قائم ہیں۔ نئے ہوٹلوں میں تاج گروپ کا ہوٹل تاج گنگیز بہت ہی عالیشان ہے جو کافی رقبے میں ندیسر سے کچہری جانے والی روڈ پر واقع ہے۔ اس سے متصل ہی کینٹونمنٹ روڈ پر ہوٹل پرواز اور نئی سڑک پر فاران ہوٹل جلد ہی کی تعمیر ہے جو مسلمانوں کی ملکیت ہے۔

مالویہ پل:

انگریزوں کے دور میں اس کا نام ڈفرن برج تھا۔ یہ پہلے ایک منزلہ تھا جس پر صرف ریلوے لائن تھی لیکن ۱۹۴۸ء میں یہ دو منزلہ کر دیا گیا۔ اس میں اوپر سڑک ہے جس پر سے بسیں ٹرکیں اور دیگر سواریاں گزرتی ہیں اور وہ سڑک جی ٹی روڈ کو کلکتہ سے ملاتی ہے۔ جب کہ نچلی منزل سے ریل گزرتی ہے جو کاشی اور مغلسرائے کو کینٹ سے ملاتی ہے۔ اب اس کا نام مالویہ پل ہوگیا ہے، لیکن عوام میں 'راج گھاٹ کا پل' مشہور ہے۔ اس پل کی کل سات دریں ہیں جن میں سے ہر ایک کی چوڑائی ایک سو تین فٹ ہے۔[1]

ریلوے لائنیں:

بنارس میں ریلوے لائنوں کا جال بچھا ہوا ہے اور بڑی مرکزیت حاصل ہے۔ پورا شہر ان سات بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں پھیلا ہوا ہے:

مغل سرائے:[۲]

یہ ایسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے جو اب ایریا کے اندر آگیا ہے اور پورے ایشیا میں اتنا بڑا مرکزی ریلوے اسٹیشن کوئی نہیں ہے۔ حال ہی میں اسے جدید عمارت سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔

۲۔ کاشی:

یہ ریلوے اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں، لیکن دوسرے اعتبار سے اس کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ گنگا کے کنارے واقع ہے اور مغلسرائے سے گنگا کا ریلوے پل اس کو ملاتا ہے۔

۳۔ وارانسی:

پہلے اس کا نام بنارس چھاؤنی تھا۔ یہ بھی بنارس کا بڑا ریلوے اسٹیشن ہے اور چھوٹی بڑی دونوں لائنوں کا مرکز ہے[۳] چھوٹی لائن الہ آباد سے آکر بنارس سیٹی ہوتی ہوئی چھپرا، کٹیہار اور گورکھپور تک جاتی ہے[۴] اور بڑی لائن مغلسرائے سے ہوکر پرتاب

---

[۱]: اس پل کا افتتاح ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اس کی تعمیر میں روہیل کھنڈ وغیرہ کے انجینیروں کی سخت محنت و دماغ سوزی رہی ہے، جس کے نتیجے میں اس کا شمار ہندوستان کے اہم پلوں میں ہوتا ہے۔ ع ب نعمانی [بحوالہ وکی پیڈیا]

[۲]: یہ جنکشن ۲۰۰۵ء میں ایسٹ سینٹرل ریلوے کے ماتحت ہوگیا، جس کا ہیڈ کوارٹر حاجی پور بہار میں ہے۔ یہ اسٹیشن اب بنارس ضلع سے چندولی ضلع میں شمار کیا جاتا ہے۔ ع ب نعمانی

[۳]: اب یہ صرف بڑی لائن کا مرکز ہے۔ کیوں کہ ۹۹۔۱۹۹۸ء میں اس روٹ سے جانے والی سبھی چھوٹی لائنوں کو بڑی لائن میں تبدیل کر دیا گیا۔ ع ب نعمانی [۴]: ۱۹۹۰ء میں یہ لائن بھی بڑی لائن میں تبدیل ہوگئی۔

گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ تک اور پچھم میں الہ آباد لکھنؤ، دہلی و ممبئی تک جاتی ہے۔ بنارس کے عوام میں یہ اسٹیشن 'کینٹ' کے نام سے بھی مشہور ہے۔

۴۔ وارانسی سٹی:

یہ نارتھ ایسٹرن [چھوٹی لائن[۱]] کا خوبصورت اسٹیشن ہے۔ پہلے اس کا نام بنارس سٹی تھا لیکن عوام میں علوی پورہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، اس لیے کہ اس کے قریب ہی علوی پورہ کا علاقہ ہے، جہاں حضرت ملک افضل علویؒ کا مقبرہ ہے۔ یہاں سے چھوٹی لائن پورب میں سارناتھ ہوکر مئو اور گورکھپور تک، اور پچھم میں وارانسی ہوکر الہ آباد تک جاتی ہے۔ فی الوقت چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں بھی تبدیل کرنے کا عمل انجام پا رہا ہے، جس کے بعد بڑی لائن کے اسٹیشنوں میں اس کا شمار ہو سکے گا[۲]

۵۔ سارناتھ:

چھوٹی لائن[۳] کا نیا اسٹیشن تعمیر ہوا ہے۔ بدھ مذہب کا مقدس مقام ہونے کی وجہ سے نئی عمارت بھی بدھ ازم کی آئینہ دار ہے۔

۶۔ شیو پور:

یہ میونسپل ایریا کی سرحد پر واقع ہے اور بڑی لائن کی ٹرینیں یہاں سے گزرتی ہیں۔

۷۔ منڈواڈیہہ:

یہ بھی میونسپل ایریا کی سرحد پر واقع ہے، چھوٹی لائن[۴] سے گزرنے والی ٹرینیں یہاں رکتی ہیں اور کافی چہل پہل رہتی ہے۔ ڈیزل ریل انجن کارخانہ (D.L.W.) اس

۱، ۲، ۳، ۴: ۱۹۹۰ء میں یہ لائن بھی بڑی لائن میں تبدیل ہوگئی۔

سے قریب ہی واقع ہے[1]۔

---

[1]: یہ کارخانہ انڈین ریلوے بورڈ کے ماتحت اور ریلوے کی پروڈکشن یونٹ ہے، جس کا ذمہ دار اعلیٰ [چیف] جی، ایم، کہلاتا ہے۔ اس وقت اس منصب پر بی، پی، کھرے صاحب ہیں۔ اس کارخانے کا سب سے بڑا ذمہ دار سی، ایم، ای، [چیف میکینکل انجینیر] کہلاتا ہے۔ اس وقت اس عہدے پر شری راکیش بتاش صاحب ہیں۔ اس کارخانے کا قیام لال بہادر شاستری کے دور میں ۱۹۶۱ء میں عمل میں آیا تھا اور پہلا انجن ۳ جنوری ۱۹۶۴ء کو تیار ہوا جسے اس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے جھنڈی دکھا کر روانہ کیا تھا۔ یہاں اس وقت تقریباً ساڑھے چھ ہزار ملازمین ہیں۔ یہاں سے ہر سال ۱۳۰۰ انجن تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ یہ انجن جہاں اپنے ملک کے مختلف گوشوں میں سپلائی کیے جاتے ہیں وہیں بیرون ملک مثلاً تنزانیہ، بنگلہ دیش، سری لنکا، پاکستان، عمان، انگولا، میانمار، ملیشیا، سوڈان، ویتنام وغیرہ میں بھی ایکسپورٹ کیے جاتے ہیں۔ ع ب نعمانی

نوٹ: ریلوے کے تعلق سے یہ معلومات جناب قطب الدین صاحب [ریلوے ملازم وارانسی کینٹ] سے فراہم ہوئیں۔

صبح بنارس

'صبح بنارس' ہندوستان بھر میں بہت زیادہ مشہور ہے اور 'شام اودھ' کے ساتھ اس کا ذکر لازمی ہے۔ شاعروں نے اپنے اشعار کو ان دوناموں سے زینت بخشی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر روز تین بجے سحر سے لے کر آٹھ بجے صبح تک گنگا میں اسنان [نہانے] کرنے والوں کا گنگا کے گھاٹوں پر بہت بڑا ہجوم رہتا ہے۔ خاص طور سے دشاسومیدھ پر تو گویا ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے کسی اور شہر کی یہ خصوصیت نہیں ہے۔

اسی صبح بنارس سے متاثر ہو کر غالبؔ نے بنارس میں جو مثنوی لکھی تھی وہ اس کتاب کے شروع میں نقل کر دی گئی ہے۔ بنارس کے ایک مشہور شاعر آغا حشر کشمیری[1] نے بھی اس 'صبح بنارس' سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا:

ہوئیں یوں حسن کے افق پر تجلیات شباب پیدا
غبار زریں سے جیسے ہوتا ہے صبح کا آفتاب پیدا

شام اودھ سے مراد لکھنؤ کی شام ہے، کیونکہ وہاں شام کے وقت حضرت گنج اور امین آباد کے علاقوں میں کافی رونق اور چہل پہل سے صبح بنارس کی یاد تازہ ہو جاتی

ہے۔صبح بنارس اور شام اودھ اردو شاعری کا محبوب مضمون رہا ہے جسے باکمال شعراء نے طرح طرح سے باندھا ہے۔دور حاضر میں اسے خوبصورت استعارہ کے بطور بھی استعمال کیا گیا ہے۔ایسے ہزاروں شعر پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں صبح بنارس کے ذکر سے لفظی ومعنوی حسن پیدا کیا گیا ہے۔لیکن صفحات کی بے جا زیادتی کا خوف لاحق ہونے کے سبب یہاں انہیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔

بحمداللہ تعالیٰ

---

۱ : سرزمین بنارس کی شعری وادبی شخصیتوں میں جناب آغا حشر کاشمیری صاحب ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔آپ ۳؍۴؍۹؍۱۸۷ء میں پیدا ہوے۔اصل نام محمد شاہ اور آبائی وطن کشمیر تھا۔بنارس کے دالمنڈی علاقے میں جہاں آپ کی رہائش گاہ ہے وہ دراصل آپ کا ننہال تھا۔آپ کے والد آغا غنی صاحب [متوفی ۱۹۲۰ء] نکاح کے بعد مستقل طور پر یہیں قیام پزیر ہوگئے۔آغا صاحب کی ولادت، تعلیم وتربیت اور بود وباش بنارس میں ہی رہی۔شاعری میں اپنا استاد جناب محمد حسن فائز بنارسی [متوفی ۱۳۴۷ھ] کو منتخب فرمایا۔آپ کے بھتیجے جناب آغا جمیل صاحب [متوفی ۱۴؍۱؍اکتوبر ۲۰۰۱ء] ابن جناب آغا محمود صاحب تھے، جن کا انتقال ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں ہوا۔ان کے پانچ صاحبزادگان کے اسماء اس طرح ہیں:
[۱] آغا جمال احمد شاہ [۲] آغا کمال احمد شاہ [۳] آغا نہال احمد شاہ [۴] آغا عمران احمد شاہ [۵] آغا عرفان احمد شاہ۔
آغا حشر کشمیری صاحب کا انتقال ۱۹۳۵ء میں لاہور میں ہوا اور وہیں دفن ہوے۔ع ب نعمانی [بحوالہ آغا کمال وغیرہ]

فہرست مضامین

غزنوی دورِ حکومت کا خاتمہ اور غوری سلطنت کی ابتدا ۱۰۵

سلطان شمس الدین التمش کا دورِ حکومت اور بنارس ۱۰۷

بنارس خواجۂ جہاں ملک الشرق کے عہد میں ۱۱۹

دَورِ اکبری تاریخِ مغلیہ کا زرّیں دَور ۱۴۱

اورنگ زیب عالم گیر اور بنارس ۱۶۳

بنارس میں عہد اورنگزیب کی مسجدیں اور دوسری یادگاریں ۲۰۹

سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ۲۵۵

انگریزوں کا قدم ہندوستان میں ۲۵۹

انگریزی دورِ حکومت کے تاریخی واقعات ۲۶۳

ہندوستان کی آزادی اور انگریزی حکومت کا خاتمہ ۳۰۱

بنارس میں ہندوؤں کی اہم عبادت گاہیں ۳۰۵

انگریزی دور کی چند اہم عمارتیں ۳۱۷

مآخذِ تعلیقات

اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی:

ماخذ	نام مصنف	ناشر/مکتبہ	سن طباعت	تفصیل
بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی	تاج پبلشرز دہلی		کتب خانہ جامعہ مظہر العلوم
معارف القرآن	مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ	اعتقاد پبلی کیشنز دہلی	۱۹۹۳ء	ایضاً
نسائی شریف	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائیؒ	دار الفکر بیروت	۱۹۹۵ء	ایضاً
مسند امام احمد	احمد بن حنبلؒ	دار الفکر العربی		ایضاً
ترمذی شریف	محمد ابن عیسیٰ ترمذیؒ			ایضاً
شرح مواہب اللدنیہ	علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانیؒ		۱۹۹۶ء	ایضاً
افضل التواریخ	منشی رام سہائے تمنا	مکتبہ تمنائی، لکھنؤ	۱۸۷۹ء	ایضاً
منتخب التواریخ	مولانا عبدالقادر بدایونیؒ	مکتبہ نول کشور	۱۸۷۴ء	ایضاً
مفتاح التواریخ [فارسی]	منشی دانشور حسن رضا رائے			ایضاً
اودھ کا بیان			۱۸۸۴ء	ایضاً
آئینہ تاریخ نما	راجا شیو پرشاد	گورنمنٹ پریس الٰہ آباد	۱۸۷۴ء	ایضاً
تاریخ اودھ	بابو ہت پرشاد	مطبع دلکشا فتح گڑھ	۱۸۷۱ء	ایضاً
ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	ثروت صولت			ایضاً
فرہنگ آصفیہ	مولوی سید احمد دہلوی	رفاہ عام پریس لاہور	۱۹۰۸ء	ایضاً
تذکرہ علماء ہند [فارسی]	رحمان علی	مطبع نول کشور	۱۹۱۴ء	ایضاً
سیر اعلام النبلاء	حافظ شمس الدین ذہبیؒ	مؤسسہ الرسالہ، بیروت	۲۰۰۱ء	ایضاً
تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندویؒ	مکتبہ مدنیہ دیوبند	۲۰۰۳ء	ایضاً
وقائع عالمگیری	چودھری نبی احمد سندیلوی	نیشنل پریس الٰہ آباد		ایضاً

کتاب	مصنف	مطبع	ماخذ
تاریخ ایران	سرجان مالکم	انوار المطابع لکھنؤ	کتب خانہ جامعہ مظہر العلوم
تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیاء جونپور	اقبال جونپوری		ایضاً
قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون	مولانا محمد حنیف گنگوہی	حنیف بکڈپو دیوبند	بشکریہ مولانا اشتیاق احمد صاحب
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ		ندوۃ المصنفین دہلی	۱۹۶۹ء بشکریہ جناب خلیق الزماں صاحب
خلافت راشدہ اور ہندوستان	قاضی اطہر مبارک پوریؒ	جمال پرنٹنگ دہلی	۱۹۷۲ء ایضاً
عرب ہند تعلقات	علامہ سید سلیمان ندویؒ	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۸۴ء ایضاً
آب کوثر	شیخ محمد اکرامؒ	ادبی دنیا دہلی ۱۹۹۱ء	ایضاً
اردو انسائیکلوپیڈیا	مدیر اعلیٰ فضل الرحمٰن	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۱۰ء بشکریہ مولوی انصار احمد صاحب
ماہنامہ دین و دنیا	فروری ۱۹۷۸ء	موجود در کتب خانہ مولانا نجم الحقؒ مراد آباد	
سر السالکین		موجود در کتب خانہ سلام اللہ صدیقی مرحوم	
تذکرۃ الاولیاء	بابا فرید الدین عطارؒ		بشکریہ مولانا ریاض الدین نعمانی
حکمت بالغہ	ابو الجمال احمد مکرم عباسی چریا کوٹی		کتب خانہ دار العلوم دیوبند
ایک عالمی تاریخ	مولانا محمد عثمان معروفیؒ	مکتبہ عثمانیہ پورہ معروف	۱۹۹۷ء در کتب خانۂ خود
سکھ مذہب	پروفیسر محمد رفیق خاں	جامعہ سلفیہ بنارس	۱۹۹۳ء ایضاً
ہندوستان پر اسلامی حکومت	مفتی شوکت علی فہمی	دین دنیا پبلشنگ دہلی	سترھواں ایڈیشن ایضاً
سوتنترتا آندولن اور بنارس (ہندی)	ٹھاکر پرشاد سنگھ	وشوودیالیہ پرکاشن	۱۹۹۰ء ایضاً
مکہ مکرمہ ماضی و حال کے آئینے میں	استاذ محمد احمد شعبان	مرکز بحوث و دراسات مدینہ منورہ	۲۰۰۷ء ایضاً
مدنپورہ کی انصاری برادری	شاد عباسی	زرنگار کمپیوٹر مدنپورہ بنارس	۲۰۰۲ء ایضاً
تذکرہ مشائخ بنارس	مفتی عبد السلام نعمانیؒ	پرنٹیا وارانسی	۲۰۱۱ء ایضاً
سیرت سید احمد شہیدؒ	مولانا ابو الحسن علی ندویؒ		ایضاً

ایک شہزادے کی داستان	ڈاکٹر ہاشم رضا علی بخت			در کتب خانۂ خود
فیروز اللغات	مولوی فیروز الدین	انجم بکڈپو دہلی		ایضاً
اردو کی چوتھی	مولوی اسماعیل میرٹھی			ایضاً
ماہنامہ دار العلوم دیوبند	ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۰ء			ایضاً
تذکرۃ المتقین فی احوال خلفاء سیدنا بدیع الدین		مطبع قیومی، کانپور	۱۳۲۹ھ	ایضاً
مرقع بنارس	چودھری نبی احمد سندیلوی	سلطانیہ برقی پریس لکھنؤ	۱۹۳۹ء	ایضاً

Scanned by CamScanner

جامع مسجد گیان واپی

تاریخ کے آئینے میں

—— مفتی عبدالباطن نعمانی

بابری مسجد کی شہادت کے بعد بنارس کی جامع مسجد گیان واپی کا جاہ وجلال فرقہ پرستوں کو خائف کیے ہوے ہے۔اس مسجد کے بارے میں متعدد غلط پروپگنڈے عام ہیں جن میں سب سے بڑا اور سفید جھوٹ یہ ہے کہ اسے اورنگ زیبؒ نے وشوناتھ مندر توڑ کر بنوایا۔۔۔ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ مسجد اورنگ زیب کے پردادا اکبر کے دور میں بھی نہ صرف موجود تھی بلکہ 'دینِ الٰہی' کی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھی۔ پھر اکبر کے پوتے شاہ جہاں نے یہاں ایک مدرسہ 'ایوانِ شریعت' قایم کیا جو آزادیِ ہند کے کافی بعد تک جاری رہا۔

اس مسجد کی تعمیر پر اتنے ماہ وسال اور مختلف حکومتوں کے اتنے دور گزر چکے ہیں کہ اب کسی بڑی سے بڑی تاریخی بنیاد پر بھی اس کے خلاف کوئی دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا۔لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں بعض جھوٹ اتنی کثرت سے بولے گئے ہیں کہ آج اُن پر صداقت کی مہر لگ چکی ہے اور اس مہر کو صاف کرنے کے لیے ایماندار اور غیر جانب دار مورخ کو ناکوں چنے چبانے پڑیں گے۔

بہرحال اس جامع مسجد کے تعلق سے جو بھی تاریخی شواہد اور انگریزوں کے زمانے سے لے کر آزادیِ ہند اور اس کے بعد سے آج تک کے حالات و واقعات وحادثات و المیات رونما ہوے ہیں، اُن کا مطالعہ اس کتاب میں کیا جاسکتا ہے۔

ہندی نقش بھی عن قریب آنے والا ہے

بہر میداں کہ ملت خواند اوٗ را
قیادت کردو بے خوف وخطر کرد
موٗرخ چوں نوشت احوالِ پاکاں
رقم نامش بحرفِ آبِ زر کرد

—— حضرت اشعر رامنگری

مصنفِ کتاب حضرت مولانا مفتی عبد السلام نعمانی مجددی کی ذات گرامی محاسن وتنوع کا ایک مرقع تھی ـــــ شہر کی بڑی سے بڑی مخصوص ہستیاں آپ کے سامنے زانوے ادب تہہ کرتی تھیں، حتیٰ کہ ضلع انتظامیہ بھی آپ کی نہایت قدرداں تھی۔ شہر کے مذہبی وملی کسی طرح کے معاملات میں جب تک آپ سے مشاورت نہ کر لیتی تب تک کوئی فیصلہ نہ کرتی۔ ذی بصیرت اور صائب الرائے اتنے کہ عدالت کی کرسیاں بھی آپ کے فتوے وفیصلے کی منتظر رہا کرتیں۔

آپ نہایت مصروف ترین زندگی کے حامل تھے۔ مسند افتاء وقضاء اور منصب امامت وخطابت پر فائز رہتے ہوے آپ نے مسلمانوں کے بہت سے دینی وملی وسماجی معاملات میں ان کی قیادت فرمائی۔ گو سیاست سے دور تھے، تاہم ملت کے اجتماعی معاملات میں ہمہ وقت پیش پیش رہتے اور اس راہ میں ہر قسم کے حالات کا نہایت بے باکی، جرأت اور پامردی سے مقابلہ کرتے۔ مثلاً ـــــ ۱۹۷۶ء میں فیملی پلاننگ، ۱۹۸۳ء میں بنارس کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ محلہ دوسی پورہ میں دو قبروں کی منتقلی، ۱۹۸۵ء میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا سپریم کورٹ کا فیصلہ، یکم فروری ۱۹۸۶ء کو بابری مسجد کی قفل کشائی وغیرہ آپ کی حیات کے ایسے نازک اور شعلہ بکف مسائل تھے جن پر آپ کی مدبرانہ قیادت اور مساعی جلیلہ سے کبھی بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

تاریخ آثار بنارس آپ کی بہت ہی کم عمری کی تصنیف تھی۔ یوں تو آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں لیکن تاریخ آثار بنارس اور تذکرہ مشائخ بنارس کو منجانب اللہ اتنی بڑی قبولیت ملی کہ تدریجی اضافوں کے ساتھ ان کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے اور آپ کی حیات میں ہی سب نایاب کے درجہ میں ہو گئے۔

بنارس کی تاریخ پر یوں تو متعدد کتابیں ہیں لیکن جس چیز کو بنیاد بنا کر تاریخ آثار بنارس کی تصنیف کی گئی ہے، اس اعتبار سے یہ انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اس کے پہلے ایڈیشن سے ہی اہل علم وتحقیق کے یہاں اس کی اہمیت تسلیم کی گئی اور یہ کتاب بنارس کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ قرار پائی اور بنارس پر جتنے لوگوں نے کام کیا، یا اس عنوان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے جن لوگوں نے مقالے لکھے، اُن کے لیے اس کتاب نے بنیادی ماخذ کا کام کیا ہے۔

جامع مسجد دھرہرا
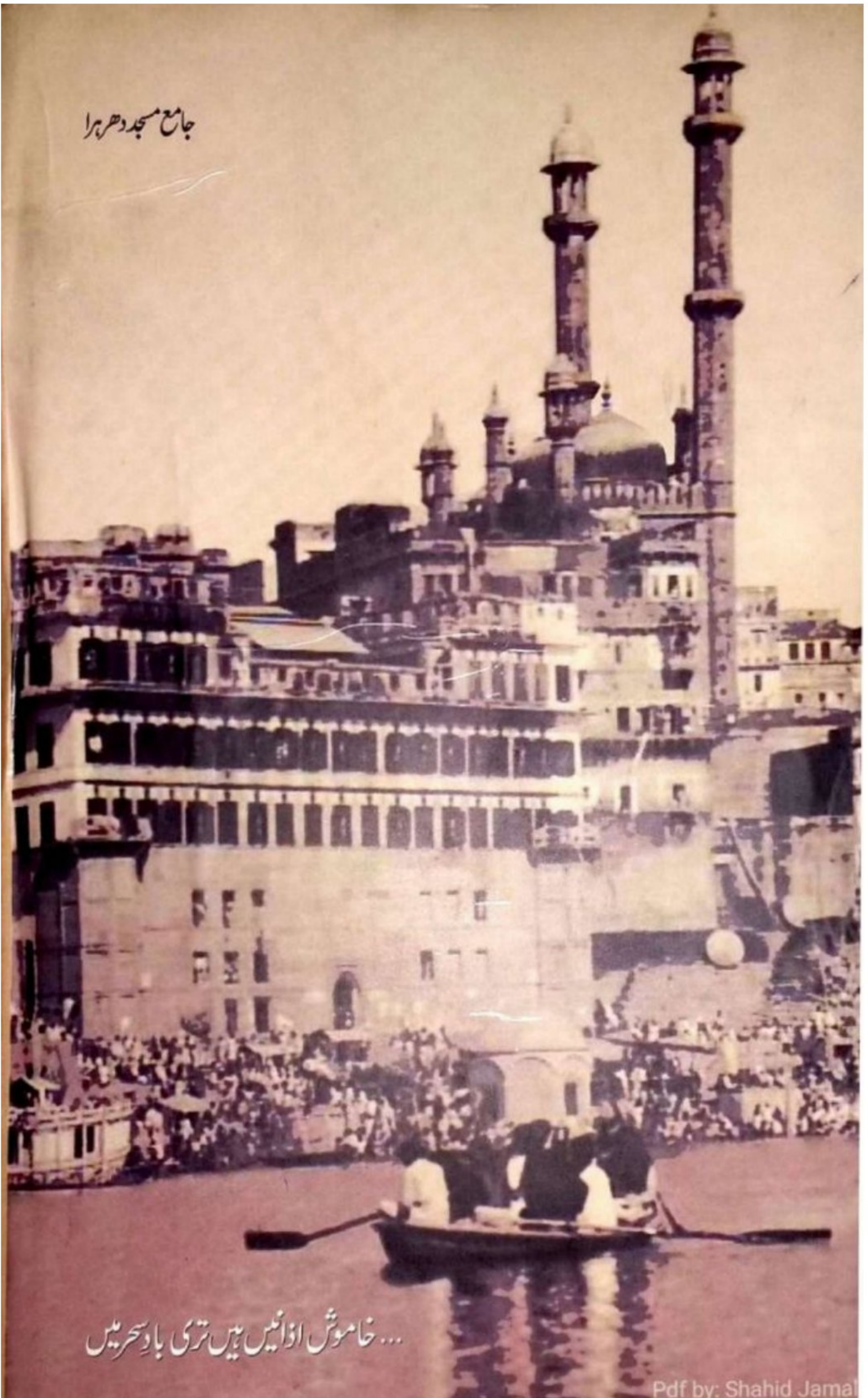
... خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں